حسین الحق
کے منتخب افسانے

مرتب

پروفیسر صغیر افراہیم

حسین الحق کے منتخب افسانے

مرتب: پروفیسر صغیر افراہیم

HUSSAIN UL HAQUE
KE MUNTAKHAB AFSANE

Edited by

PROF. SAGHIR AFRAHEIM

حسین الحق کے افسانوں کا مرکز و محور انسان کی ذات ہے جس کے تجربات کی عکاسی مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ پرتیں کھولی گئی ہیں۔ اُن کے یہاں موضوعات کی نیرنگی کے ساتھ اظہار کی تازگی نے فن پاروں کو قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔

سات افسانوی مجموعوں سے منتخب یہ سولہ افسانوں کا مجموعہ، اردو فکشن میں سولہ سِنگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی، دونوں سطح پر نیا پن ہے۔ بیان اور بیانیہ کی آویزش پر مشتمل مذکورہ مجموعہ میں عصرِ حاضر کی بے حسی، بد دیانتی اور بد عنوانی کے گہرے شعور اور فکری حسیّت و آگہی ہے۔ کہانی کی بُنت اور کرداروں کے عمل و ردِّ عمل میں ایک مربوط صورت گری موجود ہے جو عصری تقاضوں سے اُبھرتی ہے، اور منطقی ربط و تسلسل میں کہانی کو پروتی ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی نُدرت ہے۔

حسین الحق کے مخصوص اندازِ بیان اور فکر کی جدّت نے معاصر اردو افسانے کو ایک نئی شکل عطا کی ہے۔ اُن کی کہانیوں کا مجموعی تاثر تہذیبی، تاریخی، اساطیری اور مذہبی علامتوں سے نکھرتا ہے۔ فضا اور ماحول کے مطابق علاقائی رنگ اور محاوروں کا برتاؤ دبے پاؤں وحدتِ تاثر میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ یہ منفرد اندازِ بیان ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں کرتا بلکہ قاری سے افسانہ اور افسانہ نگار کا رشتہ قائم رکھتا ہے۔

صغیر افراہیم

BROWN BOOKS
Opposite Blind School, Qila Road, Shamshad Market, Aligarh-202001
Mob: +91-9818897975, Ph:0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com
Website: www.brownbooks.in
₹ 350/-
ISBN: 978-93-88928-68-7
9789388928687

تصانیف و تالیف

۱۔ پریم چند۔ ایک نقیب اردو، ہندی
۲۔ کڑی دھوپ کا سفر (افسانوی مجموعہ) اردو، ہندی
۳۔ اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل
۴۔ نثری داستانوں کا سفر
۵۔ اردو فکشن: تنقید اور تجزیہ
۶۔ اردو کا افسانوی ادب (تحقیقی و تنقیدی مضامین)
۷۔ افسانوی ادب کی نئی قرأت
۸۔ اردو شاعری تنقید و تجزیہ:
۹۔ جگت موہن لال رواںؔ:
۱۰۔ اردو ناول: تعریف، تاریخ اور تجزیہ
۱۱۔ پریم چند کی تخلیقات کا معروضی مطالعہ
۱۲۔ اردو افسانہ: تعریف، تاریخ اور تجزیہ
۱۳۔ سارک ممالک میں افسانہ
۱۴۔ متن کی قرأت
۱۵۔ سعادت حسن منٹو (ایک صدی بعد)
۱۶۔ اردو کے مختصر افسانے
۱۷۔ ہم عصر اردو غزل۔ سمت و رفتار
۱۸۔ 'دانش' —— قرۃ العین حیدر نمبر
۱۹۔ تفہیمِ اقبالؔ میں دانشِ فرنگ کی جلوہ گری
۲۰۔ عصرِ حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت و معنویت

s.afraheim@yahoo.in
www.saghirafraheim.com

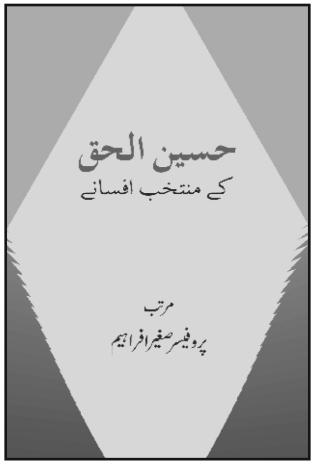
مرتب کا مختصر تعارف

نام : محمد صغیر بیگ افراہیم
قلمی نام : صغیر افراہیم
آبائی وطن : اناؤ (اتر پردیش)
تعلیم : بی اے (آنرس)
ایم اے (اردو، گولڈ میڈلسٹ)
پی ایچ۔ ڈی
سابق صدر شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
مدیر : رفتار، دانش، تہذیب الاخلاق
امتیازات : خصوصی نمبر، تحریک ادب (بنارس)
شمارہ نمبر ۱۹، ۲۱، ۲۷، ۳۰، ۳۵
خصوصی نمبر، تزئین ادب
(شیر پور) شمارہ نمبر ۲
خصوصی نمبر، جہانِ اردو (دربھنگہ)
شمارہ نمبر ۶۳، ۶۴

جہانِ صغیر افراہیم
مرتبہ: ڈاکٹر حنا آفریں

صغیر افراہیم کا تنقیدی شعور
ڈاکٹر مظفر اقبال

تہذیب الاخلاق کے اداریے
مرتبہ: ڈاکٹر محمد شاہد



حسین الحق

کے منتخب افسانے

مرتب

پروفیسر صغیر افراہیم

براؤن بک پبلی کیشنز نئی دہلی

HUSSAIN UL HAQUE
KE MUNTAKHAB AFSANE

Edited by
PROF. SAGHIR AFRAHEIM

ISBN: 978-93-88928-67-0

ایڈیشن	:	2020
قیمت	:	₹ 350
تعداد	:	500
کاغذ	:	70Gsm نیچرل شیڈ
مطبع	:	Touchstone، نئی دہلی۔110002
ناشر	:	براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی۔110025

Circulation & Distribution Office:
Brown Books
Opp. Blind School, Qila Road,
Shamshad Market, Aligarh - 202001
Mob: +91 9818897975, Ph: 0571 2700088
E-mail: bbpublication@gmail.com

ترتیب

حسین الحق کے افسانوں کا فکری و فنّی کینوس

تخلیقی عمل میں متخیلہ کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔تمام فنون لطیفہ میں اس کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ادب بھی فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے لہٰذا اس کی ساخت بافت میں بھی تخیل کی شمولیت ناگزیر ہے۔تخیل کی دو جہتیں ہیں،ایک وہ جو القا اور وجدان کی دین ہے اور دوسری وہ جس میں مشاہدہ تخلیقی باطن کی وسعت کے امکانات پیدا کرتا ہے۔ہر مصنف کے مشاہدے کا سیاق اس کا عنصر ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کی گزرتی ہوئی دو دہائیوں کا جو ادب ہے اس میں متخیلہ کے ساتھ ساتھ عالمگیریت اور صارفیت کی آمیزش سے انکار ادب کے منجملہ خام مواد سے عدم آگہی کا نشان قرار دیا جاسکتا ہے۔

عالمگیریت اور صارفیت کی آمیزش سے وجود میں آنے والی بین الاقوامی سیاست کے زیر اثر جو ادب پروان چڑھ رہا ہے وہ ہماری کیفیات کا عکاس ہے کیوں کہ یہ روایت شکن دور مختلف پیچیدہ معاملات سے دوچار ہے۔ یہاں کوئی باضابطہ اصول، مطمحِ نظر یا انسانی رواداری اور میل ملاپ کا فلسفہ کام نہیں آرہا ہے۔اب ایک مرکز پر ٹھہراؤ بھی نہیں ہے۔فکری اور جماعتی دونوں ہی اعتبار سے انتشار پسندی میں اضافہ ہوا ہے۔سوال یہ اٹھتا ہے کہ اِس صورتِ حال کو معاصر اردو افسانہ کس حد تک ترجیح دے رہا ہے؟ غور سے مطالعہ کیا جائے تو پچھلی تین چار دہائیوں میں معدودے چند افسانہ نگار ہی نظر آتے ہیں جن کے افسانے نت نئے مسائل سے قاری کو فنکارانہ طور پر واقف کراتے ہیں، نیز موجودہ ادبی افق پر اپنا بھرپور نقش بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔اِن میں ایک نمایاں نام حسین الحق کا ہے۔

حسین الحق کامیاب ناول نگار کے ساتھ ساتھ ممتاز افسانہ نگار بھی ہیں۔ جنھوں نے اردو فکشن کو نایاب موتی دیے ہیں۔ سرِ دست اُن کے افسانوں کے تعلق سے گفتگو کرنی ہے اس لیے تمام توجہ اُن کے منتخب افسانوں پر مرکوز کرتا ہوں جن کے موضوعات ہمارے ارد گرد کے ماحول سے لیے گئے ہیں۔ ان میں سیاسی، سماجی اور تاریخی بساط کے بدلتے ہوئے مہرے نظر آتے ہیں۔ کردار اور واقعہ نگاری میں بھی تنوع ہے۔ اب تک اُن کے سات افسانوی مجموعے (۱-پسِ پردۂ شب، ۲-صورتِ حال، ۳-بارش میں گھرا مکان، ۴-گھنے جنگلوں میں، ۵-مطلع، ٦-سوئی کی نوک پر رُکا لمحہ، ۷-نیو کی اینٹ) منظرِ عام پر آ چکے ہیں اور اب یہ اِنہی مجموعوں سے منتخب کیے گئے افسانے شائع ہونے جا رہے ہیں۔

سولہ افسانوں پر مشتمل یہ مجموعہ افسانوی ادب میں سولہ سِنگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی، دونوں سطح پر نیا پن ہے۔ بیان اور بیانیہ کی آویزش پر مشتمل اِس مجموعہ میں عصرِ حاضر کی بے حسی، بددیانتی اور بدعنوانی کے گہرے شعور اور فکری حسیت وآگہی ہے۔ مذکورہ مجموعہ میں کہانی کی بُنت میں ایک مربوط صورت گری موجود ہے جو عصری تقاضوں سے اُبھرتی ہے، اور منطقی ربط اور تسلسل میں کہانی کو پروتی ہے۔ زبان کے استعمال میں بھی جدّت و نُدرت ہے۔

موضوع کے تنوع، اسلوب کے اظہار اور تکنیک کی ہمہ گیری کے اعتبار سے دیکھیں تو ''نیو کی اینٹ'' منفرد افسانہ ہے۔ تقریباً دس سال پہلے اِسی عنوان سے اُن کا چوتھا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آکر دھوم مچا چکا ہے۔ اس افسانہ میں احتجاج نہیں، غیر مرئی احساس اور تفکر ہے جس کو خوبی سے اُجاگر کیا گیا ہے کہ زندگی اتنی آسان نہیں جتنا کہ ہم سمجھتے ہیں۔ یہ کسی ایک نعرے، اصول یا نظریے کی پابند نہیں ہے بلکہ تناؤ سے بھری، بے حد اُلجھی ہوئی زندگی میں مفاہمت کا جذبہ کس طرح لہریں لیتا ہے، اس کا فنکارانہ اظہار بھی ''نیو کی اینٹ'' میں موجود ہے۔

''جلیبی کا رس'' میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کا معاصر منظر نامہ جھلکتا ہے۔ حسین الحق بے حد حسّاس فنکار ہیں اِس لیے انھوں نے عوامی زندگی کے مختلف رنگوں اور معاشرے کے اُتھل پتھل کو بغور دیکھا، محسوس کیا اور پھر ان کو فنکارانہ طور پر افسانہ کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس افسانہ میں بھی علاقائی اثرات، مقامی محاورے اور برمحل مکالموں نے انسانی فطرت وجبلت کی بھرپور عکّاسی کی ہے۔

نہایت باریکی اور فنّی ہُنر مندی سے بُنا گیا افسانہ ''سبحان اللہ'' دائروی شکل میں گھومتا ہوا، اختتام سے آغاز کی طرف لوٹتے ہوئے بیانیہ عرصہ قائم کرتا ہے۔ درمیان میں کچھ واقعاتی اور نفسیاتی مناظر ہیں جو عقائد، توہمات اور تعصّبات کو منعکس کرتے ہوئے غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔ اس افسانہ میں جمعیت اور فرد کا معاشرے سے برتاؤ بطور خاص منعکس ہوتا ہے۔

حسین الحق کا فنّی کمال ہے کہ وہ پلاٹ کی بُنت میں ایسی فضا خلق کرتے ہیں جس میں بنیادی قصّہ کے ساتھ ساتھ علامتی اور اساطیری عناصر خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ ''الحمدللہ'' کا اس نقطہ نظر سے بھی مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ قدیم تصورات زندگی کا جب آج کے صارفی سماج وتصورات سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو اسے ہمارے درمیان سے آہستہ آہستہ رخصت ہوتی جانے والی پرانی نسل کس طرح جھیلتی ہے۔ مزید برآں پچھلے زمانوں کی علمی و ادبی گفتگو اور آج کے ادبی مباحث کے درمیان رفتہ رفتہ جو فاصلہ قائم ہوا، اور علم و ادب سے جینے مرنے کے بیش از بیش حوالے آہستہ آہستہ جس طرح تبدیل ہوئے ہیں، اس کے بھرپور اشارے اس افسانے میں دستیاب ہیں۔ اس انداز سے گزرتے اور آتے موسموں کے درمیان واقع ہونے والے فرق پر فنی اور تخلیقی انداز میں کم سوچا گیا ہے۔ ''انحد'' میں ماضی کے گُزرے ہوئے ایام کی شدّت کے ساتھ دورِ حاضر کی کیفیات کا انوکھا امتزاج ہے۔ موضوع و ہیئت کی گرفت اور اسلوب کا موثر انداز افسانہ کے حُسن کو دوبالا کرتا ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ آجکل میں شائع ہوا تھا۔ اسے دوبارہ پڑھتے ہوئے ذکیہ مشہدی کا وہ خط یاد آ گیا جس میں اس افسانے کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا کہ...میں نے بہت کم ایسے افسانے پڑھے ہیں جس کا عنوان متن کو مکمل کرتا ہو۔ واقعی اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ افسانے کی پہلی پرت رومان اساس ہونے کے باوجود اپنی بُنت میں بابا کبیر کی انحد وانی کا تاثر سموئے محسوس ہوتا ہے۔

دراصل افسانہ حیات و ممات کا استعارہ ہے، جو انسانی نفسیات اور جنسیات کے پیچ و خم کو بروئے کار لانے کا فنّی حربہ ہے۔ انسان کے افعال و اعمال کے پسِ پُشت جو عوامل کام کر رہے ہوتے ہیں اُن کی تلاش کا، فرد اور اجتماع کے ذہنی اور جذباتی رشتوں کی کہانی سُنانے کا، انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی تعمیر و تشکیل میں جو سماجی، نفسیاتی، تاریخی و جغرافیائی نیز مذہبی عناصر

سرگرم ہوتے ہیں اُن پر غور وفکر کرنے کا کردار افسانہ بخوبی ادا کرتا ہے۔ انسان کی شخصیت کو سنوارنے اور بگاڑنے میں بیرونی اثرات کے علاوہ خود اُس کو ورثہ میں ملی جبلّت کی تہہ داری میں پوشیدہ رموز کی نشاندہی بھی افسانہ کرتا ہے۔ فرد کی زندگی میں جو کائنات چُھپی ہوتی ہے اُس کو اُجاگر کرنے کے لیے افسانہ نگار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر آزادانہ طور پر شعوری کوشش کرتا ہے۔ اس کا دائرہ کائنات کی طرح وسیع ہے۔ تبھی تو یہ عمل اور ردِعمل پر غور وفکر کرتا ہے۔ انسان سے سرزد ہونے والا ہر عمل دراصل شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک ردِعمل ہوتا ہے جس کے اسباب وعلل کی جستجو افسانہ کرتا ہے اور حسین الحق اِن تمام رموز ونکات کو واضح کرنے کا ہُنر جانتے ہیں جن کے واضح ثبوت زیر مطالعہ افسانوں میں ملتے ہیں۔

مشرقی تاریخ میں تہذیبوں کے سیاسی وسماجی ٹکراؤ اور بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی حیثیت کو بیان کرنا حسین الحق کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ چرند و پرند ہوں یا حیوانات ونباتات انسانیت سب پر مقدم ہے۔ مساوات ومحبت حاوی جذبہ ہے جس کی وکالت افسانہ ''مور پاؤں'' کرتا ہے۔ اس میں ماورائی تصور اور تہذیب وثقافت کو عوامی مسائل سے جوڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ افسانہ زندگی کے تلیخ حقائق، اقدار کی شکست، خوف اور توہم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ افسانہ میں واقعات ڈرامے اور مکالمے کے مِلے جُلے انداز میں بتدریج رونما ہوتے ہیں۔ شعور اور تحت الشعور کی آمیزش سے اُبھرنے والے وہم، تذبذب، خوف اور حقیقت کے اظہار کے لیے حسین الحق نے دلچسپ انداز اور موثر اسلوب اختیار کیا ہے۔ انھوں نے تمثیلوں اور استعاروں کے ذریعے توہم پرستی اور عقیدت مندی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سچائی کا مقابلہ کرنے کی جانب ذہن کو راغب کیا ہے۔ مور کے حُسن، پاؤں کی بدصورتی، پالنے کی کشش اور اُس کی موت کے تصور سے اُبھرنے والا منظر نامہ ہمارے عہد کی شدّت پسندی کو پینٹ کرتا ہے۔ یہ افسانہ اس لحاظ سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس میں رخشندہ اور مور کی صورت میں جس گنگا جمنی تہذیب کو یاد رکھنے اور پینٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ عہد حاضر میں، جب اس کے انہدام کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے، ایسے میں یاد کے پردے پر رخشندہ کا جھلکنا، تلسی کا پیڑ اور مور پالنے کی خواہش اس تہذیب کے ساتھ کھڑا ہونے کی کوشش ہے، خواہ یہ کامیاب ہو یا ناکام۔

واقعۂ کربلا حسین الحق کا پسندیدہ موضوع ہے۔ نام کی نسبت کا اثر ہونا بھی چاہیے کہ یہ حسینؑ کے حق وصداقت کا غماز ہے۔ بلاواسطہ طور پر انھوں نے اپنی کئی تخلیقات میں اس کا سہارا لیا ہے۔ افسانہ ''کربلا'' میں پلاٹ وقت کے تسلسل کا تابع ہے۔ کفایتِ لفظی کے ساتھ یہ نسبتاً طویل افسانہ ہے جو ماضی اور حال کے وسیلے سے سامنے آتا ہے۔ صوفیائے کرام کے توسط سے اپنوں کو اپنی فکر کے طابع بنانا اس کا مطمحِ نظر ہے۔ اِس کی قرأت کے دوران حسین الحق کا ناول ''فرات'' یاد آتا ہے جو عمل اور ردِعمل کے پیہم اور پیچیدہ دام میں گرفتار انسانی زندگی کا اعلامیہ بن کر اُبھرتا ہے۔ اُس فرات کے مانند جس کے کنارے کھڑی تشنہ لب انسانیت کرب وبلا میں گرفتار ہے اور اُس سے نجات حاصل کرنے کی مسلسل جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ ''کربلا'' کے ضمن میں یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ افسانے میں واقعات کا جو سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے، اس کا عرصہ ابتدا سے انتہا تک کرفیو کے درمیان کا عرصہ ہے مگر یہ دلچسپ بات ہے کہ پورے افسانے میں کہیں بھی کرفیو کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ یقینی طور پر ایک شعوری فنی احتیاط ہے جو افسانہ نگار کے بالغ فنی شعور کا اشارہ ہے۔

حسین الحق کے افسانوں کا مرکز ومحور انسان کی ذات ہے جس کے تجربات کی عکاسی مختلف زاویوں سے کرتے ہوئے تہہ بہ تہہ پرتیں کھولی گئی ہیں۔ ان کے یہاں موضوعات کی نیرنگی کے ساتھ اظہار کی تازگی نے فن پاروں کو قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔

مجموعہ میں شامل سبھی افسانے بغور مطالعہ کا مطالبہ کرتے ہیں مگر افسانہ ''ناگہانی'' نے مجھے خواتین کے تعلق سے ازسرِ نوغور وفکر کی دعوت دی۔ سولہ صفحات پر مشتمل اِس افسانہ میں چار کردار ہیں۔ مرکزیت بی بی عزت النساء کو حاصل ہے۔ ضمنی کرداروں میں شوہر جلال الدین اور لالہ بنسی دھر پرشاد ہیں۔ شوہر بگڑا ہوا زمیندار ہے جس کے مزاج میں وحشت اور درندگی ہے تبھی تو علاقہ کا کوئی بھی شخص اس کا دلی ہمدرد نہیں۔ خاندانی منشی لالہ بنسی دھر جو اپنی چاپلوسی کی بدولت تمام زمین وجائداد کے مختارِ عام تھے، وقت بدلتے ہی وہ مختارِ کُل بن گئے بلکہ سب کچھ سمیٹ کر منظر نامہ سے غائب ہو گئے البتہ اُن کا چھوٹا بھائی لالہ ہری ہر پرشاد اُس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ وہ نیک، ملنسار اور وضع دار ہے۔ مجموعی تأثر عورت کی قوتِ برداشت اور پاس ولحاظ کا جذبہ ہے۔ اُس کے

توسط سے افسانہ نگار شوہر، حالات، فطری خواہشات اور تہذیبی و معاشرتی جبر کو اُجاگر کرتا ہے۔ قاری شدّت سے محسوس کرتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام میں، مسلم معاشرے میں بھی نہ جانے کیوں مرد کی انا نے اُسے برابری کا درجہ نہیں دیا بلکہ بالادستی اور برتری قائم رکھنے کے نئے نئے طریقے تلاش کیے۔ ستم یہ کہ عورت نے سخت قدم اُٹھانے کے بجائے صبر و تحمل اور اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت پیش کیا۔ شاید اِس اُمید کے سہارے کہ آنے والے کل میں حالات بدل جائیں گے۔ جب تک حالات بدلے نہیں تھے تو وہ ایک انانیت پسند، جھوٹی آن بان والے بڑے زمیندار کی بیگم تھیں۔ آرام و آسائش مہیا ہونے کے باوجود وہ اِس حقیقت سے بھی واقف تھیں کہ جلال الدین کے اندر ایسا وحشت ناک درندہ صفت شوہر چھُپا بیٹھا ہے جو عام حالات کی بات تو الگ رہی، خلوت میں بھی اذیت کے نئے نئے حربے تلاش کرتا رہتا تھا۔ جوان عورت کے لیے مختص کیے گئے، اُن مخصوص دنوں میں جب بی بی عزت النساء:

> ''نجات کی خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن اُن کی مصیبت کے دن بھی ہوتے، ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح اُسے نوچتا بھنبھوڑتا۔ عزت النساء بچنا چاہتیں مگر بچ نہیں پاتیں اور پھر یہ بھی ہے کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النساء کے چڑھتے دریا کا زمانہ تھا۔ لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات میں ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہی ہے، سو بالآخر عزت النساء تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہو کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتیں--- اُن کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کی یادگار تھے''۔(ص:۱۸)

یہاں میں جنس کی مختلف، متضاد تھیوری، حمل ٹھہرنے کے عمل وغیرہ پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا اور نہ ہی اُس کے حیوانی طریقے پر کہ وہ قہر تب ڈھاتا جب تکلیف کا احساس شدّت اختیار کر لیتا بلکہ میں عورت کی پسند و ناپسند کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

روایتی انداز کو مجروح کرتا ہوا یہ افسانہ بربریت اور لذّت کی ایک الگ کہانی بیان کرتا ہے اور یہ سلسلہ تقریباً آٹھ سال چلتا ہے کہ اچانک جلال الدین پر فالج کا حملہ ہوتا ہے جس نے اُس کو

ہی نہیں پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا۔ بدلے ہوئے حالات میں عزت النساء ذہنی کرب کے ساتھ ساتھ معاشی، اقتصادی اور سماجی کرب میں بھی مبتلا ہو جاتی ہیں۔ تین بچے اور فالج زدہ شوہر اضطراری کیفیت میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں۔

روایتی انداز سے الگ ہٹے ہوئے اِس افسانہ میں مردانہ پن کے مظاہر کے ساتھ جنسی لذّت پسندی سے مکمل گُریز ہے کیوں کہ اس خطرناک معاملہ میں غیر ضروری چیزوں کو لذّت کے لیے نہیں، عبرت کی بنا پر شامل کیا گیا ہے۔ اسی لیے مرد اساس معاشرہ پر یہ تازیانہ کا کام نہیں بلکہ یہ واضح کرتا ہے کہ بے حد ترقی یافتہ عہد میں بھی انسان اپنی سائیکی سے چُھٹکارا حاصل نہیں کر سکا ہے۔

افسانہ ایک مثلث کی شکل میں اُبھرتا ہے۔ غور کیجیے تو محسوس ہوتا ہے نفسیاتی اُلجھنوں میں مبتلا مرکزی کردار، اخلاقیات و سلوک اور طرزِ عمل، دوہرے اور متضاد معیار اور رویے اُس کے ارد گرد ہیں۔ سنجیدگی اور غیر سنجیدگی، محبت اور بوالہوسی، فطرت و جبلّت کی وہ مقناطیسی کشش جو خود سپردگی کی جانب راغب کرتی ہے، اور مجبور عورت اُس موڑ تک آ جاتی ہے جہاں وہ آنا نہیں چاہتی، مگر وہ کیوں آ گئی؟ جبر، مجبوری، فطری خواہش یا پھر مرد کا متاثر کن رویّہ!!۔ لباس کا اُتارنا پہننا، عورت کی ہی نہیں، اشرف المخلوقات کی فطری کمزوری ہے۔ زندگی میں کبھی کبھی کوئی ایسا لمحہ آتا ہے کہ پوری احتیاط کے باوجود وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ''ناگہانی'' کا اختتام ملاحظہ ہو:

> ''وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئے تھیں... میلاد شریف میں جانے کے لیے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پُرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہو گئیں اور میلاد انھوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے''۔ (ص: ۳۴)

تکرار لفظی کے ساتھ برمحل شعر کا استعمال:

> ''بی بی عزت النساء روئے جا رہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جا رہی تھیں ؎
>
> خدا کے قہر سے روزِ جزا، بچا لینا
>
> بہت ہوں عاجز و لاچار، یا رسول اللہؐ''۔ (ص: ۳۴)

افسانہ نگار کا یہ بھی فنّی کمال ہے کہ شعر وحدتِ تاثر کو مجروح نہیں کرتا، بلندیوں پر پہنچاتا ہے۔

مجموعہ کے اکثر افسانے خصوصاً ''ناگہانی'' غماز ہے خواتین کے تشخص، مختلف مسائل، عزت ووقار کے ساتھ اُن کے حقوق کو یقینی بنانا۔ حسین الحق کا یہ بھی موضوع ہے کہ روزِ اوّل سے معاشرے کی تشکیل میں عورت، مرد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتی رہی ہے، لیکن نہ جانے کیوں مرد کی انا نے اُسے برابری کا درجہ نہیں دیا۔ کائنات کے ساتھ اپنے رفیقِ سفر پر بھی بالادستی اور برتری قائم رکھنے کی کوشش کی اور سائے کی طرح ساتھ رہنے والی عورت کو لاشعوری طور پر احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ حسین الحق نے اپنی تخلیقات میں مساوات کی حمایت اور عصبیت کی مخالفت کی ہے۔ یہ بھی واضح کیا ہے کہ معاشرہ اپنی بالادستی اور برتری قائم رکھنے کے لیے ہر حربہ کو جائز قرار دیتا ہے البتہ یہ افسانہ محض عورت کے حقوق کے حصول پر اصرار اور مرد کی بالادستی کے خلاف احتجاج نہیں ہے بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور جنسی کشاکش کا ترجمان ہے۔ اس میں اگر ایک مرد تخریب پسند ہے تو دوسرا کسی چالاکی کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ اظہار جذبات کے مہذب انداز کا مظہر ہے۔ کیوں کہ اس میں ہونے والے ردِعمل میں بھی تسکین کا ایک تصور کارفرما ہے۔ چاہے وہ لالہ ہری ہر کی خاموش امداد ہو یا میلاد شریف، فضا اور ماحول کو سازگار بنانے کا سارا مرحلہ فطری ہے۔

اِن منتخب افسانوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہیں کہ حسین الحق کے اپنے مخصوص اندازِ بیان اور فکر کی جدّت نے اردو افسانے کو ایک نئی شکل عطا کی ہے۔ مذکورہ افسانوں کا مجموعی تاثر تہذیبی، تاریخی، اساطیری اور مذہبی علامتوں سے نکھرتا ہے۔ فضا و ماحول کے مطابق علاقائی رنگ اور محاوروں کا برتاؤ دبے پاؤں وحدتِ تاثر میں تحلیل ہوجاتا ہے۔ یہ منفرد اندازِ بیان ترسیل کا مسئلہ پیدا نہیں کرتا بلکہ قاری سے افسانہ اور افسانہ نگار کا رشتہ قائم رکھتا ہے۔

پروفیسر صغیر افراہیم
سابق صدر شعبۂ اُردو
علی گڑھ مسلم یونیوسٹی، علی گڑھ-۲
s.afraheim@yahoo.in

ناگہانی

بی بی عزت النساء اپنا کام جلدی جلدی نپٹانے میں مصروف تھیں۔

انہوں نے برتن مانجھتے مانجھتے ذرا دھڑ باہر کر کے دیکھا، شام بھاگی چلی آ رہی تھی اور ڈھیر سارا کام سر پر پڑا تھا۔ دوپہر میں ذرا آنکھ کیا لگ گئی کہ سب الٹ پلٹ ہو گیا۔ یاد آیا کہ برتن دھو کر صبح سے پڑا کپڑا ابھی دھونا ہے اور کپڑا ابھی پیشاب اور گندگی سے اٹا ہوا۔

بچے بڑے ہونے لگے تھے تو امید بندھی تھی کہ اب کپڑے دھونے سے نجات مل جائے گی مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ شوہر کو فالج مار گیا۔ چلنے پھرنے سے معذور، بولنے کی کوشش کرتا تو بہ مشکل ''پانی''، ''کھانا'' نکل پاتا۔ عام بیماری میں آدمی چڑ چڑا ہو جاتا ہے، عزت النساء کا شوہر جلال الدین تو سخت بیماری میں مبتلا تھا۔ وہ جب تک بھلا چنگا رہا تو اپنے نام کے مصداق ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دی۔ کیا گھر اور کیا محلّہ مجال کیا کہ کوئی معاملہ اس کی مرضی کے خلاف ہو جائے اور وہ برداشت کر لے، تو تو میں میں سے گالی گلوج پر اتر آتا مگر اپنی بات گرنے نہیں دیتا۔

عزت النساء بیاہ کر سسرال آئیں تو شروع شروع بڑی وحشت ہوئی۔ کس وحشی سے پالا پڑ گیا ہے؟ مگر بہن بھابھی سہیلی سبھی نے سمجھایا کہ زمین دارانہ مزاج ہے، بڑے گھر کا بگڑا نواب، کچھ دنوں برداشت کر لو۔ آہستہ آہستہ اپنی محبت کی زنجیر میں ایسا باندھو کہ سب کس بل ڈھیلا ہو جائے۔ عزت بی بی نے مشوروں کے مطابق اس کی بدسلوکی بلکہ وحشت کے مقابلے پر اپنا حسن سلوک نہیں بلکہ محبت آزمانی شروع کر دی مگر جلال الدین کے اندر تو کوئی ایسا وحشت ناک درندہ چھپا بیٹھا تھا جو عام لمحات کی بات تو الگ رہی بستر پر بھی عزت النساء کے ساتھ صحبت بالجبر ہی کرتا تھا۔ اس کا عام مزاج یہ تھا کہ جب عزت النساء مائل ہوتیں تو وہ کوئی نہ کوئی ایسا بہانہ تلاش کر لیتا جس کا اختتام عزت بی بی پر لاتوں گھونسوں سے ہی ہوتا اور پھر وہ بہت چین سے

کروٹ بدل کر سو جاتا۔ عزت النساء کی کیا مجال کہ ایسے وقت میں اس کو اپنی طرف مائل کر پاتیں۔ پھر جب ان کی ماہ واری کے دن آتے تو جلال الدین اس کی طرف رجوع ہوتا۔ ظاہر ہے ان چند دنوں میں وہ نجات کی خواہاں رہتیں مگر وہی چند دن ان کی مصیبت کے دن بھی ہوتے، ہر مہینے میں تقریباً ایک ہفتہ جلال الدین وحشی درندوں کی طرح نہیں بلکہ پاگلوں کی طرح اسے نوچتا بھنبھوڑتا۔ عزت النساء بچنا چاہتیں مگر بچ نہیں پاتیں اور پھر یہ بھی ہے کہ جن دنوں کا ذکر ہے وہی زمانہ تو عزت النساء کے چڑھتے دریا کا زمانہ تھا۔ لاکھ نوچ کھسوٹ ہو، دو جسموں کا ٹکراؤ تو جذبات میں ہیجان پیدا ہونے کا سبب بنتا ہی ہے، سو بالآخر عزت النساء تھکان کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی مغلوب ہو کر آنکھیں بند کر کے پڑ جاتیں۔

ان کے تینوں بچے ان ہی دنوں کے آس پاس کی یادگار تھے۔

یہ سلسلہ شادی کے بعد تقریباً سات آٹھ سال چلا بڑی بیٹی چھ سال کی تھی جب شوہر پر فالج کا حملہ ہوا، ڈاکٹروں نے بتایا کہ بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے ایسا ہوا، عزت النساء کو حیرت نہیں ہوئی۔ ایسے گرم مزاج آدمی کا بی پی ہائی ہوا تو حیرت کی کیا بات؟ مگر پریشر ہائی ہونے کی جو وجہ تھی اس نے صرف جلال الدین کو مفلوج نہیں کیا پورے گھر کو فالج زدہ بنا دیا۔

اب وہی نہیں رہا جس پہ میاں کو دیں۔ زمینداری کے بل پر صرف جلال الدین کا غضب نہیں چلتا تھا، پورا گھر چلتا تھا۔ زمین داری گئی تو گھر کے سارے ہالی موالی بھی لیتی گئی اور بے زمینی سے گھبرا کر اس کے بھائی بھی دوسرے شہروں کو سدھار گئے، بعد میں خبر ملی کہ وہ انہی شہروں سے پاکستان روانہ ہو گئے۔ بچ گئے جلال الدین کے بوڑھے ماں باپ۔ وہ وقت کی مار زیادہ نہ سہ سکے اور برس دو برس میں آگے پیچھے عدم آباد سدھارے۔ خود عزت النساء کے مائکے والے پہلے ہی پاکستان جا چکے تھے۔ عزت النساء کی کائنات بس تین بچے تھے اور فالج زدہ شوہر!

عزت النساء کے لئے زندگی خارش زدہ کتے کے سر کا زخم بن گئی تھی۔

اسی زمانے میں لالہ ہریہر پرشاد اس کے گھر آئے۔

لالہ ہریہر پرشاد جلال الدین کے خاندانی منشی لالہ بنسی دھر پرشاد کے چھوٹے بھائی تھے۔ بنسی دھر تھے تو جلال الدین کے ہم عمر، مگر کبھی جلال الدین کے سامنے بیٹھے نہیں دیکھے گئے۔ دیوڑھی

پر جب آتے تو انداز ایسا ہوتا جیسے کتا دم ہلا رہا ہو۔سب سے پہلا کام یہ کرتے کہ ڈیوڑھی کے باہر ہی جوتی اتار دیتے ۔دھوتی کھول کے لنگی بنا لیتے اور برآمدے میں پڑی بینچ پر چپ چاپ بیٹھ جاتے ۔اب اگر ایک گھنٹہ اندر سے کوئی باہر نہیں نکلا تو اس سے لالہ بنسی دھر کو کوئی فرق نہیں پڑتا کبھی خوش قسمتی سے اگر دس پندرہ منٹ بعد ہی اندر سے کوئی باہر آ گیا تو خبر ہو جاتی کہ لالہ آ گئے ہیں۔مگر خبر ہونے پر بھی یہ کوئی ضروری نہیں تھا کہ میاں (جلال الدین) لالہ سے مل ہی لیں۔

لالہ کا کام تھا کہ آئیں اور بیٹھ جائیں اور جب جلال الدین کہہ دیں یا کہلوا دیں تب ہی لالہ جائیں۔

گھر کی ساری ضرورت، ہینگ ہلدی سے کپڑے زیور تک لالہ ہی پوری کرتے ۔نہ کبھی لالہ نے پیسہ مانگا نہ کسی نے پیسہ دیا۔جلال الدین نے بھی لالہ سے کبھی حساب نہیں لیا۔کتنا کھیت ہے، کتنا نقدی پر گیا کتنے کی لالہ نے خود بوائی کرائی کتنا رہن رکھا گیا، کتنا بیچا گیا، یہ سارا معاملہ بنسی دھر کے ذمہ تھا۔آخر تو وہ مختار عام تھے۔

مگر جب زمینداری چلی گئی تو لالہ بھی کاہے کے مختار......؟

یاد آیا باغ تو بچا ہوگا ۔مگر عزت النساء کس سے پوچھتیں، جلال الدین تو کہنے سننے کی منزل سے بہت آگے نکل چکے تھے ۔زندہ لاش نے کب کسی کو کچھ بتایا، سوچا کہ لالہ بنسی دھر سے پوچھا جائے مگر لالہ میسر کہاں تھے، ہر دن ڈیوڑھی پر حاضری لگانے والے لالہ کو دیکھے ہوئے پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے ۔جلال الدین کے بیمار پڑنے کے بعد مہینے دو مہینے تک وہ پابندی نبھاتے رہے لیکن جب تمام ڈاکٹروں سے پوچھ پاچھ کر اطمینان کر لیا کہ فالج اب موت کے ساتھ ہی جائے گا۔اور میاں اب کسی کو کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں تو پھر آہستہ آہستہ لالہ کی آمد میں ناغہ پڑنے لگا۔

جب لالہ کو گئے مہینے پر مہینے گزرنے لگے اور گھر کا سامان بکنے کی باری آ گئی تو پہلی مرتبہ عزت النساء نے ڈیوڑھی سے باہر قدم رکھا۔

برقعہ پہن کر باہری پھاٹک پر پہنچیں تو اتفاق سے اسی وقت خاندانی کہار گھورن سامنے آ گیا۔

''مالکن کہیں جانا ہے کیا؟''

''لالہ بنسی دھر کے یہاں جانے کو سوچ رہی ہوں۔''

''آپ کاہے جائیں؟ ہم بلائے لاتے ہیں۔''

عزت النساء ہلکے سے ہنسی۔''زمانہ بدل چکا گھورن۔ مجھے ہی جانا پڑے گا۔''

ٹھیک ہے مالکن۔آپ ڈیوڑھی پر ہی رہیں۔ہم ابھی ڈولی لے کر آئے۔''

''رہنے دو پیدل چلی جاؤں گی۔''

گھورن ڈنڈوت ہوکے گڑگڑانے لگا:'' ''مالکن ،ایسا مت کیجئے ۔جب تک ہم جیوت ہیں۔یہ نہیں ہوگا۔''

عزت النساء ذرا آواز سے ہنسیں۔''اچھا ٹھیک ہے ڈولی لے کر آؤ۔''

لالہ کے گھر عزت النساء پہنچیں تو گویا ایک خاموش سی ہلچل مچ گئی۔گھورن نے پہنچتے ہی گہار لگادی تھی۔''مالکن کے یہاں سے سواری آئی ہے۔''لالہ کی بوڑھی ماں تیز قدموں سے چلتی خود باہر آگئیں۔

''مالکن آپ؟''

''جی ہاں! سوچا کہ ذرا آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔''

عزت النساء نے ہلکے سے مسکرا کر جواب دیا اور گھر پر ایک نگاہ کی۔ان کی اپنی حویلی سے بڑی تھی ان کے منشی کی حویلی۔چاروں طرف قد آدم چہار دیواری،احاطے کے اندر ایک غلام گردش ، دوسری طرف طویلہ ،تیسری طرف گئوشالہ ،ایک کنارے پر چھوٹا سا ایک مندر،مندر کے بعد ذراہٹ کے کنواں ،بیچوں بیچ لالہ کا مکان ۔ باہری حصہ الگ ۔اس سے ذراہٹ کر اندرونی حصہ دونوں حصوں کو جوڑتی ہوئی ایک مختصر سی برساتی ۔اسی برساتی کے راستے ماتاجی عزت النساء کو لئے لئے اندر چلی گئیں۔

مکان کے اندرونی حصے میں بڑے چھوٹے سب نظر آئے۔سوا بنسی دھر کے!

وہیں پہلی بار نظر آئے۔لالہ ہری ہر پرشاد!

سرخی مائل گورا رنگ ،تیکھا نقشہ ،متناسب قد وقامت ،لالہ ہر یہر پرشاد کی خوبصورتی پہلی نظر میں متاثر کرنے والی تھی ۔اچانک سرسری طور پر عزت النساء نے سوچا:''یہ بنسی دھر سے چھوٹا ہے، مجھ سے برس دو برس بڑا ہوگا۔''

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت عزت النساء بتیس (۳۲) برس کی نہیں ہوئی تھیں۔

''لالہ بنسی دھر کہاں ہیں؟'' کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء نفسِ مطلب پر آ ہی گئیں۔

ان کا حال احوال ہم سے نہ پوچھئے ۔اپنی کوکھ کا پیدا ایسا پرایا ہو جائے گا ہم نے نہیں سوچا تھا ۔تین ماہ پہلے بال بچوں کو لے کر دہلی چلے گئے ۔اگر ہر یہر نہ ہوتا تو ہمیں تو کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہوتا۔''

''ان کا پتہ؟'' عزت النساء کو اپنی آواز ڈوبتی محسوس ہوئی۔

کوئی خیر خبر نہیں بی بی ۔بس یہاں سے اتنا کہہ کر نکلے کہ ہمیں اب اس شہر میں نہیں رہنا۔اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔''

عزت النساء نے صاف محسوس کرلیا کہ ماتا جی بنسی دھر کے حوالے سے کوئی گفتگو نہیں کرنا چاہتیں ،عزت النساء یہ بھی سمجھ گئیں کہ اس کا مطلب کیا ہے اور یہی بات عزت النساء کا دل بیٹھانے والی تھی۔

''اچھا ماتا جی، میں چلتی ہوں۔'' گھر لوٹتے ہوئے ڈولی میں وہ جی بھر کے روئیں۔اس درمیان انہیں کیا کیا نہ یاد آیا۔بچپن کے دن میکے کا آنگن ،گھر کے پیچھے بغیچے میں لگے پھل پھول ،سکھی سہیلی ،بچپنے کے ڈھیر سارے کھیل ،رشتے کا ایک بھائی جو اسے دیکھتا تھا تو دیکھتا ہی رہ جاتا تھا اور وہ ،اس کے باولے پن پر کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگ جاتی تھیں۔ڈولی میں بی بی نے کئی دہائیاں بتا ڈالیں۔

گھر پہنچیں تو سب الٹ پلٹ دکھائی دیا۔شوہر بستر ہی پر گندگی پھیلا چکا تھا، بچے رو رہے تھے، بڑی بیٹی اپنے جانتے سب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی مگر باپ تو بہر حال اس کے بس کی چیز نہیں تھا ۔عزت النساء نے پہلے شوہر کی گندگی صاف کی پھر بچوں کو سنبھالا تب باورچی خانے کی طرف پلٹ

کے تاک سکیں۔باورچی خانے سے فارغ ہوتے ہوتے رات سر پر آن کھڑی ہوئی ۔ سب کو کھلا پلا کر وہ بستر پر گئیں تو دماغ اڑ رہا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں ۔شوہر کا علاج تو دور کی بات، کھانے کپڑے کا انتظام مشکل ہو گیا تھا۔نزدیک و دور نگاہ دوڑائی ،کوئی بھی تو نہیں تھا۔ زمین داری کے خاتمے کے بعد نزدیک و دور جس کے بارے میں سوچا تو یاد آیا کہ وہ تو پاکستان چلا گیا ۔انہیں لگا کہ اگر جلال الدین مفلوج نہ ہوتا تو شاید وہ بھی پاکستان ہی میں پائی جاتیں۔

گزشتہ چھ مہینوں میں کیا نہیں ہو گیا۔گھر کا سامان بکا۔وہ بی بی صاحبہ سے استانی جی بن گئیں،اس سے بھی کام نہ چلا تو لوگوں کے کپڑے اور بستر سینے لگیں،میلاد پڑھانے لگیں۔مگر بات تو پھر بھی نہیں بن پا رہی تھی، نیا سال شروع ہو گیا تھا، نئے درجے کی کتاب کا مسئلہ ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔عزت النساء ایک دن کا انتظام کرتیں تو دوسرے دن کے لالے پڑ جاتے۔

بی بی عزت النساء کو کبھی کبھی محسوس ہوتا کہ ان کا سر پھٹ جائے گا۔

ایسے ہی حالات تھے جب لالہ ہریہر پرشاد ان کے گھر آئے۔

پوس کا مہینہ جا رہا تھا۔چاند کی آخری تاریخوں کی رات تھی ،اندھیرا امڈ گھمڈ کر عزت النساء کے گھر پر برس رہا تھا، دور دور تک کہاسہ پھیلا ہوا تھا، رات تھوڑی ہی آگے بڑھی تھی، دروازہ ابھی بند نہیں کیا گیا تھا کہ اچانک محسوس ہوا......دروازے پر کوئی ہے !عزت النساء سمجھ نہیں پائیں۔اس ٹھنڈی اور اندھیری رات میں کون ہو سکتا ہے۔مگر دروازے پر کسی کے ہونے کا گمان کم اور یقین زیادہ ہوا۔انہوں نے لالٹین کی مدھم لو ذرا تیز کی اور بڑی بیٹی رقیہ کو ساتھ لے کر دروازے کی طرف بڑھیں۔

لالٹین کی روشنی میں ہیولا نمایاں ہوا......دروازے پر لالہ ہریہر پرشاد کھڑے تھے......''لالہ جی آپ؟''

وہ لالہ ہریہر پرشاد کو صرف دیکھتی رہیں ،دراصل وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ وہ کیا کریں ......مگر چند ہی لمحوں میں وہ سنبھل سی گئیں ......''لالہ جی رکیئے ...... ایک منٹ'' کہتی ہوئی پلٹیں،جلدی سے باہر بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں بکنے سے بچی اور گرد میں اٹی

دو کرسیوں اور وہیں پر پڑے ٹیبل کو جلدی جلدی صاف کیا اور دروازے کی طرف لپکیں......''لالہ جی آیئے!''

لالہ جی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوئے۔عزت النساء نے بیٹھنے کا اشارہ کیا تو لالہ نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور آہستہ سے بولے:''یہ نہیں ہوسکتا پہلے آپ بیٹھیں۔''

عزت النساء مسکراتی ہوئی بیٹھ گئیں۔لالہ کے بیٹھنے کو''نصف نشست''یا''مؤدبانہ نشست''کہا جاسکتا ہے......کچھ دیر دونوں کے درمیان خموشی کا صحرا پھیلا رہا۔عزت النساء نے محسوس کیا کہ لالہ پہل کرنے میں ہچکچا رہے ہیں۔

''آپ نے کیسے کیسے تکلیف کی؟''

''شرمندہ ہوں۔''لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔''پہلے آنا چاہتا تھا،ہمت نہیں کرسکا آج ادھر سے گزر رہا تھا تو طبیعت بہت بے چین ہوگئی۔''

عزت النساء نے حیرت سے اسے دیکھا اور حیرت سے سنا بھی۔لالہ کے لہجے میں حزن اور اضطراب دونوں شامل تھے۔انہیں وہ بھائی یاد آگیا جو ان کے لئے بولا یا بولا یا پھرتا تھا۔شادی کے بعد وہ ایک مرتبہ ملا تھا اور بہت بوجھل لہجے میں پوچھا تھا:''بی بی کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔''بعد کے دنوں میں اس کی آواز پھر گونجی تو انہیں ایسا لگا جیسے مرتا ہوا آدمی خدا حافظ کہہ رہا ہو،عزت النساء اندر سے کانپ سی گئیں۔''لالہ کی آواز پر وہ باؤلا کیوں یاد آگیا؟''

لالہ اس دن تھوڑی دیر ہی بیٹھے۔ادھر ادھر کی باتیں کیں اور رخصت ہوگئے۔دو دن چار دن ،جب ہفتہ گزر گیا تو عزت النساء بی بی جیسے لالہ کا آنا بھول گئیں۔ان کا ہر دن بغیر کسی وجہ اور سبب کے بسر ہوتا رہا۔

ایسے ہی بے سبب اور بے مصرف دنوں میں سے کسی ایک دن......لالہ ہر یہر پرشاد دوبارہ آئے۔بیٹھتے ہی پوچھا:''بچے کہاں ہیں؟''

''سو گئے۔''عزت النساء نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کیا رقیہ بھی؟''

''نہیں وہ پڑھ رہی ہوگی۔''

''ذراسی تکلیف کر لیجئے ،اسے بلائیے۔''

عزت النساء رقیہ کو بلا لائیں۔لالہ نے رقیہ کی ٹھوڑی چھو کر پیار کیا۔سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر بغل میں رکھا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔''بیٹا! آپ بھائی بہنوں کے لئے''۔

رقیہ کا ہاتھ بے ساختہ پیکٹ کی طرف بڑھا۔پھر فوراً ہی اس نے ہاتھ نیچے گرا دیا اور ماں کی طرف دیکھا۔

''لالہ جی اس کی کیا ضرورت تھی؟''

لالہ نے پھر ہاتھ جوڑ لئے۔''بچوں کے لئے ہے۔راستے میں مٹھائی کی دوکان پر نظر پڑ گئی تو جی چاہ گیا۔''

''لے لو بیٹا تحفہ ٹھکراتے نہیں۔'' کہتے کہتے ان کی آنکھیں دھندلا گئیں یاد کرنا چاہا کہ بچوں نے مٹھائی کب کھائی تو یاد نے ساتھ چھوڑ دیا۔

''چائے لے آؤ۔'' رقیہ جانے لگیں تو عزت النساء آہستہ سے بولیں۔

''اب رات زیادہ ہوگئی۔اس وقت تکلیف مت کیجئے۔'' آواز لالہ جی تک تو پہنچ ہی گئی۔ ان کے ہاتھ پھر جڑ گئے تھے۔

''لالہ اس گھر میں تو اس وقت سے محفل جمنی شروع ہوتی تھی۔'' عزت النساء کے منہ سے ہلکی سی آہ نکل گئی۔

اس موڑ سے عزت النساء لالہ ہریہر پرشاد کے سامنے کھلنی شروع ہوئیں۔ لالہ اب ہر دوسرے دن آنے لگے اور جب آتے تو بچوں کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتے۔

پھر ایک دن: لالہ آئے کچھ دیر بیٹھے اور جلد ہی اٹھ گئے۔ چلنے لگے تو باہری دروازے پر پہنچ کر رکے، پلٹے اور ایک رومال دونوں ہاتھوں کے بیچ رکھ کر عزت النساء کی طرف بڑھایا۔انداز نذر پیش کرنے والا تھا اور لہجے میں التجا کا درد اور خوف شامل تھا:''انکار مت کیجئے گا۔''

عزت النساء کچھ سمجھ نہیں پائیں۔اندھیری رات ، ہوا تیز ، برشگال کا شور/ کروں تو کیسے کروں شمع کی نگہبانی/ ان آندھیوں میں کفِ دست کا سہارا کیا۔ان کے کچھ فیصلہ کرنے سے پہلے لالہ نے رومال ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔عزت النساء نے دروازہ بند کیا اور دروازے ہی سے ٹِک کے کھڑی ہوگئیں۔رومال کھولا شروع چاند کی رات تھی چاند کی کم کم روشنی میں انہوں نے دیکھا سوسو کے پانچ نوٹ رومال میں باندھے گئے تھے۔عزت النساء وہیں پر جیسے تھونس کر بیٹھ گئیں اور پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

لالہ اس کے بعد دس پندرہ دن نہیں آئے۔یہ عرصہ عزت النساء کے لئے بڑی بے چینی اور امتحان کا عرصہ تھا۔گھر اپنی بدحالی کی انتہا پر تھا اور رومال میں بندھے پانچ سو روپے عزت النساء بی بی کی صندوقچی کے بالکل نچلے حصے میں پڑے ہاتھوں کے لمس کو ترس رہے تھے۔اس درمیان کتنی مرتبہ بچے روئے مچلے ،بی بی کتنی مرتبہ اندر اندر ٹوٹیں بکھریں ،ان سے یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ایسے ہی کئی بے پناہ لمحوں میں ان کی نگاہ شوہر کی طرف اٹھتی اور انہیں محسوس ہوتا کہ وہ غصہ،نفرت،ترس، بیک وقت کئی جذبوں کی قید میں ہیں۔

ایسے بے پناہ لمحوں میں ایک ہی سوال پریشان کرتا۔''یہ تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے مگر میں نے اور ان بچوں نے کیا قصور کیا ہے؟''

کبھی کبھی عزت النساء تھک جاتیں۔ٹوٹنے لگتیں،سوچتیں''اب ایسا بھی کیا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ لالہ بنسی دھر مختار عام تھے، جو کچھ بکا ہوگا کیا اس کی خبر لالہ ہر یہر کو نہ ہوگی؟ ہوسکتا ہے ہر یہر پرشاد نے بنسی دھر کو خبر کی ہو اور بنسی دھر ہی نے یہ پیسہ بھجوایا ہو۔'' یہاں تک پہنچ کر وہ صندوقچی کی طرف دوڑتیں،مگر تالا کھولتے کھولتے خیال آتا:''ماتاجی نے تو صاف کہہ دیا کہ بنسی دھر کی کوئی خبر نہیں چھٹی پتری کے لئے کوئی پتہ نہیں پھر لالہ ہر یہر نے اس کو خبر کیسے کی ہوگی؟ تب یہ پیسہ؟''

عزت النساء ٹھٹھک جاتیں، پلو سے آنکھیں صاف کرتیں اور صندوقچی کے پاس سے ہٹ جاتیں،جیون تیرے رنگ ہزار کبھی بادِ بہاراں،کبھی موجِ صرصر کبھی اُمس،کبھی کھلی ہوا......''

عزت النساء کے لئے ان دنوں جینا مدوجزر میں گھرے آدمی کا اُب چُبھ کرنا تھا۔کبھی کبھی عزت النساء بی بی اپنے آپ سے پوچھتیں:

''اس میں مَد کہاں ہے عزت النساء......''

ایسے ہی بے تھاہ لمحوں میں، لالہ ہر یہر پرشاد نے ایک شام دستک دی، کچھ دیر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد عزت النساء پوچھ ہی بیٹھیں: ''لالہ بنسی دھر کی کوئی چٹھی آئی؟''

''جی نہیں ان کی کوئی خبر نہیں۔''

''اور آپ لوگوں نے کوئی خبر لی بھی نہیں؟''

''میں نے تو ارادہ کیا تھا لیکن ما تا جی آڑے آ گئیں۔''

''کیوں ما تا جی کیوں؟''

''اب چھوڑیے۔ جانے دیجئے۔ اس تفصیل میں نہ جایئے۔''

''لالہ میرے لئے یہ تفصیل بہت ضروری ہے۔ کچھ بھی چھپایئے مت۔''

لالہ نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر بدن ڈھیلا چھوڑ دیا اور بہت بوجھل لہجے میں بولے: ''ما تا جی سے ان کا اختلاف ہو گیا۔ ما تا جی کا کہنا تھا کہ تم جس جائداد کے مختار عام ہو، اس میں جو بھی بچا ہے، وہ اصل مالک کو لوٹا دو۔''

عزت النساء کے پاس اب پوچھنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ سمجھ گئی تھیں کہ لالہ کیا چھپانا چاہ رہے تھے اور لالہ بھی سمجھ گئے تھے کہ بی بی کیا پوچھنا چاہ رہی ہیں۔ دونوں کے درمیان ترسیل کی کامیابی کا سانپ پھن کاڑھے کھڑا تھا اور کیچوے کی رفتار سے رینگتی رات دونوں کے گرد اپنا جال بہت آہستگی کے ساتھ مگر بہت مضبوطی سے بنتی جا رہی تھی۔ عزت النساء، اس جال کو توڑنا چاہتی تھیں مگر وہ محسوس کر رہی تھیں کہ گھر پر فالج کا حملہ ہو چکا ہے۔ انہیں لگا وہ عورت کبھی رہی ہوں گی مگر اب وہ ایک مکھی ہیں جسے کسی دیو نے دیوار پر چپکا دیا ہے۔ انہوں نے غور سے لالہ ہر یہر پرشاد کو دیکھا...... کیا وہ دیو یہی ہے؟...... لالہ کے چہرے پر فرشتوں کی معصومیت بکھری پڑی تھی۔

اچانک لالہ ہر یہر پرشاد کھڑے ہو گئے۔ ''میں چلتا ہوں۔''

''لالہ جی۔ ایک منٹ!''

بی بی عزت النساء کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اور اچانک وہ بالکل بے خودسی اٹھیں، تیزی سے اندر گئیں، صدوقچی سے پوٹلی نکالی اور اسی بے خود انداز میں، تیز قدموں سے چلتی، باہر بیٹھک میں آئیں اور پوٹلی لالہ کی طرف بڑھائی: ''لالہ جی آپ کی امانت!''

لالہ ایک منٹ تک انہیں دیکھتے رہے۔ ان کے ہاتھوں میں روپوں کی پوٹلی تھی اور وہ ہاتھ لالہ کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ لالہ نے آہستہ سے وہ پوٹلی لی، جھک کر ان کے قدموں میں رکھ دی، اور پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنی آنکھوں سے لگا کر بغیر آواز کے زار و قطار رونے لگے۔ عزت النساء نے محسوس کیا کہ ان کا ہاتھ لالہ کے آنسوؤں سے تر بتر ہو جا رہا تھا۔

یہ ایک عجیب و غریب صورت حال تھی۔ انچاہی انجانی، عزت النساء نے چھٹپٹا کر صدیوں پر محیط لمحے کے تیز پر شور دھارے کے بہاؤ میں بہنے سے خود کو بچانا چاہا مگر انہیں محسوس ہوا کہ عجیب ان دیکھا سا ایک تیز پر شور دریا تو خود ان کے اندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اس بھیانک اور قیامت خیز لمحے میں وہ لڑکا انہیں پھر یاد آیا، جس سے شادی کے بعد بس ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی اور جس کی آواز سمندر کی آخری تہوں سے آتی سنائی دی تھی ''بی بی آپ کیسی ہیں؟ آپ کو دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔''

لالہ اس حال میں اندازاً دو تین منٹ بے خود سے رہے اور پھر تقریباً دوڑتے ہوئے نکل گئے۔

اس رات عزت النساء پر رنگوں نے یلغار کی۔ نیلا، پیلا لال کاسنی، گلابی، فیروزی، چمپئی، کتھئی، لاجوردی، کاہی، پستئی، سرمئی، آسمانی دودھیا، انگوری، کشمشی، بادامی، پیازی، سفید، کالا، ہرا...... رنگوں کی بھرمار تھی اور موسم سرد دھند میں ڈوبا ہوا، پھر پرندوں نے ان کے گرد گھیرا ڈالا۔ طوطا، مینا، بلبل، پپہیا شیاما، کوئل، فاختہ، لعل، گوریا، ٹٹہری، مور، باز، ساری رات وہ کسی پر شور دریا میں اُب چُبھ کرتی رہیں، ساری رات تھپیڑے انہیں ایک تنکے کی طرح سات دریاؤں میں اکیلی ناؤ بنائے رہے۔ ساری رات کوئی تھا جو انہیں دریا سے صحرا اور صحرا سے دریا کے درمیان گڑیے کی طرح اچھالتا رہا۔

آنکھ کھلی تو انہوں نے کالا رنگ، باز پرندہ دریا کے بے پناہ تھپیڑے اور صحرا کی سلگتی دوپہر یاد رکھی۔

مگراس دن ایک بات اور بھی ہوگئی۔وہ نہا کر آئینے کے سامنے بال سنوار نے بیٹھیں تو اچانک اپنے آپ کونظر آ گئیں اورانہیں حیرت ہوئی کہ وقت کے تھپیڑے ان کا آپا سراپا نہیں چھو پائے تھے۔لمبے بال، سرخی مائل دودھیا رنگت، خوبصورت نقش و نگار......بی بی عزت النساء کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئی جس میں اپنے آپ سے شرمانے کا انداز نمایاں تھا۔

''بی بی یہ بندے پہن لیجئے۔بہت اچھی لگیں گی آپ۔'' اچانک آئینے کے جسم پر برسوں پرانا ،بھولا بسرا، وہ باؤلا رشتہ دار چھا گیا۔

''پاگل......'' وہ کھلکھلا کر ہنستی تھیں۔

''آپ کو پتہ ہے؟ آپ ہنستے ہوئے، سر کو جھٹک کر، آگے کے بالوں کو جو پیچھے پھینکتی ہیں تو کائنات کی سانس رُک جاتی ہے۔''

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام۔ایک مرگِ ناگہانی اور ہے۔ پتہ نہیں کب کا سنا شعر ان کے ذہن میں رینگ گیا، اور جیسے ہی ذہنی رو دوسرے مصرعے پر پہنچی تو آئینے کے جسم پر لالہ ہریہر پرشاد جھلملانے لگے۔

''لاحول ولاقوۃ!'' عزت النساء ہڑبڑا کر آئینے کے پاس سے ہٹ گئیں۔مگر ایک بات ضرور ہوئی۔اس دن پوٹلی میں سے انہوں نے سو روپئے کا ایک نوٹ نکالا اور برقعہ پہن کر بازار روانہ ہوگئیں......

دوسری بات یہ بھی عجیب ہوئی کہ انہیں لالہ ہریہر پرشاد یاد آنے لگے خاص طور پر جب وہ جلال الدین کی گندگی صاف کر رہی ہوتیں تو جیسے ایک جھما کہ سا ہوتا......گھٹنوں کے بل بیٹھا، ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر روتا ایک شخص......ایک قدآور جوانِ رعنا!

وہ سر جھٹکتیں، ذہن کو دوسری طرف مرکوز کرتیں، مگر کوئی تھا جو لپ چھپ کرتا آتا رہتا، جاتا رہتا۔

اس مرتبہ لالہ لگ بھگ بیس دن کے بعد آئے

آئے بھی تو یوں کہ دستک نہیں دی ۔شام اور رات کے جھٹپٹے میں اندر داخل ہوئے اور دروازے کے اندرونی حصے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے ۔عزت النساء باورچی خانے میں کھانا تیار کر رہی تھیں ۔انہوں نے کوئی آواز نہیں سنی تھی ۔مگر کچھ عجب سی بے چینی کا احساس ہوا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر باہر نکلیں ۔سب حسب دستور تھا۔جلال الدین اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا، بچے لالٹین کی روشنی میں پڑھ رہے تھے ،چھوٹا بیٹا سو گیا تھا ......انہیں اطمینان ہوا، اپنے کام میں مشغول ہو گئیں ......مگر دو چار منٹ بعد پھر انہیں کچھ...... معمول سے الگ محسوس ہوا......وہ سمجھ نہیں پا رہی تھیں کہ دل بے کل کیوں ہے...... پھر پتہ نہیں ان کے من میں کیا آیا۔ وہ دروازے کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ذرا آگے بڑھیں ، پورا اندھیرا نہیں چھایا تھا ......دروازے کے نزدیک پہنچتے پہنچتے پہچان گئیں ......لالہ چپ چاپ کھڑے تھے!

''ارے آپ کتنی دیر سے کھڑے ہیں دستک کیوں نہیں دی؟''

''ہمت نہیں ہوئی۔'' لالہ بہت مری ہوئی آواز میں بولے۔

''آپ بھی لالہ جی......کمال کے آدمی ہیں......آیئے آیئے۔''

وہ پیچھے پیچھے باہری بیٹھک کی طرف آئے اور چپ چاپ بیٹھ گئے۔

''میں پانچ منٹ میں آتی ہوں ۔چولہے پر سبزی چڑھی ہوئی ہے......'' وہ کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

جلدی سے انہوں نے چائے کی کیتلی چولہے پر چڑھائی۔طشتری میں اس دن بازار سے لایا کچھ ناشتہ رکھا اور پھر ٹرے میں چائے۔

پانی اور ناشتے کی طشتری سجا کر باہری بیٹھک کی طرف بڑھیں۔

''ارے یہ کیا کیا آپ نے؟ لالہ ان کے ہاتھوں میں ٹرے دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''لالہ جی۔'' عزت النساء کی ہنسی میں اداسی بھی شامل تھی۔''اس میں میری بہت تھوڑی سی صرف محنت لگی ہے۔'' انہوں نے 'صرف' پر زور دیا۔

''بی بی۔''لالہ ہاتھ جوڑے بولے۔''جو چاہیے سزا دے لیجئے مگر آپ کا دل دکھانا میرا مقصد نہیں تھا۔''

عزت النساء، مدتوں بعد پہلی مرتبہ آواز کے ساتھ ہنسیں،ایک لمحے کے لئے انہیں لگا کہ غم کے بادل چھٹ گئے۔لالہ پہلی مرتبہ کچھ دیر تک رکے،تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ، پہلی مرتبہ باتوں کا رخ عزت النساء کے میکے کی طرف مڑا،اور یوں مڑا کہ خود انہیں اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ وہ حال کے جلتے سلگتے ریگستانوں سے ماضی کی نرم اور ٹھنڈی چھاؤں میں کیسے پہنچ گئیں۔وہ مائکے کے کمروں، دالانوں اور آنگنوں میں چوکڑیاں بھرتی رہیں،بالا ریز سے گلی میں مداری کا تماشہ دیکھتی رہیں، باپ کی شفقت،ماں کی ممتا،بہنیں،بھابھیاں،سکھی سہیلیاں،محبت کرنے والے بھائی اور ہلکی ٹھنڈی پھوار کی طرح انگ انگ میں اترتا اور سارے آپے سراپے کو شانت کرتا سمئے......

عزت النساء بولتی رہیں اور لالہ بس ایک ٹک انہیں دیکھتے رہے اور سنتے رہے۔مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز گونجی تو وہ چونک اٹھیں۔''ارے اتنا وقت ہو گیا؟''

لالہ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔''معاف کیجئے گا میں نے آپ کا بہت وقت برباد کیا۔''

''نہیں لالہ تم نے تو مدتوں بعد مجھ ابلا کو وقت کی قید سے آزادی دلائی۔''عزت النساء نے سوچا مگر بولیں نہیں۔

لالہ کرسی سے اٹھے،آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہری دروازے تک آئے۔عزت النساء منتظر تھیں کہ وہ باہر جائیں تو دروازے کا قلابہ اب لگا ہی دیا جائے۔مگر لالہ ڈیوڑھی پر قدم رکھتے رکھتے رک گئے۔دو قدم پیچھے ہٹے اور بی بی کے بہت قریب آگئے۔بی بی نے حیرت سے انہیں محسوس کیا۔

''ایک بات کہوں؟''لالہ کی آواز بہت بوجھل گھبرائی گھبرائی سی تھی۔

''کہیے۔''عزت النساء کی حیرت کا عرصہ ابھی مختصر نہیں ہوا تھا۔

''برا تو نہیں مانیے گا؟''

''اب تک آپ کی کسی بات کا برا مانا ہے؟''

''گھر آنے سے منع تو نہیں کر دیجئے گا؟''

''آتا کون ہے؟''

''عرض کروں؟''

''ارشاد فرمایئے۔''

''میں آپ کو......سورج کی روشنی میں......ایک مرتبہ......جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں؟''

''اس میں حرج کیا ہے؟''

''بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ یہ صحیح ہے کہ میرے میکے اور سسرال دونوں طرف، میری خبر لینے والا یا میری گرفت کرنے والا کوئی بچا نہیں، سب پاکستان جا چکے۔ اردگرد کے زیادہ مکانات شرنارتھیوں کو بیچ دیئے گئے۔ یہ بھی صحیح کہ پرانے ملنے والوں میں جو لوگ بچے ہیں، ان میں زیادہ تر سے جلال الدین کے مزاج اور بدکلامی کے سبب دوری بلکہ دشمنی کا جو رشتہ قائم ہوا، وہ اب، جب ہم خود محتاج ہو چکے، بھلا دوستی میں کیوں بدلنے لگا۔ اس کے باوجود نزدیک و دور کی گلیوں میں غریبوں کے کچھ گھر تو بچ ہی گئے ہیں۔ ان کی بچیاں پڑھنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی بچیوں کی مائیں، بہنیں بھی دن رہتے ہی آتی ہیں ان سبھوں کو شرنارتھیوں سے ڈر لگتا ہے۔ پھر میں آپ کو دن میں کیسے بلاؤں؟''

اچانک لالہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ان کا منہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے۔

''بی بی! میں مر جاؤں گا...... مجھے تھوڑی سی سانس......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے۔''

لالہ کی آواز کی سمفنی میں آنسوؤں کی آمیزش کا احساس بہت طاقت ور تھا۔

عزت النساء کو محسوس ہوا کہ گھٹنوں کے بل جھکا ہوا یہ آدمی لالہ ہریہر پرشاد نہیں ہے......یہ تو کوئی پیاسی چڑیا ہے جو گرمی کی بھری دوپہر میں پیاس سے چھٹپٹا رہی ہے۔ عزت النساء کا جی چاہا ......پہلی مرتبہ جی چاہا کہ......''

وہ بالکل بے خود ہو کر لالہ کے ماتھے کی طرف جھکیں......ان کے دونوں ہاتھ لالہ کے چہرے

کو اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے بیتاب تھے......وہ کانپتی تھرتھراتی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتی محسوس ہورہی تھی۔

گھٹنوں کے بل بیٹھے لالہ کی آنکھیں اس انداز میں بی بی عزت النساء کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں جیسے بی بی کا چہرہ نہ ہو بادل کا وہ ٹکڑا ہو جسے برسات کو ترستا کسان حسرت سے تکتا ہے۔

بی بی کا لالہ کی طرف جھکتا چہرہ اور لالہ کی پیاسی آنکھیں......یہ منظر جھما جھم برستے اندھیرے نے دیکھا، ڈیوڑھی کی چاروں طرفوں نے دیکھا، آسمان کے اس ٹکڑے نے دیکھا جس کا ناموجود شامیانہ ان دونوں پر تنا ہوا تھا۔

مگر پل بھر میں منظر بدل گیا......بی بی لالہ کے ماتھے کی طرف جھکتے جھکتے اچانک رک گئیں ......پھر بڑی مشکل سے......لالہ کی طرف جھکتی ہوئی عزت النساء......آہستہ آہستہ کھڑی ہوئیں اور رندھی آواز میں بولیں۔''لالہ! میرا جینا مشکل مت کیجئے۔میرے سر پر بڑا بوجھ ہے۔''

لالہ تڑپ کر کھڑے ہوگئے۔عزت النساء کے آنسو لالہ کے ہاتھوں پر جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔لالہ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں کو ہونٹوں تک لائے، پھر ان پیاسے ہونٹوں نے بی بی کے آنسوؤں کو جیسے چوم لیا اور لالہ کی آواز قرنہا قرن کی مسافت طے کرتی، عزت النساء تک پہنچتی محسوس ہوئی: ''بی بی، مریں آپ کے دشمن۔آپ یہ سارا بوجھ تنہا کیوں اٹھائیں؟''

''لالہ آپ جائیے۔اب مجھ سے برداشت نہیں ہورہا ہے۔''عزت النساء نے ہاتھ جوڑ لیا اور لالہ تڑپ گئے۔

''بس بی بی......بس میں جاتا ہوں۔''وہ آگے بڑھے پھر رک گئے۔آہستہ سے کہا''اسے لیتی جائیے۔''لالہ نے ایک پیکٹ ان کی طرف بڑھایا۔

''کیا ہے؟''

''مجھے اتنا تو یقین ہوگیا ہے کہ آپ میری شردھا ٹھکراتی نہیں ہیں۔''لالہ کے لہجے میں ذرا سی شگفتگی تھی۔

عزت النساء آہستہ سے مسکرائیں......''اچھا خدا حافظ!''

دروازے کا قلابہ لگا کر عزت النساء اس کمرے میں آئیں جس میں نہ شوہر تھا نہ بچے ۔انہوں نے پیکٹ کھولا۔ پیکٹ میں سب بچوں کے کپڑوں کے ساتھ ایک ساری بھی تھی اور ایک لفافے میں پانچ سو روپئے ۔اچانک عزت النساء کو یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ لالہ نے جو روپئے دیئے تھے اس پر ایک ماہ کی مدت گزر چکی۔

''خداوندا! میں کیا کروں؟'' عزت النساء آہستہ سے بڑبڑائیں۔

اس سوال کا جواب عزت النساء کو کبھی نہیں مل سکا۔البتہ لالہ ایک ہفتہ بعد آئے۔عزت بی بی دروازہ کھول کر پیچھے ہٹیں کہ وہ اندر آجائیں۔مگر لالہ خلاف توقع ڈیوڑھی پر ہی کھڑے رہے۔

''کھڑے کیوں ہیں؟ اندر کیوں نہیں آتے؟''

''نہیں۔اندر نہیں آؤں گا۔ یہ خط آپ پڑھ لیجئے گا۔''

لالہ نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔

عزت النساء نے کمرے میں آکر لالٹین کی لو تیز کی۔

''میں خود کو مجرم محسوس کرنے لگا ہوں......آپ کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کا مجھے کوئی حق نہیں......

مجھے آپ کی خدمت کرنی ہے،وہ میں تاحیات کئے جاؤں گا۔اس خدمت کا اجر صرف آپ کی خوشی ہے...... مجھے بس تھوڑی سی سانس ......تھوڑی سی ہوا کی ضرورت ہے......

''پیلی کوٹھی'' بائی پاس روڈ پر، پہلے بائیں موڑ کی دوسری گلی کا آخری مکان۔

موجود رہنے کا وقت۔ گیارہ بجے دن سے دوپہر دو بجے تک...... بدھ اور اتوار۔..................لالہ ہری ہر پرشاد

دوسرے دن اتوار تھا۔

بی بی عزت النساء تین بجے سہ پہر کے قریب گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ لالہ کی لائی ساری پہنے ہوئی تھیں۔

گھر میں داخل ہوئیں تو دیکھا، محلے کی ایک عورت ان کا انتظار کررہی تھی۔ اسی دن، مغرب بعد اس کے یہاں محفلِ میلاد شریف تھی۔

میلاد شریف میں جانے کے لئے بی بی عزت النساء نے جلال الدین کی خریدی ایک پرانی ساری نکالی، زیب تن کیا، وقت سے ذرا پہلے ہی محفل میں حاضر ہوگئیں اور میلاد انہوں نے ایسے الحاح وزاری سے پڑھا کہ سننے والوں کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ خود عزت النساء کی آنکھوں سے بھی آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

بی بی عزت النساء روئے جارہی تھیں اور جھوم جھوم کر پڑھے جارہی تھیں ۔

خدا کے قہر سے روزِ جزا ، بچالینا
بہت ہوں عاجز ولاچار ، یارسول اللہ ﷺ

☆☆☆

مور پاؤں

شام ابھی گہرائی نہیں تھی مگر طبیعت الجھ سی گئی تھی۔

کبھی کبھی خیال آتا کہ شاید بیٹی ہی ٹھیک کہہ رہی ہو، عمر کا اثر بھی تو رنگ لاتا ہی ہے مگر ہر آدمی عمر ڈھلنے پر اب ایسا خفقانی تو نہیں ہو جاتا، یا شاید موسم کی وجہ سے الجھن پیدا ہو گئی ہو، بنگال کا سیلاب، اڑیسہ کا طوفان، گجرات کا فساد......سارے میں تو اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔

مگر کیا طبیعت کے الجھاؤ کا اصل سبب واقعی یہی سب کچھ ہے؟

میں ابھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ملاقاتی اروند کمار مجھ سے ملنے آئے تھے۔

نواسے نے دروازہ کھولا اور پرنام نانا جی کہتا ہوا انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

میں نے ڈارئنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ایک ہاتھ اٹھا کر آداب عرض کیا۔ اروند کمار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر زور سے کہا ''پرنام، پرنام!''

میں پھر الجھ سا گیا مگر خموشی کے علاوہ چارہ کار کیا تھا؟

''کہاں تھے آپ اتنے دنوں؟'' میں نے اروند کمار کی طویل غیر موجودگی کی وجہ جاننی چاہی۔

''ارے بندھو! میں یہاں تھا ہی نہیں۔ پہلے تو میں اجودھیا چلا گیا، رام للّٰہ کے درشن کرنے وہاں سے کمبھ اشنان کی اکھچا تھی، الہ آباد گیا۔ وہاں دو دن اور رکنا پڑا۔ آر۔ ایس ایس کی ایک سبھا میں سمیلت ہونے کے لئے۔''

میں اروند کمار کو آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہا......اجودھیا......آر ایس ایس ......انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی ہے؟

اروند کمار میرے اچھے ملنے والوں میں ہیں......اور یہ؟

مگر یہ ایک ضمنی بات ہے۔طبیعت کے الجھاؤ کا یہ بھی سبب نہیں بن سکتا۔جب ہم لوگوں کی گلی گلی محلے محلے میں بینر اور اسٹیکر لگا رہتا ہے ''فخر سے کہو ہم مسلمان ہیں'' تو ہندوؤں کو بھی کچھ لوگ یاد دلا سکتے ہیں کہ'' گورو سے کہو ہم ہندو ہیں'' اور جب مسلمان مسلمان ہونے کی وجہ سے جماعت اسلامی ،تبلیغی جماعت ، بریلوی جماعت کہیں بھی جانے پر شرم محسوس نہیں کرتا تو ہندو بیچارہ اگر فخر سے کہے ہم ہندو ہیں یا علی الاعلان بتائے کہ ہم آر ایس ایس کی سبھا میں گئے تھے تو اس سے الجھن کیوں پیدا ہو۔میں نے اپنا سر جھٹکا اور اروند کمار جی کو ہنس کر مبارک باد دی۔

''بدھائی ہو آپ کو' کمبھ اشنان کر آئے ۔ہم لوگوں کے لئے پرشاد لائے کہ نہیں؟'' پتہ نہیں،ان کی آر ایس ایس کی سبھا میں شرکت والی بات میرے ذہن سے کیوں نکل گئی۔

''ارے ایسا کیسے ہوتا؟''انہوں نے ہنس کر کہا۔''الہ آباد کا امرود لایا ہوں۔'' انہوں نے اپنے جھولے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا پتہ نہیں،میری پرشاد والی بات ان کے ذہن سے کیوں نکل گئی۔

اسی بیچ تین چار ملنے والے اور آ گئے ۔اصل میں معاملہ یہ ہے کہ میرے داماد کا ٹرانسفر اجمیر ہو گیا تو میرا اجمیر جانا بار بار ہوتا رہتا ہے۔اب ریٹائرمنٹ کے بعد تو آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔بیٹے اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ اپنی اپنی نوکریوں پر۔ بیوی بیچ راہ میں ساتھ چھوڑ گئی ،خدا سے جا ملی ۔ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ننھی منی پری جیسی چھب والی گڑیا۔ ماں کی راج دلاری ،بابا کا نین تارہ ۔بڑا بیٹا امریکہ میں نوکری کرتا تھا وہیں ایک شریف رشتہ دار کی بیٹی سے رشتہ طے ہو گیا۔چھوٹا شروع سے شیطان تھا،اپنی پسند منوانے کا عادی،شادی میں بھی اپنی پسند پر اڑ گیا۔شروع میں تو دل کو کھٹکا لگا رہا،انجان لوگ،انجان ماحول، پتہ نہیں یہ نیا ماحول اسے راس آئے گا کہ نہیں مگر شکر کہ بیٹا بہو دونوں کنیڈا میں ہیں اور اپنی دنیا میں مست ہیں۔

دونوں بیٹوں کے باہر چلے جانے کے بعد بیوی بالکل الف گھوڑے کی طرح اڑ گئی کہ'' داماد تو ایسا ہی لاؤں گی جو ہندوستان میں ہو اور سرکاری ملازم ہو تا کہ نوکری چھوڑ کر باہر نہ بھاگ سکے۔ آخر اس کی ضد اور کوشش رنگ لائی ۔الہ آباد کا ایک گھر اس کی بیٹی کی سسرال بنا۔شریف لوگ

ہیں، کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ داماد نوکری کے سلسلے میں کبھی دہلی کبھی بھوپال کبھی کہیں کبھی کہیں۔ ان دنوں اجمیر میں ہے۔ بیٹی داماد نواسہ نواسی چھوڑتے نہیں اس لئے سال میں دو تین مرتبہ آ جاتا ہوں۔

باپ دادا وہابی خیالات کے تھے۔ میں ٹھہرا آزاد خیال، وہابیوں کی شدت پسندی سے میرا کبھی نباہ نہ ہو سکا۔ صوفیوں کے بارے میں سوچا تو لگا کہ تہذیب کی طرف اس جرگے کا جھکاؤ کچھ زیادہ ہے۔ اب خسرو سے استاد بسم اللہ خاں تک وراثت کے اتنے لمبے سلسلے کو کیسے چھوڑ دیا جائے۔ صوفیوں کا وحدت الوجود اور ہندوؤں کا ویدانتی فلسفہ، ایک رومانی تھرل محسوس ہوتا ہے سوچنے میں، ادھر قرۃ العین حیدر نے بھی کثرت میں وحدت کا ایک بڑا لمبا چوڑا اور مرعوب کرنے والا تصوراتی نگارخانہ سجا ہی دیا ہے۔

مجھے لگتا ہے کہ اسی پس منظر نے مجھے زیادہ Feed کیا ہے، باقی جو بچا وہ میری اپنی اشتراکیت کی کمائی ہے جس کا اب ہر جگہ ذکر کرنے کی آسانی نہیں رہی۔ جب تک داماد بھوپال میں رہا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا یہ شہر نوابوں کی وضع داری کا مرکز رہا ہے اور ایک ترقی پسند حلقہ وہاں اب بھی موجود ہے مگر اجمیر میں ذرا مشکل ہو گئی۔ ملنے والے آتے تو موضوع تلاش کرنا پڑتا۔ شام ابھی گہرائی نہیں تھی مگر طبیعت الجھ گئی تھی۔

سامنے صوفے پر اروند کمار، درگا پرشاد، لکشمن ترویدی اور ایک ملنے والے عید محمد انصاری۔

اروند کمار یہاں یونیورسیٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے، درگا پرشاد کسی محکمے میں انجینئر تھے اور اب میری طرح ریٹائرڈ لائف گزار رہے تھے۔ لکشمن ترویدی ٹاؤن کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ممبر تھے اور پارٹی کے ایک سینئر ممبر کی حیثیت سے پارٹی میں ان کی بڑی عزت تھی۔ عید محمد انصاری ادھیڑ عمر کے آدمی تھے، سینچائی محکمے میں جونیر انجینئر تھے یہ دراصل میرے داماد کے ملنے والوں میں سے تھے مگر ادھیڑ عمر ہونے کی وجہ سے میری محفلوں میں بھی کھپ جاتے تھے۔ ان کے محکمے کے کوارٹرس بھی یہیں پر تھے اس لئے علاقے میں رہنا ان کی مجبوری تھی۔

بیٹی داماد لوگوں کی دعوت کرنے کے شوقین تھے۔ ملنے والا خواہ میرا ملاقاتی ہو یا داماد کا، بیٹی

کا دل اور دستر خوان دونوں ہمیشہ کھلا اور بڑا رہتا۔ اروند کمار پرشاد یا لکشمن جی کے گھر والوں کا یہ مزاج نہیں تھا۔ عید محمد بے چارے نے تو کبھی اپنے گھر بلایا ہی نہیں۔

پس روز محفل جمتی اور دھڑلے سے جمتی۔ اس دن بھی محفل جمی ہوئی تھی، اروند کمار برفی کھا رہے تھے اور بول رہے تھے ''درگا بابو! اب کے تو ہم نے سنگھ سبھا میں صاف صاف کہہ دیا کہ ہندوتو کا مطلب کیول سبھیتا ہے دھرم نہیں۔ پورے بھارت ورش کی سبھیتا ایک ہے۔ کیا ہندو کیا مسلمان سب بھارت ماتا کی سنتان۔ اور بھارت ماتا کو بچانے کے لئے سبھیتا کی سمانتا انی وار یہ ہے۔'' میرا جی چاہا کہ میں اروند جی سے پوچھوں کہ کس سمانتا کی بات وہ کر رہے ہیں۔ صرف اپنے بہار میں مگہی، بھوج پوری اور میتھلی تین بڑی سبھیتائیں تو آج تک زندہ ہیں۔ اتر دکھن کے کھانے پہننے میں جو فرق ہے، بول چال شادی بیاہ کا جو فرق ہے، اس کو آپ سبھیتا کی سمانتا کیسے سمجھ رہے ہیں۔ مگر میں نے کہا نا۔ شام ہی سے طبیعت الجھی ہوئی ہے۔ ہوسکتا ہے بہت دیر تک پڑھنے کا اثر ہو۔ اصل میں کئی دن ہوئے، داماد نے کملیشور کی کتاب ''کتنے پاکستان'' لا کر دی تھی۔ آج صبح سے اس میں غرق ہوا تو شام ہوگئی۔ لگاتار پڑھنے کی عادت اب چھوٹ گئی ہے۔ ممکن ہے لگاتار پڑھنے ہی سے سر بھاری ہوگیا ہو۔ ممکن ہے سر بھاری ہونے کی وجہ سے طبیعت الجھی الجھی محسوس ہو رہی ہو۔

بہر حال! طبیعت تو الجھ سی گئی تھی۔ اروند جی کی بات پر بولنے کی خواہش ہوئی۔ پھر لگا، سب بیکار ہے۔ ہر وقت میں ہی کیا بولوں، لوگ تو بول ہی رہے ہیں۔

لوگ بول رہے تھے۔ درگا پرشاد تو اروند جی کی بالکل ہاں میں ہاں ملا رہے تھے۔ لکشمن ترویدی کانگریس کے آدمی ہیں اس لئے اروند جی کی حمایت میں بہت کم بولتے ہیں۔ آج بھی انہوں نے ایک پہلو پیدا کیا۔ کہنے لگے:

''سبھیتا کی سمانتا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارے لوگ ایک سا کپڑا پہننے لگیں، ایک سا کھانا کھانے لگیں، ایک سی بولی بولنے لگیں۔ ایسا ہونا NATURAL بھی نہیں ہے۔ سبھیتا کی سمانتا کا مطلب ہے بھارتیتا کا اندر اندر پنپنا اور باہر اس کا اس طرح انکرنا کہ بھارت ماں ایک OBJECT کے طور پر MODEL بنے اور ہم اس کے آگے اپنے کو پورا پورا سمرپت کرسکیں۔''

میں نے حیرت سے لکشمن ترویدی کو دیکھا: ''یہ آدمی کانگریس کا آدمی ہے، اس نے 'انڈیا ونس فریڈم' تو چھوڑیئے۔نہرو جی کی 'ڈسکوری آف انڈیا' بھی نہیں پڑھی؟ سامنے کی بات UNITY IN DIVERSITY کے پل کو توڑ کر یہ کس قسم کا اوبڑ کھابڑ DIVERSON بنا رہا ہے؟''

مگر میں نے کہا نا۔کملیشور کی کتاب ''کتنے پاکستان'' بہت دیر تک پڑھتے رہنے سے سر بھاری سا ہوگیا تھا۔اتفاق کی بات کہ میرا ایک بھائی ہے جو پاکستان میں رہتا ہے، کتاب پڑھنے کے دوران ہی اس کا فون آ گیا اور بات کرتے کرتے بے ساختہ، لاشعوری طور پر، بغیر سوچے سمجھے میری زبان سے ایک جملہ سلپ کر گیا: ''تم لوگ نفرت اور گھناؤنے پن کی علامت ہو۔''

''بھیا بھیا''۔وہ اس اچانک حملے سے بالکل UPSET ہوکر ہکلانے لگا...... کک ......کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ آپ ایسے کیوں بول رہے ہیں؟

فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ جملہ غلط ادا ہوگیا، میں نے گفتگو کو پٹری پر لانے کی کوشش کی مگر شاید اس کا بھی جی چاٹ ہوگیا تھا اور میں تو اندر اندر شرمندگی محسوس کر ہی رہا تھا۔اب پتہ نہیں، فون کدھر سے ڈس کنکٹ ہوا۔

''بیچارہ میرا بھائی''۔مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔وہ کسی نظریے کے تحت تو پاکستان گیا نہیں تھا۔۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء کے بیچ بھی نہیں گیا کہ یہ کہا جائے کہ بھیڑ کی نفسیات کا حصہ بنا۔وہ تو اچھا بھلا ایک بینک میں کیشیر تھا۔چین سے اپنے بال بچوں کے ساتھ اس کی صبح ہوتی تھی اور رب کا شکر ادا کرتے ہوئے رات میں سوتا تھا۔اسی بیچ اس کا تبادلہ شہر سے کنارے کے علاقے میں واقع ایک برانچ آفس میں ہوگیا۔وہاں کام کم تھا، آرام زیادہ ملا مگر ہونی کو کون روک سکتا ہے، ایک روز شام میں کیش لے کر ہیڈ آفس جا رہا تھا۔ساتھ میں سپاہی بھی تھے مگر سب مٹی کے مادھو۔غنڈوں نے حملہ کیا اور لاکھ روپئے لوٹ کر لے گئے۔تفتیش شروع ہوئی، سپاہیوں میں ڈی آئی جی صاحب کا ایک رشتہ دار بھی تھا، سب سپاہی صاف چھوٹ گئے۔ پیسہ اسی محلے کے غنڈوں سے برآمد ہوا جس محلے میں بھائی رہتا تھا۔غنڈوں نے اقبالیہ بیان میں بھائی کو بھی اپنا ساتھی بتا دیا۔گاج آخر بھائی پر ہی آ گری۔وہ لاکھ رویا گایا چھٹپٹایا، منت سماجت کی مگر قانون

کا اپنا طریقہ ہے، بھائی کے بیانِ صفائی پر غنڈوں کی گواہی بھاری پڑی ۔گرفتاری کی نوبت آ گئی ۔کمزور آدمی ، پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑا مگر دوسروں کو کیا دوش دوں میری ہمت نہیں ہوئی کہ اسے اپنے گھر میں چھپالوں ۔ اس وقت اس کو صرف ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی ۔ عرب امریکہ کہیں بھی وہ جا سکتا تھا مگر پاسپورٹ کہاں تھا ؟ لے دے کے ایک پاکستان بچا تھا جہاں الیاس احمد گدی جیسا ''ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ'' بھی گردنیا پاسپورٹ سے گھوم آیا۔ یہی پاسپورٹ میرے بھائی کے بھی کام آیا، اور میں؟

لعنت ہے مجھ پر کہ عام آدمی کی مجبوری کو نفرت اور گھناؤنے پن کا استعارہ قرار دے رہا ہوں۔

''مگر میری الجھن کا اصل سبب کیا یہی ہے؟ میں نے اپنے کو پھر ٹٹولا تو اندر سے پھر جواب آیا۔''نہیں!''

پھر طبیعت بند بند سی کیوں ہے؟ کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ہے ۔اجمیر کی شام تو بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ پہاڑوں سے گھرا یہ شہر، ماحول اور منظر کے لحاظ سے توجہ کھینچنے والا شہر ہے۔ جاتی سردیوں کی شام، پہاڑوں پر آہستہ آہستہ اترتی دھند، حدِ نظر تک درختوں کا ایک لمبا سلسلہ، آشوک ، چیڑ ،پیپل ،نیم ، دیودار اور ببول کے چھوٹے بڑے درخت اور ان کے سایوں میں گھرے کوارٹر وں پر آہستہ آہستہ اترتا اندھیرا، پہاڑوں پر بنے مندروں میں جلتے قمقمے ،ہوا کی لہروں کے ساتھ نیچے اترتی بھجن کیرتن کی آوازیں، درختوں کی طرف اوپر پرواز کرتے پرند۔

ایسے من موہ لینے والے شام کے اس مہربان لمحے میں، میری طبیعت بند کیوں ہے؟

کون سی ایسی الجھن، اندر اندر بکل مار کے بیٹھ گئی ہے جس کا پہچاننا مشکل ہو گیا ہے؟

جتنی دیر ملنے والے بیٹھے رہے، میری طبیعت الجھتی رہی ، سچ پوچھئے تو اس دن میں صرف سنتا رہا، بلکہ اور سچ پوچھئے تو میں نے سامنے بیٹھے ملاقاتیوں کی ساری باتیں سنیں بھی نہیں، وہی بولتے رہے وہی سنتے رہے، پھر روز کی طرح جب انہیں اٹھنا تھا، اٹھے اور چلے گئے۔

میری طبیعت کے اٹ پٹے پن کو میری بیٹی داماد نے محسوس کر لیا۔ دل کا مریض ہوں اس

لئے دونوں ہی گھبرا گئے ۔داماد کہنے لگا:''ابو جی !ڈاکٹر کے یہاں چلیئے گا؟ کہیے تو فون کروں؟''
میں نے سختی سے انکار کیا اور دونوں کو اطمینان دلایا کہ کوئی بات نہیں ہے ، پھر بھی بیٹی تیل کی شیشی لئے چلی آئی ۔''ابو لیٹیئے ،تیل لگا دوں؟''نواسی نواسے بھی آج شانت تھے۔میرے چھوٹے والے شریر نواسے کو بھی شاید ماں نے سمجھا دیا تھا۔کھانے کے بعد بھی وہ میرے بستر پر اچھل کود کرنے نہیں آیا۔

بیٹی داماد بہت دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے اور اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرتے رہے ۔پھر میرے سونے کا وقت ہوا تو بیٹی نے بلب آف کیا، نائٹ بلب جلایا، کھڑکیوں کے دروازے بھڑکائے پھر میری طرف آئی:

''میں جاؤں ابو؟''

''ہاں بیٹا، بالکل جاؤ۔میں ایک دم ٹھیک ہوں۔''میں نے ہنس کر اس کے گال تھپتھپائے۔ اس نے فرط جذبات میں جھک کر میری پیشانی چومی اور اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا......''میرے ابو!''

نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بھی مجھے نظر آ گیا۔اس کی آنکھوں کے گوشوارے نم ہو گئے تھے۔

میری وہ ساری رات عجب طرح سے ڈسٹرب ہوگئی ۔نیند بار بار اچٹتی رہی ، نیند ٹوٹنے پر ہر مرتبہ کمرے میں حبس کا احساس ہوتا رہا اور میں ہر مرتبہ خود کو سمجھاتا رہا۔ ابھی سردیاں ختم نہیں ہوئیں ،حبس کاہے کا؟ اور جب نیند بھی آئی تو بے خبری کی نیند مجھے میسر نہ ہوسکی ۔نیند کے ہر ٹکڑے میں کوئی نہ کوئی اٹ پٹا سا خواب اٹکا پڑا تھا۔

ایک مرتبہ دیکھا کہ اجمیر کے سارے پہاڑ اجمیر کے روضے پر گر پڑے ہیں اور اس چور چور ملبے سے ذرا ہٹ کر ایک بزرگ ہاتھ میں پرانے زمانے کا ایک بکس لیے کھڑے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا تو انہوں نے کہا:''اب چلنا چاہیئے۔''میں نے کہا:''بکس بہت پرانا ہو گیا ہے ۔''فرمایا:''اندر سے سلامت ہے۔''میں نے ذرا بچوں کے انداز میں ضد کی:''راستے ہی میں تو جے پور پڑے گا وہاں سے نیا لے لیں گے''......اس پر وہ ہنسے بھی ،اور مجھے ڈانٹ بھی پلائی:''تیرا باپ

صادق پوریوں کا شیدا اور تو پیغمبر بے کتاب کا عاشق ۔ تجھے میں جئے پور تو نہیں جانے دوں گا'' ......پھر بھی میرے چہرے بشرے کی ہچکچاہٹ شاید ظاہر کر رہی تھی کہ پرانے بکس کے ساتھ سفر میرے لئے مسئلہ بن رہا ہے ۔سوانہوں نے پیار سے میری پیٹھ پر تھپکی دی اور فرمایا: ''چلو چلو، خسرو زادِراہ لے کر آ رہا ہوگا۔''

''مگر یہ؟'' میں نے چور چور ملبے کی طرف اشارہ کیا۔

''اس میں ابھی کچھ وقت لگے گا'' ان کی آواز تھکی تھکی سی تھی مگر اس میں ناامیدی کا عنصر شامل نہیں تھا۔ پھر نیند ٹوٹ گئی اور پتہ نہیں کتنی دیر بعد دوبارہ نیند آئی۔

اب کے بڑا عجیب منظر تھا۔کہیں کوئی سبھا جمی ہوئی تھی اور اس میں تانڈو نرتیہ پر مبنی کوئی تمثیل پیش کی جا رہی تھی ۔اس تمثیل میں فلیش بیک کا جھماکہ ہو رہا تھا،منظر پر منظر بدل رہا تھا۔کبھی کسی میدان جنگ کا منظر جس میں دونوں طرف ایک ہی طرح کا نعرہ کسی نہر کے کنارے چھ مہینے کے کسی بچے کا تیروں سے چھدا لاشہ،کبھی نا قابلِ جنگ (ایدھیہ) شہروں پر میزائل برسانے کا منظر ۔پھر پردہ گر جاتا اور نیا منظر سامنے آتا۔ بھری سبھا میں ایک دیور اپنی بھابھی کو بے ستر کر رہا ہے ۔ایک عورت کو اپنی پاک دامانی ثابت کرنے کے لئے ''اگنی پریکشا '' دینی پڑ رہی ہے ۔ منظر پر منظر بدلتا رہتا ہے۔ ایک بیٹا اپنے باپ کو قید کر رہا ہے، بھائی کے ساتھ نو برس کے بھتیجے کو بھی قتل کر رہا ہے۔ ہزاروں کی بھیڑ عبادت گاہ ڈھا رہی ہے باپ بیٹی کے ساتھ ہم بستر ہو رہا ہے۔ برہنہ عورتوں کا جلوس دوڑ رہا ہے اور پیچھے سے ڈھیر سارے لوگ ان بھاگتی عورتوں پر قہقہہ لگاتے ہوئے جھپٹ رہے ہیں ۔ایک حاملہ عورت کا پیٹ چاک کر کے بچہ نکالا جا رہا ہے اور پھر اس بچے کو نیزے میں کھونس کر نیزے پر اچھالا جا رہا ہے۔تانڈو نرتیہ جاری ہے......ناچ......ناچ......''

دوسری صبح اتوار تھا۔ناشتے کی میز پر بے سوچے سمجھے میرے منہ سے نکل گیا: ''آج درگاہ چلا جائے۔''

''ہاں ٹھیک تو ہے۔'' داماد نے ہامی بھری اور بیوی بچوں کی طرف مخاطب ہو کر بولا: ''تم لوگ بھی تیار ہو جاؤ سب چلتے ہیں۔''

داماد پھر اخبار پڑھنے لگا تھا جو پہلے سے اس کے ہاتھ میں تھا۔اخبار پڑھتے پڑھتے اچانک اس کے چہرے پر چمک سی آ گئی اور میری طرف مخاطب ہوکر بولا: ''ابو!ایک اور ڈسکوری مریخ پر پانی ہونے کا ثبوت ملا۔''

''مریخ کیا؟'' بڑے والے نواسے نے سوال کیا۔

MARS! میں نے نواسے کی مشکل سمجھتے ہوئے اسے جواب دیا۔

''ارے واہ!'' نواسہ خوشی سے اچھل پڑا۔تب تو LIFE EVEDENCE بھی مل جائے گا۔مزا آجائے گا۔''

اب تو آدمی کے پیر کے Tissue سے دوسرا آدمی بھی بن جارہا ہے۔'' نواسی نے بھی اپنے علم کا پوز مارا۔

اور چاند پر بھی آدمی پہنچ گیا۔'' چھوٹے میاں بھلا کیوں چپ رہتے۔

''عراق اور پاکستان میں دس محرم کے دن بم حملہ لگ بھگ ۲۵۰/آدمیوں کی جان گئی۔ٹی وی پر اسی وقت خبر آرہی تھی۔

میں نے سنا اور چپ رہا اور کیا کرسکتا تھا۔ پھر داماد نے گاڑی نکالی۔ہم سب لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے۔گاڑی درگاہ کی طرف چل پڑی۔جس وقت ہم لوگ درگاہ میں داخل ہوئے اس وقت درگاہ کے ایک گوشے میں قوال ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گا رہا تھا:

ما کے کنیم روبہ شفا خانۂ مسیح
لعل شکر فروش توئی چارہ ساز ما

درگاہ میں جیسا ہجوم پہلی مرتبہ دس برس پہلے دیکھا تھا۔اس میں کچھ زیادتی ہی ہوئی ہوگی ،کوئی کمی نہیں تھی۔کوئی دیواروں سے ٹکراتا،کوئی دیوار چومتا،کوئی مزار کو بوسہ دیتا،کوئی مزار سے الٹے قدم باہر نکلتا،کسی کی آنکھیں گریہ سے لبریز،سبھی کے ہونٹوں پر استغاثہ اور فریاد......موپہ کرپا کرو مہاراج معین الدین...... بھانت بھانت کے لوگ،عجیب ہیئت عجیب ادا......''

میں ایک کنارے کھڑا سب کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ ہر کچھ دن کے بعد یہاں آنے کی

خواہش ہوتی ہے مگر میں یہاں کیوں آتا ہوں؟ اس کا مجھے علم کیوں نہیں ہو پاتا؟

اس وقت مجھے احساس ہوا کہ صرف اپنی الجھن ہی سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ اپنی خواہش کا بھی مجھے پتہ نہیں۔ میرے اندر کوئی اور ہے جو مجھے بے چین رکھتا ہے، مجھے دوڑائے پھرتا ہے۔ مگر کیوں؟ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کچھ دیر بعد میں نے داماد کی طرف دیکھا، وہ شاید میرا ہی انتظار کررہا تھا، بچے بھی ادھرادھر گھوم گھام کے ہم لوگوں کے پاس آچکے تھے۔

''چلا جائے؟'' داماد نے پوچھا۔ ''ہاں چلو۔''

''یہاں میری جان پہچان کے ایک خادم رہتے ہیں۔ ان کے یہاں چلا جائے ابو؟'' درگاہ کے احاطے سے باہر نکل کر داماد نے پوچھا۔

''کیا حرج ہے؟ چلو وہاں بھی ہو لیتے ہیں۔''

ہم لوگ جب خادم کے یہاں پہنچے تو خادم کی محفل جمی ہوئی تھی اور خادم صاحب بیان کررہے تھے...... خواجہ کی شان اور طاقت کا کیا کہنا، تاریخ میں درج ہے کہ حضرت خواجہ کی کھڑاؤں نے تلوار کا کام کیا ہے اور وہ تو بہت پہلے کی بات ہے، ابھی حال کا ذکر سنئیے۔ گوالیار میں خواجہ کے ایک عاشق کے گھر حکومت کے کارندے چڑھ آئے اور انکروچمنٹ کا الزام لگا کے اس کا گھر ڈھانے لگے۔ جب اس بے چارے کی کچھ نہ چلی تو اس نے وہیں سے فریاد کی: المدد یا خواجہ۔'' اس آواز کا بلند ہونا تھا کہ کارندوں کے پیر زمین دھنس گئے اور جب تک انہوں نے معافی نہیں مانگی، زمین نے ان کے پیر آزاد نہیں کیئے......'' حاضرین نے انتہائی عقیدت اور اقرار اثبات کے انداز میں سر ہلایا اور مجھے لگا کہ حبس اور گھٹن کی شدت میری جان لے لے گی۔

''چلو چلو۔ یہاں سے جلدی چلو۔'' میں نے بچوں کو وہاں پر بیٹھنے بھی نہ دیا اور انہیں لے کر کوارٹر لوٹ آیا۔

''ابو کی فلاسفی اور فائن آرٹس سے دلچسپی انہیں صوفیوں تک پہنچاتی ہے مگر ان کی وہابیت ان کو وہاں سے کھینچ لاتی ہے۔'' چلتی گاڑی میں باہر کے مناظر دیکھتے ہوئے بیٹی آہستہ سے مسکرا کر بولی۔

میں بیٹی کی بات کا کیا جواب دیتا۔ مجھے''گھیٹو(Ghetto) کا معنی دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ ویسے رات والے پہلے خواب کی تعبیر اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

گاڑی جب کوارٹر کی طرف مڑ رہی تھی، اسی وقت میں نے دیکھا۔ لکشمن ترویدی اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے اچانک یاد آ گیا، میں نے داماد سے کہا،''بیٹا ایک تکلیف کرلو، لکشمن جی کو ذرا میرا اسلام پہنچا دو۔''

''خیریت ابو؟''

ذرا ان سے ایک بات کرنی ہے۔''

''کون سی بات ابو؟'' بیٹی کے لہجے میں تجسس تھا۔

''بتادوں گا، پہلے تم بلا لاؤ۔''

تھوڑی دیر بعد لکشمن جی کوارٹر میں داخل ہوئے۔ میں تو ڈرائنگ روم کھولے ان کا انتظار کر ہی رہا تھا۔

''آیئے آیئے لکشمن جی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو بلاوقت تکلیف دی۔''

''ارے نہیں بندھو۔'' لکشمن جی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نمشکار کیا۔ اس میں کشٹ کا کیا پرشن ؟ آج اتوار ہے۔ آج تو دن بھر ہم فری ہیں۔''

ہم باتیں کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی، دنیا جہان کی باتیں، اتنے میں داماد چائے لے آئے۔ چائے کے بعد میں نے الائچی پیش کی، انہوں نے دھنیہ واد کہتے ہوئے الائچی قبول کی۔ جس وقت وہ الائچی چھیل رہے تھے، اُسی لمحہ میں نے آہستہ سے کہا:

''کل آپ کی ایک بات نے مجھے بے چین کر دیا۔''

''کون سی بات بندھو؟'' انہوں نے بہت حیرت سے مجھے ٹکا۔

آپ نے کہا تھا: بھارت ماں کو ایک Object کے طور پر ہمارا Model بننا چاہیئے۔

''ہاں کہا تو تھا۔''

''آپ تو کانگریس کے بہت Active member ہیں۔آپ کا یہ Defination سیکولرزم کی اسپرٹ سے میل نہیں کھا رہا ہے۔''

لکشمن جی نے چھیلی ہوئی الائچی ٹرے میں رکھ دی اور بہت آہستگی کے ساتھ لیکن بہت پراعتماد لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولے: ''میں کانگریسی ضرور ہوں ......لیکن آپ نے مجھے سیکولر کیسے سمجھ لیا ...... یہ غلط بات ہے...... میں ہندو ہوں!''

اس کے بعد لکشمن جی بھی چپ ہو گئے اور میری سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ اب میں آگے کیا بات کروں؟ لکشمن جی میرے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور میں ان کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، پھر بھی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ہم دونوں کے درمیان ایک عجیب سی بھیانک بے تعلقی پھنکار مار رہی ہے۔ میں شاید چاہ کر بھی اچانک ابھری اس بے تعلقی کو اکھاڑ پھینکنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ لکشمن جی نے ہی پہل کی:

''اور سنائیے کیا حال چال ہے؟ آپ لوگ ابھی کہاں سے لوٹے؟''

''درگاہ سے'' میں نے اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے باہر آتی محسوس کی۔

''ارے تو ہمیں بھی کہا ہوتا۔ ہم بھی چلتے۔ اجمیر میں تو آستھا کا دو ہی کیندر ہے، پشکر ناتھ دوسرے کھاجہ صاحب!''

پھر کچھ دیر تک وہ پسکر ناتھ اور خواجہ صاحب کی مہانتا اور بڑاپن، انہونیاں اور کرامتیں بیان کرتے رہے۔ میں ان کی باتوں میں کسی نہ کسی طرح ان کا ساتھ دیتا رہا۔ آخر تو میرے بلاوے پر وہ میرے پاس آئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد بیٹی داماد نے پوچھا تو جھوٹ بولنے کے علاوہ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ لکشمن جی نے ایک مرتبہ جے پور کے ایک ہارٹ اسپیشلسٹ کا ذکر کیا تھا، اسی کے بارے میں پوچھنا تھا۔

''تو کیا پتا چلا''؟ بیٹی کا اشتیاق بڑھ گیا۔

''ان دنوں وہ انڈیا میں نہیں ہیں۔ باہر گئے ہوئے ہیں۔'' میں اپنے جھوٹ پر مطمئن تھا کیوں کہ یہ گفتگو ان سے چند دنوں پہلے ہو چکی تھی۔

اتوار کہنے کوتو چھٹی کا دن رہتا ہےمگر یوں گزرتا ہے جیسے جوانی۔دن گزر رہی گیا اور ایک شام پھر آ گئی! الجھنوں سے بھری شام۔

دو دن سے جو بے نام سی الجھن میرے وجود میں رچ بس گئی تھی ،وہ اپنے آپے سراپے پہ بکل مارے کسی رُودالی کی طرح ہولے ہولے سیاپا کرتی رہتی۔ میں محسوس کرتا کہ یہ مقامِ افسوس ہے مگر مرنے والے کا چہرہ نگاہوں کے سامنے نمایاں نہیں ہو پاتا۔کوارٹر پر پھر ایک مرتبہ شام کا سماں تھا۔

نزدیک و دور سارے درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔لوگ باگ گھروں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ بچے اب ہوم ورک میں جٹ جائیں گے، پرندوں کے لئے شام کی تسبیح کا وقت، اجمیر میں پہاڑوں اور درختوں کی وجہ سے کبوتر ، مینا ،طوطا، گوریا شیاما پھول سنگھی ،طرح طرح کے پکھچی پکھیر و ڈیرہ جمائے رہتے ہیں۔ درگاہ میں کبوتر زیادہ رہتے ہیں۔سنا مدینہ اور کربلا میں بھی رہتے ہیں مگر یہاں کوارٹرس کے ارد گرد مور زیادہ پائے جاتے ہیں ۔مور جب موج میں آ کر پر پھیلا کرناچتے ہیں تو کیا خوب صورت منظر سامنے آتا ہے،ایسا لگتا ہے جیسے ساری کائنات کا حسن اس ایک پل کے رقص میں سمٹ آیا ہو۔مور بچپن سے میری کمزوری رہا ہے ،شاید میرے ناسٹلجیا کا حصہ ہے ۔ایک مرتبہ بچپن ہی میں والد کے ساتھ چڑیا خانہ گیا تھا۔ساتھ میں والد کے ایک دوست اور ان کی بیٹی رخشندہ بھی تھی۔اس نے پرنٹڈ سلک(Printed Silk) کا شلوار جمپر پہن رکھا تھا۔کئی رنگوں والا ایک انتہائی دیدہ زیب کپڑا ایسا لگتا جیسے کہکشاں رخشندہ کے بدن پر اتر آئی ہو۔ لال ، پیلا ، ہرا ،بلوکاسنی ،فیروزی ، چمپئی ،سرمئی ، دھانی ، کشمشی ،زعفرانی ،دودھیا، آسمانی ۔اب کیا بیان کروں۔اس کے جسم سے رنگوں اور روشنیوں کا ایک ایسا سفر شروع ہوتا نظر آتا جو آگے کہیں بڑھ ہی نہیں پاتا تھا۔ ہر رنگ جھوم جھوم کر رخشندہ کے چہرے پر نچھاور ہوتا تھا اور میں کبھی چڑیا خانے میں ناچتے اس مور کو دیکھتا جس کے پروں پر فرشتوں کی دھنک بکھیرتی صبح اتر آئی تھی اور کبھی رخشندہ کو دیکھتا جو مور کے پر سمان دھنک رنگ بنی خود قوس قزح کی طرح مور اور میرے درمیان بکھر سی گئی تھی۔

میں آج بھی اس سلسلے میں کشمکش کا شکار ہوں کہ مور رخشندہ کو دیکھ کے ناچ رہا تھا یا رخشندہ

مور کومحورقص دیکھ کے دھنک رنگ ہوگئی تھی۔ مگر جب تہذیب وتمدن کے مسائل پر غور کرنے کی منزل میں آیا تو مجھے بار بار یہ احساس ضرور ہوا کہ رخشندہ ،مور اور ہماری تہذیب تینوں ایک دوسرے سے الگ کچھ بھی نہیں ہیں۔

قصہ مختصر: اسی زمانے سے مور میری کمزوری رہا ہے۔ داماد کے ٹرانسفر کے بعد میں جب پہلی مرتبہ یہاں آیا تو دیکھا۔ آنگن کے ایک حصے میں تلسی کا پودا لگا ہوا ہے۔ میں نے مسکرا کر پوچھا ،''بیٹا یہ تلسی کا پودا ہے؟ ''بیٹی کہنے لگی :''ابو یہاں ہر گھر میں تلسی کو شبھ مانا جاتا ہے۔ میں نے سوچا بہت سے پودے ہیں ایک یہ بھی سہی!'' میں چپ رہا، بوڑھا آدمی ہوں، اپنی پسند ناپسند کسی پر لادنا مجھے ویسے بھی صحیح نہیں لگتا۔ اب اس نے لگایا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ پھر ادھر ادھر گھوما۔ دو چار لوگوں کے یہاں آیا گیا تو موروں پر بھی نظر پڑی۔

''بیٹا کئی گھروں میں دیکھا۔ یہاں لوگ مور بھی پالتے ہیں۔'' ایک دن کھانے کی میز پر میں نے بیٹی سے کہا۔

''نانا۔'' نواسی نے میری بات اچکی۔ ''مور نیشنل برڈ ہے۔''

''یہ Religious bird بھی ہے۔'' داماد آہستہ سے بولا۔

''ہاں۔'' مجھے بھی یاد آیا۔ یہ ہندوؤں کے یہاں شاید کسی دیوتا کی سواری ہے۔

بیٹی اس ساری گفتگو میں بالکل خموش رہی۔ بات آئی گئی ہوگئی۔

میں دوسری مرتبہ آیا تو میں نے بیٹی کو یاد دلایا، ''بیٹا، مور بہت خوب صورت جانور ہے۔ ایک مور پال لو۔''

''جی ابو''۔ بیٹی نے میری بات پر آہستہ سے ہنکاری بھری، مگر اس کی آواز میں اس مشورے کے تئیں عجب سی بے تعلقی محسوس ہوئی۔

تیسری مرتبہ آیا، تب بھی دیکھا، دوسرے گھروں میں مور ہے، بیٹی کے کوارٹر میں نہیں ہے۔ وسندھرا راج سندھیا راجستھان کی وزیر اعلیٰ ہوچکی تھیں اور کانگریس لیڈر کو سیکولر کہے جانے پر اعتراض تھا مگر اب مجھے یقین ہوتا چلا جا رہا تھا کہ الجھن کا اصل سبب یہ سب کچھ بھی نہیں ہے

۔بگّل مارے سیاپا کرتی رودالی کے چہرے کا گھونگٹ تیز ہوا کی شرارت سے ذرا ہٹ ہٹ جا رہا تھا۔

میں نے آنے کے ایک دو دن بعد، بیٹی سے کہا: ''بیٹا، یہ چھوٹے میاں۔'' میں نے چھوٹے نواسے کی طرف اشارہ کیا۔ ''لکشمن جی کے یہاں میرے ساتھ جاتے ہیں تو لکشمن جی کے مور دیکھ دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔''

''جی ابو۔'' شاید بیٹی میرا عندیہ سمجھ رہی تھی پھر بھی خود سے کھلنا نہیں چاہتی تھی۔

''میں ابھی باہر نکل رہا ہوں۔ایک مور لیتا آؤں گا۔''

''نہیں ابو! مور مت لائیے گا۔'' بیٹی کے لہجے میں کچھ عجیب سا دکھ اور خوف گھلا ملا تھا۔

''کیوں بیٹی۔خوبصورت پرندہ ہے۔نیشنل برڈ ہے۔''

''جی، مگر Religious bird بھی تو ہے۔''

''ہاں تو کیا ہوا؟'' میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ ''تلسی کا پودا تم نے لگایا ہے۔مور بھی پال لو۔''

''ابو۔'' بیٹی ایک لمبی سانس کھینچ کر بولی۔ ''تلسی کے پودے کی بات الگ ہے۔''

''بیٹا۔میں تمہاری بات نہیں سمجھ پا رہا ہوں۔صاف صاف بتاؤ۔''

''ابو، مور پال تو لوں، مگر وہ مر گیا تو......؟''

میری بیٹی اتنا کہہ کر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔شاید مجھ سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہیں جٹا رہی تھی۔ہوا تیز ہوگئی تھی۔پت جھڑ کا موسم شاید آن چلا تھا۔سوکھے پتے چرمرا چرمرا کر گر رہے تھے۔پہاڑ کی چوٹی پر رُودالی سیاپا کرتی نظر آئی۔تیز ہوا کے جھونکوں سے اس کا چہرا کھل کھل جا رہا تھا۔باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔بیٹی شاید منہ پر پانی کے چھپاکے مار رہی تھی۔مجھے اب اپنے دوسرے خواب کی تعبیر بھی کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی، مگر حیرت اس بات پر تھی کہ اس خواب میں کہیں رخشندہ شامل نہیں تھی......!

☆☆☆

سبحان اللہ

اوسط درجے کا مکان تھا۔

نئی وضع قطع کا تو نہیں تھا لیکن پرانے ہنداسلامی طرزِ تعبیر میں بھی کشادگی کے ساتھ ساتھ روشنی اور ہوا کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔ تین طرف بلند و بالا دیواریں ضرور تھیں مگر ان دیواروں کے سہارے جو کمرے بنائے گئے تھے ان میں روشنی اور ہوا کے لیے اونچائی پر ہی سہی پھر بھی کئی عدد خاصے بڑے روشن دان بنائے گئے تھے جن میں لوہے کی مضبوط جالیاں لگی ہوئی تھیں بلکہ ایک سمت جدھر غلام گردش اور پالکی رکھنے کے لئے کچھ رقبہ مختص کیا گیا تھا، اس طرف کے کمروں میں تو کھڑکیاں بھی تھیں۔

صدر دروازے کی طرف پہلے قدِ آدم چہار دیواری، جس میں ایک طرف کی دیوار کے لگ بھگ چار فٹ پھیلے رقبے میں ہر دو اینٹ کے بیچ اس طرح خلا پیدا کیا گیا تھا کہ ہوا اور روشنی کا بہ آسانی ہی نہیں بلکہ بہتات میں گزر ہو سکے۔ اس چہار دیواری کے اندرونی حصے میں چھوٹا سا آنگن سے لگا برآمدہ، برآمدے کے بغل میں ہال، جس کے دو طرف دروازے اور ایک طرف کھڑکی، یہ اس گھر کے بیرونی حصے کا ذکر ہے۔

بیرونی حصے کے بعد اندرونی حصہ جس میں دو سمتوں میں دو لمبے دالان ۔ ایک دالان میں ایک بڑا کمرہ، اس کمرے کے اندر ایک کوٹھری جو باکس روم یا اسٹور کہی جا سکتی ہے۔ دوسری دالان میں تین کشادہ کمرے۔ ان تینوں کمروں کے بعد سیڑھی کا حصہ اور اس حصے کی دوسری طرف باورچی خانہ۔ پھر بہت بڑا آنگن اس کی دوسری سمت یعنی کمروں کی مخالف سمت میں کنواں، ہینڈ پائپ، غسل خانہ اور بیت الخلاء (ٹوائلٹ) وغیرہ۔ اسی طرف ایک کمرہ جس میں ایک بہت ضعیف بوا رہتی تھیں جو دراصل جوانی کے دنوں میں اس گھر کی آیا، باورچن یا دائی وغیرہ تھیں۔

پہلی منزل پر دو بڑے ہال نما کمرے اور ان کے علاوہ تین کشادہ کمرے، ٹوائلٹ باتھ روم الگ، آگے میں کھلی چھت، اور پھر اس کے اوپر دوسری منزل پر ایک بہت بڑی چھت اور کنارے پر ایک کشادہ کمرہ۔ اس کمرے کی چھت سے جسے تیسری منزل کہا جاسکتا ہے، پورا شہر آنکھوں کے پیالے میں سمٹ آتا تھا۔

گھر جس علاقے میں تھا اسے گلی یا محلے کا علاقہ تو نہیں کہا جاسکتا مگر کالونی کہنا بھی یقیناً مبالغہ نہیں بلکہ کذب ہوگا۔ دراصل یہ گھر شہر کی صدر شاہراہ کے ایک موڑ سے محلے کی طرف مڑتی ہوئی ایک پختہ سڑک کی بالکل ابتداء میں واقع ہونے والا چوتھا گھر تھا۔ یعنی اس گھر کے اردگرد حد نگاہ تک بازار کیا کوئی دوکان بھی نہیں تھی۔

اور یوں بھی جن دنوں کا ذکر ہے ان دنوں بازار الگ ہوا کرتے تھے اور بازار میں بھی لوہارٹولی الگ ہوا کرتی تھی اور سنارٹولی الگ، پھر گولہ ایک الگ چیز تھا جس میں سبزی اور غلہ ملتا تھا اور بازار ایک قدرے مختلف تصور پیدا کرتا تھا، کپڑوں، جوتوں اور کاسمیٹکس کی دوکان کا مرکز۔ بعد کے دنوں میں اسی بازار کے علاقے میں فوٹو کھینچنے کی دوکان، درزی کی دوکان اور میڈیکل شاپ وغیرہ کھلتی دکھائی دیں۔

جس گھر کا ذکر ہے وہاں صبح فجر کی اذاں کے ساتھ شروع ہوتی تھی۔ مولانا سبحان اللہ فجر کی اذاں کے ساتھ اٹھ جاتے، ان کے اٹھنے کے آس پاس اہلیہ بھی بستر چھوڑ دیتیں، جاڑے کے دنوں میں اسٹووجلا کر پانی گرم کیا جاتا اور دونوں میاں بیوی اپنے مصلیٰ پر نماز سے فارغ ہوتے۔ دونوں کے نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہوتے بلاقن بوا باورچی خانے میں پہنچ جاتیں، نماز سے فارغ ہوتے ہوتے دونوں کے سامنے صبح کی چائے آجاتی۔ چائے کے بعد شوہر اپنے نظام الاوقات کے مطابق ٹیبل پر آجاتے اور کل رات جو کتاب جہاں تک پڑھی تھی اس سے آگے پڑھنا شروع کر دیتے، ادھر بیوی بھی کمرے سے نکل آتیں۔ یہ وقت پوری طرح صبح ہوجانے کا ہوا کرتا تھا۔

اب بچوں کے اٹھنے کا وقت ہوتا۔ شادی شدہ لڑکوں کا کمرہ کھلتا۔ سب امی جان کو آداب بجالاتے ہوئے دالان میں آجاتے۔ اگر بیٹیاں میکے آئی ہوئی ہوتیں تو وہ بھی باہر نکل آتیں۔ پھر دھوپ نکلتے نکلتے ناتی پوتوں کی چہکار سے پورا گھر گونجنے لگتا۔

آٹھ بجتے بجتے سب نہادھوکر فارغ ہوتے۔یہی وقت مولانا سبحان اللہ کے اوپر سے نیچے آنے کا ہوتا۔دالان میں بچھی بہت بڑی چوکی پر دسترخوان سجتا۔مولانا کے نیچے اترتے ہی بیٹے ،داماد ، بیٹیاں ، بہوئیں ،ناتی پوتے فرداًفرداً انہیں آداب کرتے ۔ مولانا سب کودعائیں دیتے ہوئے دسترخوان پر بیٹھ جاتے اور جب تک مولانا اپنی رکابی میں ایک روٹی رکھتے ہوئے یہ نہ کہتے ''بسم اللہ کرو'' کسی کی مجال نہیں تھی کہ ناشتے کے کسی آئٹم کی طرف ہاتھ بڑھادے۔ناشتے کے بعد چائے کا دور چلتا اوراس دوران گھر کے تمام افراد کا مولانا سے انٹرایکشن مختلف قسم کے مسائل مختلف قسم کے موضوعات ،سماج ،سیاست ، مذہب ،ادب ،شہر کی تازہ خبریں ،رشتہ داروں کے احوال، چائے کا یہ دورتقریباًایک گھنٹہ چلتا۔سوانو سے ساڑھےنو بجے کے درمیان یہ محفل اختتام کوپہنچتی اورمولانا بنگلے کی طرف رخ کرتے جہاں کوئی طالب علم ،ملاقاتی یاسوالی پہلے سے موجود ہوتا یامولانا کے پہنچتے پہنچتے پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ چلتا۔اس دوران پروفیسر بیٹا کالج کے لئے روانہ ہوجاتا،وکیل بیٹا کچہری رخصت ہوتااورڈاکٹر بیٹا مطب کارخ کرتا۔

ساڑھے دس گیارہ کے درمیان مولانا گھر کے اندرتشریف لاتے اور چوکی کے پاس رکھی آرام دہ کرسی پرذرا آرام کرنے کے انداز میں فروکش ہوجاتے ۔آدھ گھنٹے کا یہ وقت مولانا کے ذراپیٹھ سیدھی کرنے کاوقت بھی ہوتا،ایک پیالی چائے پینے کا بھی اور بالخصوص بیوی اور بہو سے مخاطبت کا بھی۔اسی وقت اسکول نہ جانے والے بچے ان کے پاس لائے جاتے ،وہ انہیں پیار بھی کرتے اوراگرکسی کے لیےضروری سمجھتے تو اسے کچھ پڑھ کردم بھی کرتے۔

ساڑھے گیارہ بجے مولانااوپر چلے جاتے اوراپنے پڑھنے کی میز پردوبارہ بیٹھ جاتے ۔پڑھنے کی میز پر بیٹھنے سے پہلےان کا پن ڈبہ پان سے بھرکررکھ دیا جاتا اوربغل میں تازہ تازہ گرم کیا ہواحقہ بھی ،اب مولانا کی حقے ،کتاب اور پان سے یاری چلتی ۔اس یار باشی کاوقفہ گھنٹے سوا گھنٹے ہوتا۔ساڑھے بارہ سے پونے ایک کے درمیان مولانا میز سے اٹھ جاتے ۔پہلےٹوائلٹ پھروضو،تب تک اذان ہوجاتی،مولانا نماز کے لئے کھڑے ہوجاتے۔

نمازختم ہوتے ہوتے کھانا ان ہی کے کمرے میں آجاتا۔یہ وقت چوں کہ بیٹوں کے گھر سے باہر رہنے کا ہوتا لہٰذا دوپہر کا کھانا مولانا اہلیہ کے ساتھ تناول کرتے۔کھانے کے بعد دوسوادو کے

درمیان قیلولہ کی نیت سے بستر پر جاتے ،اٹھتے تو عصر کا وقت ہو چکا ہوتا۔عصر کے لیے تیار ہوکر وہ مسجد جاتے اور عصر کی نماز سے فارغ ہوکر مغرب تک کا وقت وہ مسجد ہی میں گزارتے ،اس درمیان خلقِ خدا ان کے پاس 'افادۂ دین ودنیا' کی نیت سے جمع ہوتی ۔یہ سلسلہ اذانِ مغرب تک چلتا ۔مغرب سے فارغ ہوکر گھر لوٹتے اور بنگلے پر احباب کی محفل جم جاتی۔

اس محفل کے اختتام پذیر ہوتے ہوتے عشاء کا وقت ہوجاتا۔مولانا عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر پھر دالان میں بچھی چوکی پر تشریف فرما ہوجاتے ۔دسترخوان بچھ چکا ہوتا، بیٹے ،داماد آ چکے ہوتے ،کھانا شروع ہوتا ۔کھانے کے اختتام پر گفتگو کی محفل نہیں جمتی ،سب اپنے اپنے کمروں کا رخ کرتے۔

مولانا ساڑھے نو سے گیارہ بجے تک مصروف مطالعہ نظر آتے۔

ساڑھے گیارہ کے قریب مولانا کے کمرے کی بتی گل ہوجاتی ،اسی کے آس پاس پورے گھر پر سناٹا چھا جاتا اور اس طرح اس ایک اوسط درجے کے مکان کا ایک دن تمام ہوتا۔

افرادِ خانہ ایک مخصوص اندازِ زندگی کے عادی تھے ۔گھر میں بالعموم باتیں بلند آواز میں نہیں کی جاتی تھیں ۔عورتوں اور لڑکیوں کا سر ساڑی یا اوڑھنی کے آنچل سے ڈھکا نظر آتا۔جس چوکی ،مسہری یا پلنگ پر عورتیں بیٹھی رہتیں اس پر بالغ لڑکے یا مرد نہیں بیٹھتے۔گھر کی دائیوں سے مرد اور نوکروں سے عورتیں عام حالات میں ہم کلام نہیں ہوتیں ۔گھر کے مرد یا لڑکے بالعموم بازاروں میں نظر نہیں آتے ،اگر یہ راستہ طے کر رہے ہوتے اور اس بیچ کسی شناسا پر نگاہ پڑ جاتی تو چھوٹوں کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ جاتا اور بڑے زیرِ لب دعا دے دیتے مگر کوئی راستے میں رک کر ایک دوسرے سے گفتگو نہیں کرتا۔ بڑوں کی محفل میں چھوٹے بیٹھ تو جاتے مگر خاموش رہتے ،چھوٹوں کی محفل میں بڑے کبھی بیٹھے دکھائی نہیں دیتے ۔عیدین کے مواقع پر گھر کے بڑوں کی قیادت میں سب چھوٹے ایک ساتھ چلتے اور رشتہ داروں کے یہاں جا کر عید کی مبارک باد دیتے ۔لڑکیاں چھتوں اور کھڑکیوں سے باہر نہیں جھانکا کرتیں اور شرفا کے لڑکے محلے کے چوک پر کبھی دکھائی نہیں دیتے۔عورتوں اور لڑکیوں کے دوسرے گھروں میں یا اسکول آنے جانے کے لیے ڈولی ،پالکی اور (بعد میں) رکشوں کا استعمال ہوتا تھا۔

اس ذکر کو آزادی کے آس پاس کا ذکر سمجھا جانا چاہئے۔

آزادی کے اولین دنوں ہی میں دونوں بیٹیوں کے میکے والوں کو پاکستان جانے کی دھن سوار ہوگئی۔مولانا سبحان اللہ نے حتی الامکان اپنے سمدھیوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر جادو تو وہی جو سر چڑھ کر بولے اور مولانا جادو اور کالے جادو سب کی تاثیر سے واقف تھے مگر، بیٹی پرایا دھن، کیا کرسکتے تھے،ایک بیٹی کی سسرال والے مشرقی پاکستان گئے،دوسری بیٹی کا شوہر اور جیٹھ مغربی پاکستان۔مشرقی پاکستان والی بیٹی تو بنگلہ دیش بننے کے مراحل میں تباہ و برباد ہوگئی،ساس دیور مارے گئے۔بیٹی داماد کسی طرح بھاگ کر کاٹھمنڈو پہنچے اور وہاں سے کینیڈا۔بعد میں خبر ملی کہ دونوں بہنوں نے کراچی میں کسی ایک جگہ دو فلیٹ خرید لیے ہیں اور خوش ہیں۔

خود مولانا کے شہر اور محلے میں جو بھگدڑ مچی تو اچھے اچھوں کے پیرا کھڑ گئے۔صدر شاہراہ کا موڑ مڑنے پر جو پہلے کے تین مکانات تھے،تینوں کے مالک نے چپکے چپکے اوراونے پونے اپنے مکانات ہندو مارواڑیوں کے ہاتھ بیچ دیے اور مسلمانِ شہر یا محلّہ دار تو الگ چیز ہیں، رشتہ داروں کو بھی بھنک نہیں لگنے دی۔

جن دنوں یہ سب کچھ واقع ہورہا تھا،ان دنوں مولانا بار بار شکرانے کی نماز پڑھتے اور ربِ کریم کا شکر ادا کرتے کہ اس نے ان کو عزیمت کی راہ چلنے کا حوصلہ بخشا اور رخصت بلکہ ہزیمت سے بچالیا۔۱۹۴۷ء کے بعد برسہا برس تک یہ بھگدڑ جاری رہی......مولانا کے پاس دم سادھ کر بس دیکھتے رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا!

اس زمانے تک صدر شاہراہ، جو اسٹیشن سے بازار تک جاتی ہے،خطوں میں منقسم تھی،اسٹیشن سے دھرم شالے تک کا علاقہ بازار کے لیے مختص تھا اور اس علاقے میں رہائشی مکانات کم از کم تھے اور جو تھے وہ مارواڑیوں کے یا پس ماندہ ہندوؤں کے،اشراف ہندوؤں کے علاقے دوسرے تھے اوران میں بھی صرف رہائشی مکانات تھے۔اسی طرح مسلم اشراف کا جو علاقہ دھرم شالے کے بعد سے شروع ہوتا تھا ان میں بھی بیچ بیچ میں کچھ کرانے کی دوکانیں نظر آتی تھیں مگر یہ دراصل ان مکانات کے ذیلی حصوں میں تھیں جن کے مکان مالک بھی دراصل ذات کے بنیے تھے۔اغلب یہ ہے کہ یہ کیسری برادران شہر بسنے کے ابتدائی ایام میں خان صاحبان اور میر صاحبان کی عنایتوں کے

طفیل ان کی غلام گردشوں میں رہنے کے لیے تھوڑا بہت حصہ پا گئے تھے اور بعد کے دنوں میں انہی حصوں میں انہوں نے بہت چھوٹی چھوٹی کرانے کی چند دو کانیں کھول لی تھیں۔ پھر بھی انہیں کسی حیثیت سے تجارتی مرکز قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔

مگر ۱۹۵۶ء کے بعد آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر صورت حال بدلنے لگے۔

مثلاً دھرم شالے کے بعد دائرہ محلّہ کی سرحد شروع ہوتی ہے اور اس محلے کا جو رخ صدر شاہراہ کی طرف ہے، اس رخ پر ایک بہت ہی نیک شریف اور غریبوں کے کام آنے والے بزرگ نے خدمت خلق کی غرض سے ہومیو پیتھک علاج کا ایک مرکز قائم کیا۔ اس کی ضرورت ان کو یوں محسوس ہوئی کہ نامی گرامی رؤسا جب زمین داری کے خاتمے کے بعد پاکستان بھاگے تو بچ گئے تباہ حال اشراف یا محنتی پس ماندہ مسلمان۔ ان تباہ حال اشراف کا المیہ یہ تھا کہ آزادی کے وقت بچ جانے والے حضرات میں کچھ تو ساٹھ سے ستر کے درمیان کے تھے جب قویٰ مضمحل ہو چکے ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کی دوسری نسل جو چالیس سے پچاس کے درمیان کی تھی اس کی گاڑی کاشتکاری یا اوقاف کی جاری امداد یا رئیسوں کی درباراداری کے سہارے ہی چلتی تھی مگر ۱۹۵۶ء کے بعد جو مجموعی صورتِ حال سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ زمینداری خاتمے کے قانون کے تحت زمین داری بحقِ سرکار دریا برد ہوئی اور جو زمیندار نہیں تھے، صرف کاشتکار تھے، بہ مشکل پچاس ساٹھ بیگھہ کھیت کے مالک، ان کے کھیتوں اور اسامیوں نے اس زمانے میں برپا ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کا سہارا لے کر مالکوں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا اور مالکوں کو جان سے مارنے کی دھمکی دے کر گویا کھیت بدر کر دیا۔ باقی بچ گئے اوقاف تو اوقاف کے ساتھ دو صورتِ حال درپیش ہوئی۔ وقف کے تحت جو کھیت تھے ان کے کمیا اور اسامی بھی دوسرے اسامیوں کی طرح دیدہ دلیر ہو گئے۔ نتیجتاً اوقاف کے متولیوں نے شہر اور اس کے اردگرد کی پرتی اور غیر مزروعہ زمینوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ اب تو ان کی اپنی شکم پروری کا مسئلہ درپیش تھا ضرورت مندوں کی طرف نگاہ کون اٹھاتا۔ رئیسوں کی نوے فیصد آبادی تو پاکستان جا چکی تھی دربار کہاں سے سجتا کہ دربار دار منڈلاتے، جو تھوڑے بہت رؤسا بچ گئے تھے انہوں نے بھی اپنا بھلا اسی میں جانا کہ دربار کو فی الحال مقفل کر دیا جائے ورنہ ایک انارسو بیمار والی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایسے منظرنامے پر بچ گئے تباہ حال اشراف اور محنتی پس ماندہ مسلمان!

ان نیک دل،شریف اور غریبوں کے کام آنے والے بزرگ سے ان کی پریشانی دیکھی نہ گئی ،ہومیوطریقۂ علاج سے شغف تھا، اللہ کا نام لے کر ایک دواخانہ کھول دیا اور مفت لوگوں کا علاج کرنے لگے۔جلد ہی ایک بڑی، بھیڑان کے مطب کا چکر کاٹنے لگی۔ڈاکٹر صاحب بھی خوش تھے کہ اللہ ان سے غریبوں کی خدمت کا فریضہ انجام دلوار ہا ہے،مگر تقریباً سال بھر تک خدمت خلق کا نظارہ بہت خوشی سے دیکھنے والی ڈاکٹر صاحب کی اہلیہ نے جب ڈاکٹر صاحب کو یاد دلایا کہ گھر میں بچا ہوا سارا پیسہ غریب مریضوں کی دوا کی نذر ہو چکا تو ڈاکٹر صاحب بھی چونکے ،دوستوں عزیزوں نے بھی سمجھایا کہ ذوی القربیٰ اور یتیم ومسکین کے حقوق سے انکار کفر ہے۔آپ مفت تشخیص کر کے نسخہ لکھ دیجئے ، جو بہت غریب ہے اس کو دوا بھی دے دیجئے مگر آپ نے عمومی طور پر جو کسی سے بھی پیسہ نہ لینے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے یہ سلسلہ کسی نہ کسی دن آپ ہی کو خیراتی دواخانے میں لے جا کر کھڑا کر دے گا۔

ڈاکٹر صاحب نے بہ جبر واکراہ اس مشورے کو قبول کر لیا۔

اب ڈاکٹر صاحب صرف نسخہ لکھ دیتے تھے اور مریض کسی دوکان سے دوا خرید لیتا تھا ، مگر ڈاکٹر صاحب کی جمع پونجی تو پہلے ہی نکل چکی تھی ،اس پر سارے کا سارا دن مریضوں کی نذر ۔کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہیں تھا۔جب حالات بے قابو ہونے لگے تب گویا مجبوراً ڈاکٹر صاحب نے مطب کے بغل میں ہومیو پیتھک دواؤں کی ایک دوکان کھول لی۔اس سے مریضوں کو بھی کہیں اور جانے سے نجات مل گئی اور ڈاکٹر صاحب کا معاشی مسئلہ بھی کسی قدر حل ہو گیا۔پھر کچھ ہی دنوں بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک اور بات محسوس کی ، بہتیرے مریض ایسے آتے جن کو سرجری کی ضرورت ہوتی۔ان کی داروئے شفا تو ڈاکٹر صاحب کے پاس تھی نہیں ،وہ دل مسوس کے رہ جاتے ۔وہ تو اتفاق سے خاندان کا ایک عزیز M.B.B.S کر کے ان سے ملنے آیا تو ڈاکٹر صاحب کو اچانک اپنے مریضوں کی یاد آ گئی ،انہوں نے اس عزیز کو مجبور کیا اور اس نے ڈاکٹر صاحب کے بغل ہی میں اپنی کلینک کھول لیا۔مگر کلینک کھول لینے سے بھی مسئلے کا کلی حل تو نہ نکل سکا۔وہ تو سرجن تھا اور صرف نسخے اور دوا سے سرجیکل کیس کا نپٹارا تو نہیں ہو سکتا تھا۔کلینک کے بغل میں ڈاکٹر

صاحب کے ایک عزیز کی پرتی زمین تھی اور وہ بھی تقسیم کا مارا ہوا تھا۔اس نے ایک دن ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ اگر سرجن صاحب چاہیں تو اپنا نرسنگ ہوم پرتی زمین پر بنالیں اور جو لاگت آئے اس کو کرائے میں منہا کرلیں۔سرجن صاحب اس بات پر خوش ہوئے،نرسنگ ہوم بن گیا اور سرجن صاحب کی کلینک میں ایلو پیتھک دواؤں کی دوکان بھی کھل گئی۔

اب صورتِ حال یہ سامنے آئی کہ ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک دونوں طرح مریضوں کا اس علاقے میں جمگھٹا لگا۔جن مریضوں کا آپریشن ہوتا،وہ اور ان کے گھر والے اس علاقے میں ایک ہفتہ سے پندرہ دن تک متواتر رہنے لگے۔مسئلہ پیدا ہوا ان متواتر رہنے والوں کی چائے ناشتے اور کھانے کی ضرورتوں کی تکمیل کا۔

آخر کار ایک ہوٹل بھی کھل گیا۔

غیر محسوس طور پر ایک نئی صورتِ حال سر اٹھاتی جارہی تھی۔اس کا شدید احساس مولانا سبحان اللہ کو اس دن ہوا جب وہ محلّہ دائرہ کی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے اپنے مکان سے نکل کر صدر شاہراہ پر آئے۔یہ ذکر ۱۹۵۶ء کے بعد کا ہے۔وہ اپنے موڑ سے دائرہ تک ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے گئے تو انہیں احساس ہوا کہ گزشتہ پانچ دس برسوں میں تو گویا دنیا ہی بدل گئی۔چوکھنڈی،منڈی کشور خاں اور ان دونوں کے ایک طرف محلّہ حضرت شاہ ہارون عرف برتلہ اور دوسری طرف دائرہ۔ان چار محلوں سے گزرتی ہوئی صدر شاہراہ (مین روڈ) پر کم از کم دونوں طرف پچاس پچاس یعنی سو مکانات تھے اور دوکانیں شاید دس بھی نہیں ہوں گی۔یہ تذکرہ ہے آزادی سے پہلے کا۔مگر اس شام جب مولانا سبحان اللہ محلّہ دائرہ کے لئے چلے تو اندازہ ہوا کہ چار محلوں پر محیط اس پورے رقبے میں کم از کم پچاس دوکانیں خریداروں سے بھری ہیں۔

''رب کریم !اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟''مولانا سبحان اللہ اتنا آہستہ آہستہ بدبدائے کہ شاید فرشتوں تک بھی بدبداہٹ نہ پہنچ پائی ہوگی۔

گھر لوٹ کر مولانا سبحان اللہ نے پھر شکرانے کی نماز پڑھی اور سجدہ ریز ہوکر بارگاہ الٰہی میں عرض گزار ہوئے کہ''مولائے قدیر! تیرا ہزار ہزار احسان کہ تو نے اس ناچیز کو محلے کے اندر کی پرسکون زندگی عطا فرمائی۔''

مگر اتنا عرض کرتے کرتے مولانا سوچ میں پڑ گئے۔انہیں یاد آیا کہ پچھلے برس سے اب صبح میں آنے والے طالب علموں، ملاقاتیوں اور سائلین کی تعداد بتدریج قلیل ہوتی جارہی ہے آنے والے اب زیادہ تر مغرب بعد آتے اور کچھ دیر رک کر روانہ ہو جاتے۔

پھر بھی مولانا شکر گزار تھے کہ رب کریم نے انہیں مرجع خلائق بنایا۔

مگر طالب علموں اور ملاقاتیوں سے محو گفتگو ہونے کے دوران انہیں اپنا اضطراب زیادہ ہوتا محسوس ہوا۔ پہلے طلبائے علم بالعموم مشکوٰۃ، قدوری، بیضاوی اور جلالین کے متن پر گفتگو کرتے، جو ذرا منطقی یا کلامی ذہن رکھتے وہ منطق کے قضایا اور جزء لا تجزیٰ کے جزوی مگر خصوصی نکات پر انشراح صدر کے طالب ہوتے، یا وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر گفتگو چل نکلتی۔ بعض بعض طلبہ تاریخ میں دلچسپی رکھے تھے پس وہ عربِ جاہلیہ سے اندلس تک کا ذکر چھیڑتے اور اندلس سے مسلمانوں کے اخراج کے اسباب پر اپنا اضطراب ظاہر کرتے۔مولانا کے رفقاء میں علما کے ساتھ ساتھ شعراء اور ادباء بھی ہوا کرتے تھے مگر صبح وشام کی مجلسوں میں یہ حضرات بالعموم دقیق علمی مسائل سے گریز کرتے ہوئے شعروادب کے مختلف پہلوؤں پر محو گفتار نظر آتے۔ بیچ بیچ میں جب نہ تب کوئی اچھا شعر یا اچھا فقرہ ہر صبح یا ہر شام حاصل محفل بن جاتا۔مجلس کا اختتام بالعموم مولانا کے کسی نہ کسی دوست شاعر کے کلام پر ہوتا۔مگر بعد کے ایام میں محو گفتگو ہونے کے دوران ایک دن مولانا کو کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

طلبائے علم علمائے شہر اور شعرائے عہد کی گفتگو بیچ بیچ میں جب نہ تب اپنا چولا بدلنے لگی تھی۔

دراصل ہوا کچھ یوں کہ ایک شام ذکر چھڑا ہوا تھا متقدمین شعراء کے یہاں دست یاب روحِ عصر کا۔اس ضمن میں کئی مثالیں بھی پیش کی جاچکی تھیں، مثلاً:

میرؔ کا شعر:۔

شہاں کہ کحلِ جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انہی کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

غالبؔ کا شعر:۔

داغ ِ فراقِ صحبت ِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سووہ بھی خموش ہے

مومنؔ کا شعر:ـ

شبنم خراب، مہرکتاں ، سینہ چاک ماہ
لواور بھی ستم زدہ ٔ روزگار ہیں

اسی دوران نسبتاً ایک نوجوان شاعر شعیب راہیؔ نے آزادی ہند کے بارے میں ترقی پسند شاعر فیض احمد فیضؔ کا ایک شعر پیش کیا:

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تونہیں

موجود بزرگ اور ثقہ علماء وشعرادونوں ہی منغض ہوئے کہ اثرلکھنوی جیسے عمائدین ادب کے اثرات ابھی زائل نہیں ہوئے تھے اور مہذب محفلوں میں ترقی پسندانہ گفتگو یا اشعار کو (معتوبِ شرفا) تصورِاشتراکیت کا اثر سمجھنے کے سبب ایک قسم کا ذہنی انحراف والحاد متصور کیا جاتا تھا۔

مگر سبحان اللہ کی محفل کا یہ اختصاص بھی تھا کہ اس میں بزرگ اور جوان دونوں نسلوں کے صاحبانِ بینش ودانش شرکت فرماتے تھے۔پس یوں ہوا کہ شعیب راہی صاحب کی اس جرأت کے بعد وہاں موجود تازہ واردوں کو گویا حیلۂ غیبی ہاتھ آگیا اور ُروحِ عصر ُ کے حوالے سے جو گفتگو آگے بڑھی تو عصر حاضر میں خوئے وفا کی کمیابی کے ضمن میں ملک میں شر پسند عناصر کی فتنہ پردازی ،فرقہ وارانہ فسادات اور ہندوستان میں مسلمانوں کی بدحالی کے ذکر سے گزرتے ہوئے دھرم شالے سے برتلے تک ہندوؤں کی تاجرانہ موجودگی اور شاطرانہ افزودگی سب زیر بحث آ گئے اور مولانا سبحان اللہ ہکابکا بس ایک ٹک دیکھتے رہ گئے ......اس دن سے ان کی محفل ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

وہ رئیس تو تھے نہیں کہ جب چاہتے دربار میں تالا لگا دیتے۔وہ تو عالم اور فقیر تھے۔فقیر کا حجرہ بود سے نابود ہو جاتا ہے مگر بند نہیں ہوتا۔

مولانا کی محفل ویسے ہی برپا ہوتی رہی مگر گفتگو کا رخ مڑ چکا تھا۔کبھی کوئی بیان کرتا فلاں جگہ

ڈاکہ پڑ گیا۔ کوئی بتاتا کہ فلاں آدمی کا قتل ہو گیا۔ ایک دن کسی نے کسی کے بارے میں خبر دی کہ اس نے نمبر دو کی کمائی سے لاکھوں کما لیا اور اب اس کی جھونپڑی محل میں تبدیل ہو رہی ہے۔

جن دنوں کا یہ ذکر ہے انہی دنوں میں سے کسی ایک دن مولانا نے دیکھا کہ ان کے بغل کے بغل میں یعنی صدر شاہراہ سے محلے کا موڑ مڑنے پر جو پہلا مکان ایک عزیز کسی مارواڑی کے ہاتھ فروخت کر کے پاکستان چلے گئے تھے، وہ مارواڑی مکان کی طرف واقع باہری دیوار تڑوا کر اس میں تین دو کانیں بنوا رہا ہے۔

محلے کے اندر دوکان بننے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔

اسی زمانے میں کسی ایک صبح : دستر خوان پر پروفیسر بیٹا دکھائی نہیں دیا۔ مولانا نے متحیر اور سوالیہ نگاہ اہلیہ پر مرتکز کی تو وہ آہستہ سے بولیں: ''اس کی روٹین میں ایک کلاس سویرے کا بھی جڑ گیا ہے ،اس لیے وہ پہلے ہی ناشتہ کر کے جا چکا۔'' بات کچھ سمجھ میں نہ آئی مگر دستر خوان پر مولانا پہلی مرتبہ تکدر کا شکار ہوئے۔ ماں نے شاید بیٹے کو باپ کے استفسار کی بابت اطلاع دے دی تھی۔ عشائیہ کے وقت بیٹا ماں کے اجمال کی تفصیل بیان کرنے لگا: ''اب لڑکوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے اس لیے انتظامیہ نے کئی سکشن کر دیے ہیں۔ پہلے سکشن کا کلاس 8.00-8.50 ہے اور دوسرے سکشن کا کلاس 8.50-9.40 تک جاری رہتا ہے۔'' مولانا نے بیٹے کا یہ بیان حیرت اور افسوس سے سنا اور خموش رہے۔ حیرت اس بات پر ہوئی کہ عشائیہ کے اوقات میں گفتگو اس گھر کے نظام الاوقات میں شامل نہیں تھی اور افسوس اس بات پر ہوا کہ ان کا پروفیسر بیٹا بازاری زبان بولنے لگا تھا۔

دوسری صبح مولانا ناشتے کے بعد چائے نوشی کے دوران پروفیسر بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے :کل آپ بتا رہے تھے کہ طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب تدریسی حلقوں یا درجات کو کئی ٹکڑوں میں منقسم کرنا پڑا۔''

''جی ابا حضور!''

اتنے طلباء کا داخلہ ہی کیوں لیا گیا کہ اساتذہ کے نظام الاوقات میں خلل آ گیا۔

''جی، یہ مسئلہ تو ہم لوگوں کے دائرہ کار سے باہر ہے۔مگر غالباً انتظامیہ نے فیصلہ شاید اس لیے لیا ہو کہ طلبہ کی زیادتی کی وجہ سے پیسے بھی تو زیادہ آجاتے ہیں۔''

''یعنی پیسوں کے لئے انسان اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق چھوڑ دے گا؟''

پروفیسر بیٹا خموش رہا، باپ سے بحث وتمحیص کی عادت تھی نہ جرأت ۔مگر بعد کے دنوں میں کسی ایک شام حاضرین جلسہ میں سے کسی نے مارواڑیوں کی خوئے تاجرانہ کے ذکر میں جب یہ بیان کیا کہ: ''ان کی دوکان پر بڑا جائے یا چھوٹا وہ تو یکساں طور پر ہر خریدار سے ایسا سلوک کرتے ہیں جیسے خریدار نہ آیا ہو نعوذ باللہ خدا آ گیا ہو۔'' تو مولانا کو بے ساختہ اپنا پروفیسر بیٹا یاد آ گیا جو انتظامیہ کی خواہش کے مطابق سائنس کی آمد وشد کا نظام قائم کرنے کی ابتدا کر چکا تھا۔

اس دن مولانا سبحان اللہ نے بعد نماز مغرب پھر دو رکعت نماز شکرانہ پڑھی اور بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوکر عرض گزار ہوئے کہ ''رب قدیر! تیرا ہزار ہزار احسان کہ تو نے اس کمزور بندے کو اپنی مرضی سے خدمتِ خلق میں مصروف رہنے کا موقع عطا کیا اور ہر قسم کی قید متناہی ولا متناہی سے بچائے رکھا۔''

مگر وہ زمانہ ہی کچھ عجب خلافِ توقع زمانہ تھا۔چیزیں، وقوعے اور افکار سب کچھ یوں اچانک بھک سے نیا رنگ وروپ اختیار کر لیتے تھے، واقع ہوجاتے تھے اور کاسئہ سر میں جگر مگر کرنے لگتے تھے کہ حیرت ہونے لگتی تھی کہ یہ کیسے ہو گیا۔ یہ کیسے سوچ لیا۔مولانا کو بھی حیرت ہوئی، سودا اپنی ہجویات اور بطور خاص حضرت ولی اللہ دہلوی کے بارے میں ان سے جو ہفوات سرزد ہوئیں، اس سبب سے وہ مولانا کے ناپسندیدہ شعراء میں تھے، اس پر بھی ایک صبح مولانا کو آپ ہی آپ سوداؔ یاد آ گئے:

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنستان سے عمل
تیغ ِ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل

''شاید یہ موسم کا اثر ہو'' مولانا نے سوچا۔گرمی پوری طرح آ چکی تھی۔لو کے جھکڑ مزاج

میں خشکی اور تکدر پیدا ہونے کا سبب بن رہے تھے اور تشنگی کا مداوا کسی طور نہیں ہو پا رہا تھا۔خزاں کی چاپ محسوس کرنے کے دوران ایک شام بعد نماز مغرب مسجد سے لوٹتے ہوئے مولانا نے دیکھا کہ ان کے پڑوسی مارواڑی نے جو دو کانیں نکالی تھیں، ان میں سے دو دو کانوں میں سامانِ فروختگی سج چکا تھا۔ایک دوکان ریڈیو کی تھی اور دوسری چوڑیوں کی۔تیسری دوکان جو خالی تھی اس میں مالک دوکان مارواڑی سینڈو گنجی پہنے دھوتی کو گھٹنوں سے اوپر اٹھائے بیٹھا تھا اور پنکھا جھل رہا تھا۔

یہ منظر شرفا کے محلے کے قریب؟'' مولانا نے دیکھا، سوچا اور آہستہ سے اپنے مکان کی طرف بڑھ گئے۔انہیں پھر سودا یاد آ گئے تھے:

تیغِ اردی نے کیا ملکِ خزاں مستاصل!

موسم بھی بدل چکا تھا اور حالات بھی تیزی سے بدلاؤ کی ڈھلان کی طرف آ رہے تھے۔پہلے مارواڑی کی دیکھا دیکھی مولانا کے بالکل بغل میں بسنے والے دوسرے ماواڑی نے بھی اپنے مکان میں تین دوکانیں نکال لیں، بیچ والے مارواڑی بندھو پیچھے کیوں رہتے، وہ بھی اپنے بھائیوں کی راہ چلے، بات یہیں تک آ کر رکی نہیں۔ان مارواڑی پڑوسیوں کے گھروں کے سامنے جو پرانے محلے دار تھے انہیں بھی ہوش آیا۔ ضرورت تو انہی کو زیادہ تھی۔ایک کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا، دوسرے بستر پکڑ چکے تھے اور تیسرے ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے۔تینوں کی اولاد خواب خرگوش میں گم رہی۔پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل۔جب سامنے کے پڑوسیوں کو صورتِ معاش پیدا کرتے دیکھا تو اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ مل گیا۔ایک نے اپنے چوڑے دروازے کے آدھے حصے میں دیوار اٹھا کر ایک دوکان نکال لی، دوسرے نے سڑک کی طرف بنے کمرے کی باہری دیوار ڈھا دی اور اس میں لوہے کا شٹر لگوا دیا، تیسرے سے کچھ بن نہ پڑا تو اس نے باپ کی بنائی باہری بیٹھک کو ہی دوکان بنا ڈالا۔

پھر ایک روز، ایک اور منظر مولانا کا دل ہل جانے کا سبب بنا۔مولانا مغرب کی نماز پڑھ کر لوٹے تو دیکھا کہ اہلیہ باہری حصے کی دیوار کے خلا میں ہاتھ ڈال کر سامنے کے مسلمان دوکان دار سے کوئی چیز خرید رہی ہیں۔

'الامان والحفیظ! مولانا کانپ سے گئے۔کانپتے قدموں بہت تیزی سے مسافت طے کرتے ہوئے بنگلے میں پہنچے اوراہلیہ کے ہاتھ پر دوہتھڑ ، مارا:''پاگل ہوگئی ہو؟تم سودا خرید رہی ہو؟''

اہلیہ پہلے تو گڑ بڑائیں پھر کچھ جھینپیں ، پھرآہستہ سے بولیں:''بچے نہیں تھے ، بلاقن بوا بھی اپنے گھر چلی گئی ہیں۔آپ کے ملاقاتیوں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا ، دیکھا چینی نہیں ہے ،وہ سامنے مظہر میاں نے دوکان کھولی ہے ،اپنے سامنے کے پیدا ہیں ۔ان سے تو آپ نے کبھی پردے کا حکم دیا بھی نہیں......اوروہ......میں نے مظہر میاں کے بیٹے کو ہاتھ بڑھا کر پیسہ دیا تھا۔''

''میں ازروئے شرع گفتگو نہیں کررہا ہوں ...... یہ طریقہ غلط ہے کہ گھر کی عورتیں سامان خریدیں۔''

آپ جن طریقوں کو غلط سمجھتے ہیں،وہ سب طریقے آہستہ آہستہ رائج ہوتے جارہے ہیں۔'' اہلیہ بہت آہستگی سے مگر مودبانہ کہتی ہوئی اندر چلی گئیں۔

مولانا کے وجود میں ایک بھیانک زلزلہ ہنکارنے اور پھنکارنے لگا۔انہوں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا۔پہلی خواہش یہ ہوئی کہ وہ جہاں ہیں وہیں بیٹھ جائیں مگر انہوں نے اس مقام کو دیکھا جہاں وہ کھڑے تھے اورخود پر نفریں کی ۔ دراصل وہ آنگن کے اس آخری حصے میں تھے جہاں ایک طرف بیت الخلاء اوردوسری طرف غسل خانہ تھا۔دوسری خواہش ہوئی کہ اوپر جا کر کچھ دیر لیٹ رہیں مگر یاد آیا کہ یہ وقت ملاقاتیوں کی آمد کا ہے ۔ چاروناچار وہ نپے تلے قدموں بنگلے میں موجود اس ہال میں آئے جس میں محفل جمتی تھی اوراپنی مخصوص کرسی پر جیسے ڈھ سے گئے ......چندلمحوں بعدانہوں نے محسوس کیا کہ اندر برپا خلفشار آہستہ آہستہ سکون میں تبدیل ہوتا جارہا ہے۔مگر طبیعت پر جو قبض طاری ہوا وہ 'کشاد' کی طرف مائل نہیں ہو پارہا تھا۔

آہستہ آہستہ لوگ آنے لگے،سبھی جانے پہچانے چہرے تھے اور مولانا سبحان اللہ کی کم سخنی کے عادی لہٰذا آج بھی مولانا کی خموشی سے کسی کو کوئی فکر لاحق نہیں ہوئی ۔مولانا خموشی سے سنتے رہے اور لوگوں کی گل افشانی جاری رہی ۔اسی دوران ان کے ایک رفیق دیرینہ پنشن یافتہ جسٹس مستجاب علی خاں داخل ہوئے۔مولانا نے ذرا تپاک سے خیر مقدم کرتے ہوئے دریافت کیا:

''خاں صاحب، کئی دنوں سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہوا، نصیبِ دشمناں سب خیریت تو ہے؟''

جسٹس صاحب ہنسے، کہنے لگے: ''اب جن حالات کا سامنا ہے، وہ تو خدا دشمنوں کو بھی نصیب نہ کرے۔''

''ایسا بھی کیا؟'' کئی پر استعجاب آنکھیں جسٹس صاحب پر بیک وقت مرکوز ہوئیں۔

''ارے بھائی، کیا بتاؤں۔ بغل والا مکان تو فضل الدین بھائی نے محمد اسلام سبزی فروش کے ہاتھ بیچ دیا اور خود پاکستان سدھارے، پہلے تو افسوس ہوا، مجھے خود زمین کی ضرورت تھی، بتاتے تو میں ہی لے لیتا، پھر بھی یہ سوچ کران کے لیے دعائے خیر لازمی جانی کہ بندۂ خدا نے مسلمان ہی کے ہاتھ تو بیچا مگر اب سمجھ میں آرہا ہے کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیسی ناانصافی کی۔ اسلام الدین اپنے گھر میں آلو پیاز کی آڑھت کھول کے بیٹھ گیا۔ گھر کا پڑوس بازار بن گیا، سوتو ہے ہی، مستزاد یہ کہ اس کے گھر سے سڑی پیاز اور آلو کے بھبھکے جینا محال کیے رہتے ہیں۔ مزید براں یہ کہ اس گھر میں مرد عورت بچے، سب کے سب جس زبان میں بات کرتے ہیں، میں نے تو ایسی غلیظ لفظیات واصطلاحات کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔''

اس کے بعد مجلس کا جو رنگ بدلا تو پھر سنبھالے نہ سنبھلا۔ گویا پنڈورا بکس پر پڑا ڈھکن ہٹ گیا تھا اور بلائیں پوری طاقت اور سرعت کے ساتھ مولانا پر حملہ آور ہورہی تھیں۔ سبھوں کی گفتگو کے موضوعات اور لہجے اس قدر تبدیل ہو چکے ہیں۔ مولانا کو اس کا اندازہ نہیں تھا۔ مجلس میں موجود ہر شخص پکا ہوا پھوڑا تھا جس میں جسٹس صاحب کی گفتگو نے نشتر چبھو دیا تھا۔ عزیز الرب کہنے لگے: ''بھئی، گفتگو کا انداز تو وہ سنبھالے جس کے پاس وراثت یا تربیت کا کچھ نمونہ موجود ہو، جیسی جڑ ویسی شاخیں، بس پر صلاح الدین بول اٹھے مگر اب تو وہ ہر چیز میں برابری کیا برتری کے کوشاں رہتے ہیں، مسجد کی امامت ہو، جلوس کی قیادت ہو یا اسٹیج کی نظامت، ہر جگہ قبضہ کرتے ہیں اور سازش کے ذریعہ قبضہ کرتے ہیں''۔ صلاح الدین کی اس بات پر مولانا قمر الدین مسکرائے، کہنے لگے: ''ان کی سازش ہماری حماقت کی وجہ سے کامیاب ہوتی ہے۔ ہم کو بھی تو مسجد مدرسہ

اور خانقاہ کی تعمیر اور تعمیر نو کا شوق چرا گیا ہے تو اب پیسہ کہاں سے آئے گا ؟ اس مسئلے کا حل تو انہیں کے پاس ہے اور ہمیں اس کی پرواہ تو ہے نہیں کہ مسجد و مدرسہ میں حلال پیسہ استعمال ہو رہا ہے یا حرام ہمیں تو بس پیسہ چاہئے اور پیسہ انہی کے پاس ہے ۔ وہ پیسہ دیتے ہیں اور پیسے کے زور پر مسجد و مدرسہ کے ممبر بنتے ہیں اور خانقاہوں میں آگے کی جگہ پاتے ہیں ۔ جب مسجد و مدرسہ کی کمیٹی میں ان کے ممبر زیادہ ہو گئے تو پھر صدارت و قیادت سے انہیں کون روک سکتا ہے؟''

مولانا قمر الدین کی اس بات کو وکیل شرافت حسین نے کاٹا، کہنے لگے:

''آپ Cast consideration پر اتنا خفا ہو رہے ہیں لیکن خود آپ لوگ جس قسم کے شدید مسلکی تعصب کا شکار ہو چکے ہیں، کبھی اس پر غور کیا؟ جہاں دیوبندی کا غلبہ ہے وہاں بریلوی بے چارہ پر نہیں مار سکتا، شیعوں کے مدرسوں میں سنی کا اور سنیوں کے مدرسوں میں شیعوں کا گزر نہیں، اب تو خانقاہی بھی گروہ بندی کے لیے چھٹپٹاتے نظر آتے ہیں، جب کہ صوفی اور مولوی کا بنیادی فرق یہی ہے کہ مولوی اپنے مسلک کے علاوہ کسی دوسرے مسلک والے کو برداشت نہیں کر پاتا، اس کے برعکس صوفی کا یہ اختصاص رہا ہے کہ اس کے سب اپنے ہوتے ہیں مگر آج تو صوفی بھی مولوی کے پروپیگنڈہ رینج میں آ گیا ہے اور ذوی القربیٰ کے حقوق کے حیلہ شرعی کو اپنی گروہ بندی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

مجلس پوری طرح گرم ہو چکی تھی اور ہر آدمی کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بیتاب ہو رہا تھا مولانا سبحان اللہ نے توجہ مرکوز کرنی چاہی تو جملے ٹوٹ ٹوٹ کر اور ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو کر ان تک پہنچنے لگے۔

مولوی سے تو اللہ بچائے ......بچنے کا راستہ کہاں ہے، انہوں نے تو مسجد مدرسہ اور خانقاہ کے سہارے خود کو عوام پر مسلط کر دیا ہے ......ان کا بھی کیا قصور ......عوام بھی کم راندۂ درگاہ نہیں ہیں......چاروں طرف بے ایمانوں اور ظالموں کا راج ہے ...... ہمیشہ یہی ہوا ہے، طاقت ور سے تو سب ڈرتے ہیں......جس کی لاٹھی اس کی بھینس......

مولانا سبحان اللہ اپنے ہی گھر میں اپنی سجائی محفل کا انجانا پن گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے

اوران کا بس نہیں چل رہا تھا کہ محفل برخاست کردیں ۔انہیں شدید طور پر ایک احساس بار بار ہورہا تھا ......یہ شریفوں کی محفل ہے یا مچھلی بازار ......پھراٹھیں کسی دوست کا جملہ یادآیا......شورشرابے میں ڈوبی اس محفل کوتماشائے جمہوریت قراردیں یا مچھلی بازار کی تبدیلی مقام تصورکریں۔

مولانا خودکوسنبھالنے کی بہت کوشش کررہے تھےمگراپنے دوران سرکوشدید تکلیف کےساتھ محسوس بھی کررہے تھے۔گردش میں کائنات ہے......کائنات ہے......کائنا......''

اچانک محفل میں شوراٹھا......مولانا بے ہوش ہوگئے!''

اس دن کے بعد مولانا سبحان اللہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکے، پہلے تو ڈپریشن اوراختلاج قلب نے آگھیرا،حسب دستورانہوں نے طب یونانی کا سہارالیا،خمیرہ مروارید گاؤزباں جواہر والا،خمیرہ ابریشم حکیم ارشدوالا،خمیرہ ابریشم سادہ...... ہرممکن طور پران کی کوشش رہی کہ انگریزی دواؤں سے بچاجائے ۔اس دن ملنے والوں کا تانتا بندھا رہا،آنے والوں میں علماء اورزہاد بھی تشریف لاتے رہے،ان میں سے کسی نے قرآن کی ایک آیت کی ورد کی صلاح دی ۔مولانا جھلا گئے :''آپ آیاتِ قرآنی کوبھی جنسِ بازار بنارہے ہیں۔افادۂ مادی کے لیے کیا کوئی اورذریعہ نہیں ہے؟'' کہنے والے بزرگ چپ ہورہے۔آخرتو مولانا بیمار تھے۔

مولانا بیمار ہوئے تو پھر بستر سے نہ اٹھ سکے ۔بیماری کا پہلاحملہ تو دورانِ سر کی صورت میں ہوامگراس کے بعداختلاجِ قلب نے گویا مولانا کا گھر دیکھ لیا۔مولانا حتی الامکان خودکواطمینان دلاتے کہ''اے بندۂ کفور! تجھ کوکس بات کی کمی ہے،**الحمدللہ** معاش کا کوئی مسئلہ نہیں ہے،آج بھی کھاپی کرفقراومساکین کے لیے کچھ نہ کچھ بچ ہی جاتا ہے، تیری اولاد اطاعت شعار ثابت ہوئی اورتیری بیوی وفا شعار،خلق خدا میں تیری عزت بنی رہی اورنزدخدا تیرا توشہ ایمانداری ،خلوص ،تقویٰ اورصدق کا ہے۔پھرتو کیوں خلجان میں مبتلا ہے؟''

مگرمولانا اپنے اس دلِ ناصبور کا کیا کرتے جوصبار کی مخلوق ہوکربھی صابرنہیں ہو پارہا تھا۔بات یہیں تک رکی نہیں رہی ۔اطبانے اختلاج قلب کا اصل سبب دوران خون بتایا اوراس

مرض ناہنجار کے سبب جس اصل مرض کی بابت اطبا مشوش تھے بالآخر وہ تشویش صحیح ثابت ہوئی۔

مولانا پر فالج کا حملہ ہو ہی گیا۔

مولانا سبحان اللہ حیات ہیں ،علاج چل رہا ہے ۔اطبا کا کہنا ہے کہ دماغ پر بھی فالج کا اثر ہے۔ایک طبیب نے تو یہ بھی کہا کہ زمانۂ طفلی ہی میں کبھی کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہوگا جس کے سبب دماغ کا کوئی حصہ کسی نہ کسی سطح پر اسی زمانے میں متاثر ہو چکا ہوگا۔اس رائے پر سب کا اتفاق نہیں ہے مگر اس خیال پر سب متفق ہیں کہ اگر علاج اور خدمت کے طفیل ہاتھ پیر میں حرکت شروع بھی ہوگئی تب بھی دماغ صحیح طور پر اب کام نہیں کر سکے گا۔

ورثا مولانا کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر نتیجہ کچھ بہت امید افزا نہیں ہے۔ مولانا زندہ ہیں،سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں،اپنے جانتے کچھ بولتے بھی ہیں مگر ان کی بولی اب کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔

گلی میں دوکانوں پر دوکانیں بنتی جا رہی ہیں۔صرف مولانا سبحان اللہ کا ذاتی خطہ زمین و مکان اس نئی صورتِ حال کا ابھی حامل نہیں ہوا ہے۔حالاں کہ مولانا کے ایک بیٹے نے باقی بھائیوں کے سامنے ایک دن یہ تجویز رکھی بھی تھی مگر بڑے بھائی نے بس اتنا کہہ کر وہ گفتگو ختم کر دی کہ ''ابا حضور کی زندگی تک تم لوگ اس قسم کی باتیں نہ کرو''......!

☆☆☆

انحد

وہ گھر ندی کے کنارے تھا۔ سردیوں میں بھور کے وقت چھائی دھند میں اور جھٹپٹے کے سمئے ہوتی بارشوں میں نئے آدمی کے لئے ندی اور گھر کے بیچ کا فاصلہ دھیان میں رکھنا مشکل ہو جاتا تھا۔

میں بچپن میں ایک دو مرتبہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اس گاؤں میں گیا تھا، وہ زمانہ اس گھر والوں کی ریاست کا زمانہ تھا۔ باضابطہ ان لوگوں کی کچہری لگتی تھی۔ وقت ان لوگوں کی آنکھوں کے اشارے پر اپنی رفتار کا تعین کرتا تھا اور انگلیوں کے اشارے گاؤں والوں کی سمت کا تعین کیا کرتے تھے۔

مگر جو منظر میری زندگی میں جگنوؤں کی طرح بار بار جھلملاتا رہتا ہے اس کا تعلق ان دنوں سے نہیں ہے۔

یہ بہت بعد کی بات ہے، غالباً میں بی۔اے۔ کے آخری سال میں تھا۔ گھر میں کچھ چرچا چلا تھا کہ مظفر بھائی کی شادی ہے، میرے پوچھنے پر ابا نے بتایا تھا کہ میرے دادا اور مظفر بھائی کی دادی اپنے بھائی بہن تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ رشتہ قریب کا ہے مگر تعلقات ذرا رسمی ہیں۔

''شادی میں ہم لوگوں کو شرکت کرنی چاہئے۔ رشتہ کوئی بہت دور کا تو نہیں ہے۔'' ابا نے میری بات کی ہامی بھری تھی اور شادی میں گئے بھی تھے۔

پھر آٹھ دس ماہ گزر گئے، میرا بی۔اے کا امتحان غالباً ختم ہو چکا تھا۔ مظفر بھائی اپنی دولہن کے ساتھ میرے گھر آئے۔ مجھے ذرا حیرت ہوئی۔ مظفر بھائی اس وقت کم از کم بتیس تینتیس کے ضرور ہوں گے۔ بھابھی بیس سے زیادہ کی نہیں لگ رہی تھیں۔

پہلا دن چپ چپ گزرا، کچھ تو نئی دولہن کو دیکھنے کے لئے ارد گرد کی عورتوں کے آنے کا سلسلہ رہا کچھ اتوار ہونے کی وجہ سے ابا کی گھر میں موجودگی اور ابا کی موجودگی کی وجہ سے مظفر بھائی کا گھر ہی پر رہنا اور ان دونوں کی وجہ سے میرا انہی دونوں کے پاس زیادہ وقت گزارنا اور پھر کچھ بھابھی سے پہلی ملاقات کے سبب......''

قصہ مختصر یہ کہ پہلا دن چپ چپ گزرا۔

دوسرے دن ابا آفس گئے، بھائی کچھ سیر سپاٹے کو نکلے، بہنیں اسکول گئیں، اماں نے باورچی خانے کی طرف جھانکا اور میں آہستہ سے بھابھی کی طرف سرک گیا۔

''آپ عورتوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں''۔ کچھ تھوڑی بہت رسمی گفتگو کے بعد بھابھی نے سیدھا حملہ کر دیا۔

''ارے ارے۔ آپ خواہ مخواہ مجھے غصہ کیوں دلا رہی ہیں؟'' میں نے ذرا بناوٹی غصے کے ساتھ کہا تو وہ ہنس پڑیں۔

''بالکل ڈرتے ہیں آپ میرے پاس اس کا ثبوت ہے۔''

''کیا ہے؟ کیا ہے؟ بتایئے تو بھلا کیا ہے؟''

اس گھر میں داخل ہوئے مجھے چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہو چکے اور آپ چوبیس گھنٹوں کے بعد میرے پاس آنے کی ہمت جٹا سکے۔''

''آپ بھی کیا چُن کے ثبوت لائی ہیں؟ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔'' ارے وہ تو کل ابا اور بھیا گھر ہی پر رہے کیا کرتا کچھ تو ان کی تابعداری میں وقت گزر گیا، کچھ یہ سوچ کر نہیں آیا کہ بزرگوں کی موجودگی میں نئی نئی بھابھی سے کیا بات کی جا سکتی ہے؟

''دیور جی۔ بھیا کی تابعداری میں کوئی مزہ نہیں ہے۔ بھابھی کے تابعدار ہو جایئے۔''

''سرکار۔ یہ بندہ بے دام خط غلامی لکھنے کو تیار ہے۔''

''یبّات (یہ بات) ہوئی نا؟''

بھابھی قہقہہ ما کر ہنسیں تو میں چونک گیا...... ایسا جھنکار بھرا قہقہہ میں نے اس سے پہلے نہیں سنا تھا معلوم ہوتا کہ ہنسی ندی کی لہر کی طرح بہتی ہوئی چلی جارہی ہے......ترل ترل...... پھر وہ ہنسی اپنے اختتام پر ایسے دھیمے آہنگ کے ساتھ نشیب میں اترتی کہ لگتا ندی کی رفتار اب دھیمی ہورہی ہے......ترل......ترل......ترل ل ل!

بھابھی میرے گھر سے چوتھے دن واپس اپنی سسرال گئیں ان تین چار دنوں میں میں ان سے بہت بے تکلف ہوگیا اصل میں میرا ایک مسئلہ یہ ہے کہ سب بھائی بہن مجھ سے چھوٹے ہیں اس لئے رشتے کا بڑا بھائی بھی مجھے اپنا بڑا بھائی محسوس ہوتا ہے اور مظفر بھیا تو قریبی رشتہ دار تھے ہی ،سوہم دیور بھابھی نے جی بھر کے گپ کی ، جی بھر کے مذاق کیا، ایک دوسرے کو تنگ کیا یہاں تک کہ میں نے ان پر رنگ بھی ڈال دیا۔

پھر بھیا بھابھی چلے گئے۔

بھابھی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ ریزلٹ نکلنے کے بعد مٹھائی کھانے ان کے پاس ضرور آؤں گا۔

جب وہ چلی گئیں تو مجھے لگا کہ گھر کی ساری رونق وہ اپنے ساتھ لیتی گئیں۔ ان چار دنوں میں وہ گھر کی پوری فضا میں رچ بس گئی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر کا ہر حصہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دیوار پر سے کلنڈر اتار دیا گیا ہو میں ان کے جانے کے بعد کئی دن گھر سے ایڈجسٹ نہیں کر پایا۔ اسی بیچ پھوپھو اماں گھر آئیں۔ اماں سے بات کر رہی تھیں، میں اپنے کمرے میں تھا ۔دونوں میں سے کسی کی آواز آئی۔ ''مظفر کی بٹیا (دولہن) کتنی خوب صورت ہے۔'' اس پر دونوں میں سے کسی نے تبصرہ کیا: ''مگر مظفر کی اماں جب اپنی ساس سے نباہ نہ کرسکیں تو پتوہ کو کیا خاطر میں لائیں گی۔'' میرے لئے پہلا جملہ خاصا تھرلنگ تھا، اچانک مجھے احساس ہوا کہ بھابھی واقعی خوبصورت ہیں لمبے گھنے کمر کو چھوتے ہوئے بالکل سیاہ بال، بڑی بوجھل بوجھل نشے سے جھکی جھکی محسوس ہوتی آنکھیں ستواں ناک، ہونٹ میر کا شعر رنگ جیسے میدے کی لوئی میں کوئی ہلکا گلابی رنگ ملا دے، گردن صراحی دار، انگلیاں مخروطی، جسم سرتا پا متناسب...... مجھے یہ سوچ کر بہت اچھا لگا کہ اتنی خوبصورت عورت میری بھابھی ہے۔

پھر بات آئی گئی ہوگئی ۔ویسے شروع میں کئی بار جی چاہا کہ مظفر بھیا کے گھر جایا جائے مگر بھابھی نے تو ریزلٹ کے بعد آنے کا وعدہ لیا تھا پس میں چاہ کر بھی نہ جا پایا ۔ ریزلٹ نکلنے میں تقریباً دو ماہ لگ گئے اور ریزلٹ نکلنے کے بعد فوراً ہی ایم ۔اے میں داخلہ لینے کے لئے پٹنہ دوڑنا پڑا۔ پھر داخلہ، ہوسٹل ، نیاماحول ،نئی دلچسپیاں ......کچھ ایسا چکر چلا کہ میں تقریباً چار پانچ ماہ بعد گھر لوٹا تو بہن نے بھابھی کا خط دکھایا۔خط تو بہن ہی کے نام تھا مگر آخر میں صرف اتنا لکھا ہوا تھا:

''دیور جی کو میری طرف سے یہ شعر سنا دینا کہ ۔

ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا ''

مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی پھر اپنے آپ پر غصہ آیا، پھر نہ جانے کیوں آئینہ دیکھنے کو جی چاہا، پھر کئی دنوں تک یہی شعر گنگناتا رہا اور بالآخر میں مظفر بھیا کے گاؤں کے لئے روانہ ہو ہی گیا۔ راستے میں مجھے یاد آیا کہ بھابھی سے ملاقات کو تقریباً چھ ماہ ہو گئے۔

جاتی برسات کا موسم تھا ،ہوا میں اب خنکی آنے لگی تھی اور بادلوں کے پرے کے پرے دور تک آتے اور جاتے دکھائی دے رہے تھے ۔ میں جب مظفر بھیا کے گاؤں معصوم آباد پہنچا تو ندی اپنے پورے ابھار پر تھی ۔اس گھاٹ سے اس گھاٹ تک پورا پاٹ جل تھل ہو رہا تھا۔شام کے پانچ بج رہے تھے ۔جو تھوڑا بہت بچا کھچا سورج تھا اسے بھی بادلوں نے ڈھک رکھا تھا ۔منظر سارے کا سارا دھند میں کھویا ہوا تھا ...... میں نے بس سے اتر کر دیکھا: ندی کنارے گھاٹ پر کشتیاں کھڑی تھیں ۔ لوہے کے کھگڑوں (لنگر) سے انہیں گھاٹ کے کسی سرے سے باندھ دیا گیا تھا مگر ابال پر آئی ندی کے تھپیڑے کشتیوں کو چین نہیں لینے دے رہے تھے اور کشتیاں کسی آسیب زدہ کی طرح آگے پیچھے دائیں بائیں جھول بھی رہی تھیں اور شاید جھوم بھی رہی تھیں ۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ جھگڑ (لنگر) توڑ کر بدمست ندی سے ملن کی موہ مایا میں لت پت ہو رہی ہیں ۔ کشتی مجھے ایک ایسا پاگل محسوس ہوئی جس کے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئی ہوں اور پاگل پابہ زنجیر ہونے کے باوجود ناچنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں مظفر بھیا کے گھر میں داخل ہوا تو اندھیرا میرے پیچھے ہی دروازے پر کھڑا نظر آیا۔

شام کی دھند میں کھویا نیچے پاٹے (چھت) والا کچی دیواروں پہ قائم کھپریل کا ایک چھوٹا گھر ، سامنے آنگن ،آنگن کے بعد دالان،دالان سے لگے لگے تین کمرے ، ایک طرف چھوٹا سا بغیر دروازے کا باورچی خانہ، گھر میں چپ کی اندھی چڑیا اپنے پنکھ پھیلائے چاروں اور پسری پڑی تھی ۔دالان کے ایک کونے میں ایک پنجرہ ٹنگا ہوا تھا جس میں ایک طوطا سر نہوڑائے جانے کس دھیان میں گم تھا۔اسی سے ذرا ہٹ کر کھپریل کی اولتی کے سائے میں رکھا ایک ڈربہ ......''مرغیاں ہوں گی ۔'' میں نے سوچا پھر نگاہ سامنے بیٹھی خاتون پر ٹک گئی ......مظفر بھیا کی اماں (میری پھوپھی) دالان میں چوکی پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھیں اوران کا منہ پان کی سرخی سے لال ہورہا تھا ۔ میں نے انہیں بہت دنوں بعد دیکھا تھا۔ اس وقت کی کوئی خاص شبیہ ذہن میں محفوظ نہیں تھی مگراس لمحے میں ان کو دیکھنے کے بعد پہلا خیال ذہن میں آیا......زمیندار......پھر دوسرا لفظ بجلی کے کوندے کی طرح لپکا......کڑک خاں......ذہن نے ایک چھلانگ اور لگائی اور ایک جملہ پھر جگمگایا......مردان خاں...... مجھے ہنسی آگئی......میں بلاوجہ ایک سیدانی کو پٹھانی بنائے جارہا تھا۔

''کون ہو بابو؟ کس کو کھوج رہے ہو؟''

''جی میں......'' مجھے لگا میرے حلق میں کچھ اٹک گیا ہے......میں......میرا نام سبطین رضا ہے۔''

''ارے سبطے ہو جی ؟'' اچانک کسی طرف سے آواز آئی اور پھر ایک سمت سے ایک عورت بےتحاشہ چھلانگیں لگاتی میری طرف دوڑی۔

وہ عورت کئی دنوں کی پہنی ساری پہنے ہوئے تھی ،چہرہ دھوپ کی تمازت سے تمتمایا ہوا......رنگ بھی بہت مدھم ...... ہاتھ، ناک، کان میں کچھ بھی نہیں تھا،سیدھا آنچل اوڑھے ایک پورم پور دیہاتی عورت ......وہ عورت نزدیک آئی تو میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں......وہ تو میری بھابھی تھیں......میری چاند جیسی خوبصورت بھابھی!

کیسے بے وَ...... بے ایمان ہو!'' انہوں نے اچانک ہی جملہ بھی بدل دیا اور مجھ سے بالکل لپٹ پڑنے والی کیفیت کے حصار سے جیسے باہر نکل کر تھم سی گئیں۔شیر پر شکاری ٹارچ کا پورا فوکس ڈالنے سے شیر جہاں کا تہاں کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے۔ پھوپھو مجھے نہیں بھابھی کو دیکھ رہی تھیں۔

پل کا شاید وہ ہزارواں حصہ رہا ہوگا مگر میں نے پل کے اس چھوٹے سے ننھے سے ٹکڑے کو جی کڑا کر کے ننگی آنکھوں سے سارا کا سارا دیکھا تھا۔آنکھوں پر عذاب کی طرح اترتا وہ پل میرے لئے بارہ بجے دوپہر کے آگ برساتے سورج کی طرح پورے کا پورا چبھتا اندر اندر کاٹتا مجھے محسوس ہوتا ہوا ایک کڑوا کسیلا احساس اور نظارہ تھا...... بھابھی میرے بالکل پاس پہنچنے والی ہی تھیں بلکہ ان کی ساری کا آنچل میرے شرٹ کو چھو بھی چکا تھا کہ یک بارگی انہوں نے بغیر گردن موڑے کن انکھیوں سے اپنی ساس کو دیکھا......وہ بالکل خموش تھیں مگر ان کی آنکھ......شیر کے بارے میں سنا تھا کہ وہ شکار پر جھپٹنے سے پہلے اس پر اپنی آنکھ کا فوکس مرتکز کرتا ہے۔

''کیسے بے ایمان ہو! بھیا سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ ریزلٹ نکلتے ہی آؤں گا۔'' بھابھی میرے ہاتھ سے میری اٹیچی لیتی ہوئی بولیں۔''تمہارے بھیا نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔'' اب وہ دروازے سے آنگن میں آ چکی تھیں۔پھوپھوابھی تک چپ تھیں اور مجھے دیکھے جارہی تھیں۔مجھے حیرت ہوئی۔وعدہ میں نے ان سے کیا اور یہ فراٹے سے بھیا کا حوالہ دیئے جارہی تھیں۔

''سبطین ہیں۔عبدالرزاق چچا کے بیٹا۔'' وہ پھوپھو کی طرف مخاطب ہوئیں۔ پھوپھو کے چہرے کا تناؤ کچھ کم ہوا۔

''آؤ آؤ بیٹھو! ابا اماں کیسے ہیں جی؟'' پھوپھو نے دالان میں بچھی چوکی کا ایک حصہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جی اچھے ہیں آپ کو سلام کہا ہے۔''

''ہاں بس ایسے ہی وہ سلام بھجواتے رہیں میں سلام لیتے لیتے ایک دن مر جاؤں گی۔کبھی ان کا آنے کو جی نہیں چاہتا۔''

میں چپ رہا کیا کہہ سکتا تھا ،ویسے میں ابا اور پھوپھو کے تعلقات استوار کرنے تو آیا نہیں تھا۔ میں تو بھابھی کے لیے آیا تھا،سو ناشتہ کرنے تک تو کسی طرح میں پھوپھو اور بھابھی کے بیچ پنڈولم بنا رہا مگر ناشتہ ختم ہوتے ہوتے قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی گاؤں کی کچھ عورتیں آ گئی تھیں اور پھوپھو ان سے محو گفتگو ہوگئی تھیں۔میں نے موقع غنیمت جانا آہستہ سے ایک مچیا (رسی سے بنا چھوٹے پایوں والا مونڈھا) اٹھا کر بھابھی کے پاس باورچی خانے میں آ گیا۔

''ہائے توبہ ایسے کیوں بیٹھ رہے ہو؟'' وہ ہڑ بڑا کر شاید کرسی لانے کے لئے اٹھیں۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔آپ بیٹھئے۔'' میں نے بے سوچے سمجھے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں بٹھانا چاہا۔

وہ ایک دم ٹھٹھک کر کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔وہ میرے بالکل پاس کھڑی تھیں۔ان کی جانگھ کا حصہ میرے بازو سے مس کر رہا تھا ان کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا،ان کا دوسرا ہاتھ میرے گال سے ٹکرایا بھی تھا۔میں نے ان کی طرف دیکھا۔وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھیں بعد میں جب جب میں نے ان کی آنکھوں کے بارے میں سوچا تو ابال پر آئی ندی یاد آئی۔پھر پتہ نہیں میں نے ان کا ہاتھ چھوڑ دیا یا انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔وہ آہستہ سے چولہے کے پاس پڑے پیڑھے پر بیٹھ گئیں۔لکڑیوں سے جلی آگ کی لو تیز ہوگئی تھی۔شعلوں کی لالی ان کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ان کا چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ چولہے میں پڑی لکڑیوں سے اٹھتے شعلوں کی لو مدہم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''ان لکڑیوں کے پیچھے کیوں پڑی ہیں۔انہیں چھوڑ دیجئے'' میں نے بے ارادہ ایک بات کہی۔

''شعلوں کی تپش برداشت نہیں ہوتی۔''

''انہیں زبردستی بجھایئے گا تو بہت دھواں اٹھے گا۔''

''اٹھنے دو۔''

''ان کی آنکھ میں بھی تو لگے گا۔'' میں نے پھوپھو کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

''لگنے دو۔'' وہ میرا اشارہ سمجھ گئیں۔''کسی بھی طرح ان کی آنکھ نم تو ہو۔'' بڑی خوبصورت سی ہنسی ان کے چہرے پر بکھر گئی۔

''آپ برداشت کر پایئے گا؟''

''اب تو عادی ہوگئی ہوں۔ایک برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا۔''

''آپ بھیا سے کیوں نہیں کہتیں؟''

''سبطے جی'' ۔انہوں نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔'' آپ کے گھر سے لوٹ کر وہ یہاں آئے اوراس کے بعد گئے تو پھراب تک نہ لوٹے ہیں۔''

اس جملے پر ہم دونوں کے بیچ چپ کا مہاساگر آن پڑااور بیچ میں چولہے کا دھواں بھی۔ دھند گہری ہوگئی تھی اور وہ صاف صاف نظر نہیں آپارہی تھیں۔

چاروں طرف دھواں دھار بارش شروع ہوگئی تھی، تیز ہوائیں بارش کی پھوار کو چاروں طرف اڑائے لئے پھرتی تھیں اور ندی میں پانی کے تیز ریلے کی آواز ندی کے جوش کا احساس دلا رہی تھی ۔ بھابھی آنکھ صاف کررہی تھیں...... ''دھواں پھوپھو سے پہلے تو انہی کو پریشان کررہا ہے۔'' میرے جی میں اک بات آئی پھر ہم دونوں ہی پھوپھو کی آواز کی طرف متوجہ ہوگئے ۔وہ اپنے کمرے میں موجود عورتوں سے بات کررہی تھیں: ''تم لوگوں کو پتوہ رکھنے کا فن نہیں آتا۔ میں نے تو لطیف کی ماں تم کو شروع میں سمجھایا تھا۔ پاؤں کی جوتی کو پاؤں میں رہنا چاہئے۔تم سے تمہاری اولاد نہ سنبھلی تو دوسرے کی اولاد کیا سنبھلے گی، مجھے دیکھو۔مجال ہے مظفر میاں کی' میرے سامنے وہ اونچی آواز میں بات کرلیں۔زبان نہ کھینچ لوں ان کی......''

''باپ رے۔ یہ تو بالکل مارتے خاں بے دھڑک رستم پوری ہیں۔'' میں نے سرگوشیوں میں کہا۔

''قصائی ہیں قصائی۔'' وہ اور آہستہ سے بولیں۔

''ان کے ساتھ کچھ زیادہ محبت کا حربہ استعمال کرنا ہوگا۔''

''ہر بیٹا ماں سے محبت کرتا ہے نا؟'' انہوں نے عجب سا سوال کیا۔

''ہاں۔ بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔''

''یہ بیٹے کو بھی نہیں بخشتیں ۔تین رات ایسی بھی آئی کہ انہوں نے تمہارے بھیا کو میرے پاس آنے نہیں دیا۔''

میں بس ایک ٹک بھابھی کو سنتا رہا۔ میرا دماغ کام نہیں کر پارہا تھا۔کوئی عورت اتنی بھی ظالم ہوسکتی ہے؟ عام طور پر عورت کے بارے میں تو یہی تصور بنا رہتا ہے کہ وہ خوب صورتی ،نرمی اور محبت کی علامت ہے مگر یہاں تو......''

اب بارش کے ساتھ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بھی شروع ہوگئی تھی۔فضا ساری کی ساری عجب بھیانک اور ڈرامائی محسوس ہورہی تھی۔

پھروہ پل گزر گیا۔عورتیں بارش کم ہونے پر اپنے گھروں کو چلی گئیں۔دیہات میں تو رات بہت پہلے شروع ہوجاتی ہے۔آٹھ بجتے بجتے کھانے سے فراغت ہوگئی۔میں نے ایک بات شدت سے محسوس کی۔میں پانچ ساڑھے پانچ کے قریب پہنچا تھا اور اب نو بج رہے تھے۔ان ساڑھے تین چار گھنٹوں میں پھوپھو نے خود سے اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا تھا، وہ صرف حکم صادر کرتی تھیں اور بھابھی اس کی تعمیل کے جتن میں پھرکی کی طرح سارے گھر میں دوڑتی پھرتی تھیں اور سارا گھر سنبھالے ہوئے تھیں۔

''سبطے کا بستر اوپر لگ گیا؟'' پوچھنے کا انداز ایسا تھا جو صاف بتا رہا تھا کہ اب مجھے اوپر چلے جانا چاہیے۔

''جی ہاں۔'' بھابھی نے آہستہ سے مختصر سا جواب دیا۔

''اب آپ لوگ بھی آرام کیجئے میں بھی سونے چلا۔'' اوپر چلے آنے کے علاوہ چارہ کار کیا تھا؟

میں اوپر چلا آیا بستر پر لیٹ بھی گیا،مگر نیند بھلا کیسے آتی ،میں تو بارہ سے پہلے سونے کا عادی نہیں تھا ،کروٹ بدلتا رہا سونے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور نیند کے بجائے وقت مجھ پر حملہ کرتا رہا...... رات کا سمئے ،نزدیک و دور سے کبھی تیز کبھی مدھم بارش کی آواز،گھر کے آس پاس بنسواڑی میں لگے بانس کے درختوں کی سرسراہٹ ، اور پھر بارش اور درختوں کی آواز میں ملا جلا ندی کا جل ترنگ۔میں نے اٹھ کر پچھّم کی طرف بنی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھا......چاروں طرف بارش......دور دور تک بارش......اچانک ایک عجیب سا احساس ہوا۔اسی چھت کے نیچے وہ سوئی ہیں......میں نے گھڑی دیکھی ،دس بج چکے تھے......''اب سونا چاہیے......''میں نے سوچا مگر مجھے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔تو میں کیا کرتا۔اب یہ تو یاد نہیں کہ ضرورت تھی یا نہیں لیکن میں باتھ روم جانے کے لئے نیچے اترا...... باتھ روم سے باہر نکلا تو بے ساختہ بھابھی والے کمرے کی طرف نگاہ

اٹھ گئی ......وہ سامنے دروازے پر کھڑی تھیں......میں ایک منٹ کے لئے ٹھٹھک گیا......میرے ان کے بیچ پانی کی پھوار تھی ...... کنارے اولتی میں لگے ہک میں ٹنگی مدہم لالٹین چاروں طرف عجب بھیدوں بھری روشنی پھیلا رہی تھی...... پانی کی پھوار کے بیچ بیچ سے لرزتی کانپتی روشنی بھابھی کے چہرے پر پڑ رہی تھی......ان کا چہرہ عجب عجب سے رنگوں میں شرابور نظر آیا مگر ایک رنگ میں بھی نمی کا نام ونشان نہیں تھا ...... میں نے دور سے دیکھا: وہ مجھے دیکھ رہی تھیں اوران کے ہونٹ بالکل خشک تھے ...... مجھے اس بالٹی کی کگار پر بیٹھی بالٹی کی تہہ کو حسرت سے تکتی چڑیا یاد آئی جس کی تہہ میں پانی جھل جھل جھلکتا تھا۔

میں اچانک میں نہیں رہا، پتہ نہیں اب وہاں پر کون تھا جو سب کچھ بھول گیا۔میں یکا یک بیچ آنگن سے پانی میں بھیگتا ہوا ان تک پہنچ گیا۔ان کی آنکھوں میں انتظار کے مہاساگر امڈ رہے تھے ......میں نے بغیر سوچے سمجھے پاس پہنچ کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا وہ کچھ نہ بولیں۔میں کچھ دیر یونہی کھڑا رہا ،وہ بھی میرے ہاتھ میں ہاتھ دیئے چپ کھڑی تھیں۔پھر میں ان کے قریب ہو گیا۔اب میں ان کی سانسوں کے زیرو بم کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا۔

''اوپر آیئے۔'' میری آواز انتہائی سرگوشیوں میں ابھری اور میں ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

وہ بے خود اور بے اختیار سی میرے ساتھ آگے بڑھنے لگیں ......کچھ قدم میرے ساتھ چلیں......پھر رک گئیں۔

''کیا ہوا؟'' میں نے اتنی ہی آہستگی سے پوچھا۔

وہ چپ رہیں۔کچھ نہیں بولیں۔ہم دونوں بیچ آنگن میں کھڑے تھے۔ بارش کی پھوار ہمیں شرابور تو نہیں کر رہی تھی لیکن ہم بھیگ ضرور رہے تھے اور سارے میں گہری اندھیری رات بکھری پڑی تھی اور پر جوش ندی دکھائی تو نہیں دے رہی تھی مگر کانوں تک پہنچنے والا لہروں کا زیرو بم اس کے سرجوش کا احساس ضرور دلا رہا تھا......وہ چپ کھڑی تھیں، میں انہیں دیکھ رہا تھا...... یک بارگی انہوں نے دوسرے ہاتھ سے میرا گال چھوا اور بہت آہستگی سے بولیں ......''جاؤ سو رہو''

اور اتنی ہی آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے الگ کرلیا اور دھیرے سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

بارش نے آنگن کی زمین اتنی چکنی کردی تھی کہ ان کا ہر قدم مشکل سے اٹھ رہا تھا۔ مجھے لگا وہ آگے نہیں بڑھ پا رہی ہیں مگر بہر حال وہ لوٹ رہی تھیں...... کسی نہ کسی طرح وہ کمرے تک پہنچ گئیں۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ پلٹیں میری طرف دیکھا اور آہستہ سے مسکرائیں۔ بارش کے قطرے ان کی آنکھوں سے بڑھ کے ان کے گالوں کو چھو رہے تھے۔ وہ مسکرائے جا رہی تھیں اور مجھے اوپر جانے کا اشارہ کر رہی تھیں اور بارش کے قطرے ان کی آنکھوں سے گالوں کی طرف ڈھلکے چلے آ رہے تھے۔

میں اوپر چلا آیا......

مگر اس کے بعد میں سو نہ سکا......

عجب قسم کی بے چینی، یقیناً اس میں شرمندگی کا عنصر بھی شامل تھا۔ یہ میں نے کیا کیا؟ یہ مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کو یہ بات پسند نہیں آئی ہوگی میں ان کے یہاں مہمان تھا اس لئے وہ چپ رہ گئیں لیکن کیا سوچا ہوگا انہوں نے میرے بارے میں؟ مگر وہ دروازے پر کیوں کھڑی تھیں۔ وہ میرے ساتھ آگے کیوں بڑھ آئی تھیں؟ ممکن ہے ان کو نیند نہ آئی ہو اور مجھے اترتا محسوس کر کے وہ یونہی اخلاقاً دروازے پر آ گئی ہوں کہ شاید مجھے کوئی ضرورت ہو۔ آخر تو میں انہی کی وجہ سے یہاں آیا یہ تو وہ اچھی طرح جانتی ہیں۔ مگر تب وہ آگے کیوں بڑھیں ممکن ہے پہلے انہوں نے میرے اوپر چلنے کی بات کو بہت Seriously نہ لیا ہو اور چند قدم آگے بڑھ کر انہیں اس بات کے غلط ہونے کا احساس ہوا ہو...... مگر...... اچانک ان کا ایک جملہ گونجا: ''آپ کے گھر سے لوٹ کر وہ یہاں آئے اور اس کے بعد گئے تو پھر اب تک نہیں لوٹے ہیں......'' پھر ان کا پانی کی بوچھار کے درمیان سوکھا سوکھا چہرہ یاد آیا ...... پھر ان کا میرے چہرے کو بے تابانہ چھوتا ہوا ہاتھ...... پھر ان کی آواز...... ''جاؤ سو رہو۔''

میں ساری رات خواب اور بے خوابی کے درمیان جھولتا رہا اور ساری رات ندی کے ہہ ہہ بہنے کی آواز آتی رہی اور ساری رات رک رک کر کبھی تیز کبھی مدھم بارش کھونٹ کھونٹ برستی رہی ......اور میں ساری رات سو نہ سکا۔

صبح ہوئی تو میں تو شروع میں کچھ شرمندہ سا رہا مگر بھابھی کے چہرے پر خفگی کا کوئی عکس نہیں تھا۔آج وہ سویرے سویرے نہا کر کپڑے بدل چکی تھیں ۔اور شاید چہرے پر ہلکا سا غازہ بھی لگا لیا تھا۔ چھ ماہ پہلے والی خوبصورتی لوٹ آئی تھی۔

میں ناشتے کے بعد کچھ اور رشتہ داروں سے ملنے کی غرض سے باہر نکلا تو پھر دیر ہو ہی گئی ۔لوٹتے لوٹتے تقریباً ایک بج چکا تھا۔

''کہاں رہ گئے تھے تم ،تمہارے انتظار میں ابھی تک میں نے کھانا نہیں کھایا۔''

''ارے ارے۔سوری بھابھی...... ملنے ملانے میں دیر ہوگئی۔''

کھانے کے دستر خوان پر میں نے اشارے سے پھوپھو کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اشارے ہی میں بتایا کہ وہ نماز پڑھ رہی ہیں۔

ہم لوگوں کے کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے پھوپھوبھی نماز سے فارغ ہوگئیں، بھابھی نے ان کے کمرے میں کھانا لگایا، کمرے کے دروازے پر پانی کا لوٹا رکھا تب وہ انتہائی تمکنت کے ساتھ اٹھیں، ہاتھ دھوکر دستر خوان پر بیٹھیں۔اور جتنی دیر وہ کھاتی رہیں بھابھی انہیں پنکھا جھلتی رہیں۔

وقت گزاری کے لئے میں بھابھی ہی کے کمرے میں رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور بغل میں ٹیبل پر رکھی کتابیں الٹ پلٹ کرر ہا تھا۔میں نے دیکھا کہ وہاں بانو ، بیسویں صدی اور شمع وغیرہ جیسے رسائل موجود تھے اور سبھی زیادہ نہیں صرف ایک دو ماہ ہی پرانے تھے۔ ہر رسالے پر بھابھی کا دستخط بھی تھا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ان کا میکہ شہر میں ہے اور وہ آئی۔اے۔ پاس ہیں، بلکہ یاد آیا شاید انہی نے بتایا تھا کہ بی۔اے میں ان کا داخلہ بھی ہو گیا تھا، چھ سات ماہ کلاس بھی کیا تھا کہ ان کی شادی ہوگئی اور سب ادھورا رہ گیا، مگر انہیں ابھی تک مطالعے کا شوق ہے اس کا اندازہ نہیں تھا۔

''نئے رسالے نہیں ہیں۔ ادھر کوئی شہر گیا ہی نہیں۔'' انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا......

''بھابھی مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا ورنہ میں تو بہت سے رسالے لئے آتا''

صاحب ہم نے تو غالبؔ کے شعر ہی کے ذریعہ آپ کو یہاں تک کھینچ بلایا۔آپ کو اس پر بھی

اندازہ نہیں ہوا'' بھابھی ہنسیں۔

''ویری ویری سوری ۔'' میں واقعی بہت شرمندہ ہوگیا ۔میں نے بالکل سامنے کی بات نظر انداز کردی تھی۔

''ایک منٹ رکو'' وہ آہستہ سے کہتی ہوئی باہر گئیں۔ان کا رخ پھوپھو کے کمرے کی طرف تھا۔

پھر کچھ دیر بعد لوٹ آئیں اور سامنے رکھی دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں ۔اچانک ان کے چہرے پر بڑا اطمینان سا جھلکنے لگا تھا۔

''کہاں گئی تھیں؟''

''آپ کی پھوپھو کو دیکھنے کہ سوئیں یا نہیں ۔'' کبھی تم کبھی آپ ۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔

''اتنی جلدی وہ سو جاتی ہیں؟''

اس پر وہ بے ساختہ ہنس دیں اور بڑے اطمینان سے بولیں :''ساری دنیا پر رعب چلاتی ہیں مگر نیند کے آگے وہ بے بس ہو جاتی ہیں ۔''

''یعنی ؟'' میں نے محسوس کیا کہ اب ان کی آواز میں شعوری طور پر پیدا کی ہوئی آہستگی بھی نہیں تھی ۔''یعنی یہ کہ دوپہر میں کھانے کے بعد ان کو فوراً نیند آجاتی ہے اور دو گھنٹہ گہری نیند سوتی ہیں، اسی طرح رات میں کھانے کے بعد وہ سوتی ہیں تو چار بجے بھور سے پہلے ان کی نیند نہیں ٹوٹتی ۔

پھر ہم باتیں کرنے لگے، دنیا جہان کی باتیں مگر میں نے غلط کہا، میں تو کچھ دیر بول کر چپ ہو گیا بس وہی بولتی رہیں، میرے گھر جب وہ آئی تھیں تب بھی ان کو اتنا موقع نہیں ملا تھا مگر یہاں تو یہ معاملہ کہ پھوپھو کی دو بیٹیاں، دونوں اپنی سسرال اور بس ایک بیٹا مظفر بھیا، جو اپنی تجارت کے سلسلے میں دور کے ایک شہر کے باشی اور پھوپھو کی نیند ایسی گہری کہ بقول بھابھی :''سرہانے پٹاخہ بھی پٹخ دو تو نیند نہ ٹوٹے ۔'' اور ادھر بھابھی لبالب پیالہ۔ وہ بتانے لگیں کہ شروع میں ان کے بھائی بہن وغیرہ کئی بار آئے مگر پھوپھو نے ایسا سرد رویہ اختیار کیا کہ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے بھی احتیاط برتنی شروع کر دی ۔ان کی آنکھوں میں دُکھ کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں، چہرے پر اداسی کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر برہا کا بارہ ماسہ......''

''سبطے میں بدنصیب ہوں ،ماں باپ کو دوش نہیں دوں گی ،میرا ہی نصیب چھوٹا تھا مگر خدا سے شکوہ ضرور ہے کہ جب ایسی اجاڑ جگہ اور ظالم لوگوں کے درمیان زندگی گزارنا میرا مقدر بنایا تھا تو میرے دل میں آرزوؤں کا درخت کیوں لگا دیا، مجھے پتھر دل کیوں نہ بنایا کہ کوئی احساس نہ ہوتا......''

''بھابھی یہ سب وقتی باتیں ہیں۔سب آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' میں نے ان کو دلاسہ دینے کی کوشش کی۔

''نہیں سبطے ۔یہ وقتی بات نہیں ہے ۔میں قصائی کی چھری کے نیچے رکھی بکری ہوں۔وہ عورت قصائی ہے ۔وہ خط لکھوا کر تمہارے بھائی کو یہاں آنے سے روک دیتی ہے۔'' اتنا کہتے کہتے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

''نہیں نہیں بھابھی ۔اتنی ناامیدی غلط ہے''۔بے ساختہ میرے ہاتھ ان کے آنسو پونچھنے لگے ۔انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے گال سے چپکا کر رونے لگیں۔میرا ایک ہاتھ ان کے گال پر تھا اور دوسرا کبھی ان کی آنکھوں پر جاتا کبھی سر پر کبھی شانے پر۔میری کہنی کا حصہ ان کی گردن کے نیچے کے حصے سے مس کر رہا تھا۔

اب میں کچھ بول نہیں پا رہا تھا ،بس وہ رہ رہ کر سسکیاں لیتی تھیں اور جیسے نیند میں بچے ڈر کر چونکتے ہیں ویسے وہ بار بار چونک رہی تھیں،اور جب وہ چونکتیں تو اپنے دونوں پیروں کو سختی سے سٹا لیتی تھیں،ایسے میں کبھی میری کہنی ان کے ٹخنے چھوتی کبھی ان کے دونوں ٹخنوں کے بیچ آجاتی۔

اچانک وہ چونک کر الگ ہو گئیں۔باورچی خانے سے برتن گرنے کی آواز آئی تھی۔

''تو بہ بلی تھی۔'' وہ ہنستی ہوئی کمرے میں واپس آئیں اور کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولیں۔''سبطے :تم تھوڑا آرام کر لو۔''

''نہیں نہیں۔میں ٹھیک ہوں آپ آرام کیجئے۔''

''ارے نہیں بھائی۔دن میں سونے کی عادت اب نہیں رہی۔تم آجاؤ بستر پر۔آپ لیٹئے ہم آپ سے گپ کرتے رہیں گے۔''

ان کا اصرار اتنا بڑھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ دوپہر میں لیٹنے کی میری عادت تو تھی ہی ۔میں لیٹ گیا، وہ سامنے کرسی پر بیٹھی رہیں اور بولتی رہیں۔

بولتے بولتے انہوں نے ایک پیر دوسرے پیر پر چڑھا لیا اور ان کی پنڈلی سے ذرا اوپر کا کچھ حصہ یوں جگمگا نے لگا جیسے گھنے بادلوں میں سے کبھی کبھی کوئی ستارہ جگمگا نے لگتا ہے۔ جو پیر انہوں نے پیر پر چڑھا لیا تھا وہ ٹخنے سے ذرا اوپر کھلا ہوا تھا اور ٹخنے کے پاس خوبصورت چھاگلوں کا ایک جوڑا یوں تو مون سادھے پڑا تھا مگر بات کرتے کرتے جب نہ تب وہ اس پیر کو ذرا سا ہلا دیتیں اور جھانجھن سے بج اٹھتے۔

جھانجھنوں کے بجنے سے ایک عجیب سی موسیقی فضا میں گونج اٹھتی اس میں نہ تو اکتارے یا جل ترنگ کا آہنگ تھا نہ سادھوؤں کے کڑے بجنے والی کیفیت ، نہ ہی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ۔ جب ان کے پیر ہلتے تو ایسی ہلکی سی گونج پیدا ہوتی جیسے بہتے ہوئے جھرنے کے جھر جھر یا ندی کے ترل ترل میں کوئی بہت ہلکے مدہم سر ملانے کی کوشش کر رہا ہو، یا جیسے دونوں چھاگلیں ایک دوسرے سے سرگوشی کر رہی ہوں اور پھر یہ گونج نئی نویلی دولہن کی طرح ہولے ہولے سہج سہج ہواؤں پہ قدم دھرتی لگتا کہ دروزے کی طرف جا رہی ہے مگر جب وہ اپنے پیر کی حرکت روکتیں اور جھانجھن اوپر سے نیچے کی طرف آتے تو لگتا کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے والی میٹھی میٹھی سرگوشی کہیں نہیں گئی واپس لوٹ آئی اور اسی کمرے کی فضاؤں میں ہولے ہولے تحلیل ہونے لگی۔

’’اچھا لگتا ہے۔‘‘ میں بے ارادہ بول اٹھا۔

’’کیا؟‘‘

’’آپ کے جھانجھنوں کا جھن جھن بجنا‘‘۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دیں اور جھانجھن پھر جھن سے بج اٹھے...... پھر یوں ہوا کہ وہ جان بوجھ کر بار بار چھاگلیں بجانے لگیں ......وہ چھاگلیں بجاتی رہیں اور میں کچھ عجب سی کیفیت کے حصار میں گھرا آنکھ بند کئے ان کی جھنجھناہٹ سنتا رہا...... پھر وہ رک گئیں۔

’’کیوں رک گئیں؟ اچھا لگ رہا تھا‘‘ میں نے چونک کر پوچھا۔

''میرا پیر دکھ گیا۔'' وہ مصنوعی غصے کے ساتھ مسکرا کر بولیں۔

''میں بجاؤں؟ پتہ نہیں کیسے زبان سے ایک جملہ پھسل پڑا۔

وہ کچھ دیر چپ رہیں...... پھر آہستہ سے بولیں...... بجاؤ!

میں ان کے جھانجھنوں سے کھیلتا رہا، جھانجھن بجتے رہے اور اب میرے بجائے وہ آنکھ بند کئے کرسی پر ساکت بیٹھی تھیں اور میں جھانجھن بجائے جا رہا تھا۔ جھانجھن بجائے جانے کے دوران کئی بار میرا ہاتھ ان کے پیر سے ٹکرایا۔ مگر مجھے ہر بار گزری ہوئی رات یاد آ جاتی اور میں آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیتا۔ مگر پھر کچھ دیر بعد جھانجھن بجانے لگتا...... پنڈلی اور گھٹنے کے درمیان چمکنے والا استارہ اب ملکہ وکٹوریہ کا چم چم چمکتا ہوا چاندی کا روپیہ بن گیا تھا۔

دیوار گیر گھڑی نے چار کی گھنٹی بجائی، وہ چونک کر کرسی سے اٹھ گئیں۔ میں نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

''ان کے اٹھنے کا وقت ہو گیا۔'' انہوں نے آہستہ سے مجھے اطلاع دی اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

میں ان کے جانے کے بعد بھی آنکھیں موندے بستر پر پڑا رہا کیوں کہ پھوپھو کے اٹھنے کی آواز مل چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر اس کمرے کی طرف آئیں کمرے میں کچھ دیر وہ کھڑی رہیں، باہر بھابھی کے برتن مانجھنے کی آواز آ رہی تھی، پھر وہ باہر نکل گئیں اور عجیب سے لہجے میں بھابھی سے پوچھا۔''

سبطین کتنے بجے سوئے؟''

''جی آپ کے سونے کے تھوڑی ہی دیر بعد''

''اوپر کیوں نہیں سوئے؟''

''ہم کیا کرتے؟ مہمان ہیں۔ سو گئے تو اٹھایا نہیں۔''

''ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ تیرا اپنا دیور نہیں ہے۔'' ان کے لہجے میں ایسا گھناؤنا پن اور سفاکی تھی کہ میں اندر سے ذرا سا سہم بھی گیا اور خوف سے زیادہ اس عورت سے گھن محسوس ہوئی۔

''مجھے آج چلے جانا چاہئے تھا۔'' بے ساختہ ایک خواہش نے سر اٹھایا۔

''اب شام میں کوئی بس یہاں سے شہر جاتی نہیں۔کل ضرور چلا جاؤں گا۔'' میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

کمرے سے بھابھی کے جانے کے بعد ہی سونے کی خواہش جاگی تھی، ذرا سی اونگھ بھی آئی تھی۔کل رات میں بالکل ہی نہیں سوسکا تھا۔میں سوبھی جاتا مگر پھوپھو کی باتوں نے طبیعت مکدر کردی۔میرا سر بھاری ہورہا تھا مگر مجھے نیند نہیں آرہی تھی، سوچا اٹھ جاؤں مگر پھوپھو کے سامنے جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہورہی تھی، کچھ اکتاہٹ، کچھ شرمندگی، کچھ پھوپھو کے لئے بن بلایا مہمان ہونے کا احساس، بستر سے اٹھنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا مگر اٹھنا تو تھا ہی، باہر نکلا تو وہ باورچی خانے کے بالکل سامنے کھٹولا ڈال کر آلتی پالتی مارے بیٹھی نظر آئیں۔بھابھی باورچی خانے میں جتی ہوئی تھیں۔آج دن میں بارش نہیں ہوئی تھی مگر موسم بالکل گھرا گھرا تھا چاروں طرف بادل ہی بادل، ہوا رکی ہوئی تھی اور فضا پر حبس سا طاری تھا۔

''لگتا ہے بارش ہوگی حبس ہورہا ہے۔'' میرا رُخ پھوپھو کی طرف تھا۔

''دو تین گھنٹے سے آسمان گھرا ہوا ہے۔بارش تو ہونی ہی چاہئے۔'' پھوپھو سے پہلے بھابھی بول اٹھیں۔میں چپ رہا مگر طبیعت ذرا جھنجھلا گئی۔''ہر بات کا جواب انہی کو دینا ہے؟'' پھر بھی کچھ بولا نہیں۔خموشی سے چانپاکل کے پاس بنے چبوترے کی طرف منہ دھونے کی غرض سے بڑھ گیا۔

''تم کس درجے میں پڑھتے ہو؟'' میں منہ دھوکر دالان میں رکھی کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ پھوپھو پوچھ بیٹھیں۔

''جی ایم اے کررہا ہوں۔''

''کالج بند ہے؟'' میں سمجھ گیا وہ یونیورسیٹی کو کالج کہہ رہی تھیں اوران کا اصل اشارہ دوسرا تھا۔

''جی ایک ٹیچر ختم ہوگئے تو ایک دن بند ہوگئی اور آج اتوار ہی تھا۔کل چلے جانا ہے''۔اب جھوٹ بولنے اوران کو سیدھا جواب دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

''ارے اب آئے ہوتو ایک دودن اور رہو۔اتنا جلدی جانا کیا؟ ان کے لہجے سے ان کا جھوٹ ٹپکا پڑرہا تھا۔

''جی نہیں۔کل تو جانا ضروری ہے۔'' اچانک میری نگاہ بھابھی کی طرف اٹھی وہ بس ایک ٹک مجھے دیکھے جارہی تھیں،مگر میں کیا کرسکتا تھا؟

موسم ویسے کا ویسا ہی گھرا گھرا اور بند بند رہا،بارش نہیں ہوئی اور رات آگئی۔

مغرب بعد کچھ لوگ آگئے،بات چیت کا سلسلہ رہا،پھر وہ گئے تو عورتیں آگئیں اور پھوپھو کی منڈلی جمی مگر پھر پتہ نہیں کیا ہوا کہ عورتیں جلد ہی اٹھ گئیں اور پھوپھو پھر دالان میں بچھے کھٹولے پرآکر بیٹھ گئیں،ادھر باورچی خانے میں بھابھی ، اور دونوں کے آمنے سامنے میں......میں ان دونوں کے بیچ سینڈوچ بنا رہا اور صورت حال کے اٹ پٹے پن پر اندر ہی اندر جھلاتا رہا۔بھابھی بات تو کرتی رہیں مگر ایسی باتیں جنہیں سن کر اپنی تکا بوٹی کرنے کو جی چاہتا مثلاً یہ کہ چچا کی صحت کیسی رہتی ہے؟ بہنوں کی منسوب طے ہوئی یا نہیں؟ کبھی چچا چچی کو لے کر آؤ،تمہارا چھوٹا والا بھائی کیا کررہا ہے؟ بھابی جب چپ ہوتیں تو پھوپھو شروع ہوجاتیں:شمس الدین چچا کا کیا حال ہے؟ امتل خالا کے لڑکے کیا کررہے ہیں؟ تمہارے باپ کی داڑھی ابھی کالی ہے یا سفید ہوگئی؟ تمہاری اماں کا دانت بچا ہوا ہے یا ٹوٹ گیا؟

میں جھیلتا رہا اور گھڑی دیکھتا رہا خدا خدا کر کے نو(۹) بجا کھانا لگا آج کھانے میں خاص اہتمام تھا...... پلاؤ مرغ،مچھلی،بھینس کا گاڑھا دودھ۔

''آپ بھی آجائیں۔''میں نے پھوپھو سے تکلفاً کہا۔

''نہیں۔ہم تو نماز کے بعد کھائیں گے۔'' بڑا سپاٹ سا جواب انہوں نے دیا اور نماز پڑھنے کے لئے اٹھ گئیں۔

''کیا یہ آپ کے ساتھ کبھی کھانا کھاتی ہیں؟'' جب وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں تو میں نے آہستہ سے پوچھا۔

بھابھی نے انکار میں گردن ہلائی،ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بہت ہی

آہستہ سے بولیں۔'' کان بہت تیز ہے۔''

پھوپھو نماز سے فارغ ہو گئیں تو پھر کل ہی کی طرح بھابھی نے پانی رکھا دستر خوان بچھایا، کھانا لے جا کر سجایا اور پنکھا جھلنے بیٹھ گئیں۔

میں بور ہو کر اوپر چلا آیا......اب ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

موسم پر خنکی کا اثر اب کافی محسوس ہونے لگا تھا۔ تین دنوں سے لگا تار ابر آلود موسم اور کبھی تیز کبھی مدہم بارش نے شاید ہوا کی کیفیت ہی بدل دی تھی۔ میں نے پاٹے کی چھوٹی کھڑکی سے باہر دیکھا، دور دور تک منظر دھند میں کھویا ہوا تھا اور ٹھنڈی ہوا سارے میں تیرتی پھر رہی تھی ندی کی آواز بتا رہی تھی کہ اس کا ابال زیادہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کم بھی نہیں ہوا تھا۔ بادلوں کی پرت پرت میں چھپا وسط ماہ کا چاند باہر چاروں طرف پھیلے کھیتوں اور کھلیانوں پر اپنی چاندنی پوری طرح تو نہیں بکھیر پا رہا تھا پھر بھی ہلکی مدہم روشنی چاندی کے برادے کی طرح جگہ جگہ بکھری پڑی تھی اور راستے سنسان تھے اور لوگ اپنے گھروں اور جھونپڑوں میں دبکے پڑے تھے، پتہ نہیں پر سکون تھے یا نہیں ...... میں تو نہیں تھا......میرے من میں ایک عجب سی بے کلی تیر رہی تھی اور میرا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ میں نے ان ڈیڑھ دنوں میں ایک پوری زندگی جی لی تھی۔

''پیاسی چڑیا اور شکاری۔'' ایک خواہ مخواہ کا جملہ ذہن میں گونجا پھر ندی کے بہاؤ میں رل مل گیا......میں اب بستر پر لیٹ چکا تھا۔

کل کی پوری رات اور آج کا دن لگا تار جاگتے گزرا تھا......نیند میری پلکوں کے تٹ کی طرف اپنے پورے طوفانی سر جوش کے ساتھ دوڑی چلی آ رہی تھی۔

میں سونا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں جاگنا چاہتا تھا۔ میں سوچنا چاہتا تھا کہ اس پوری کتھا یاترا میں بحیثیت کردار میں کون سا رول ادا کر سکتا ہوں...... مگر اس رات اپنے آپ پر سے شاید میرا اختیار اٹھ چکا تھا......میں بار بار سر جھٹکتا اور سوچتا......میرے ہاتھ اور ان کے گال......پھر اونگھ جاتا......پھر چونکتا اور سوچتا......ان کی پازیب اور ان کا پیر...... پر آنکھیں بند ہونے لگتیں۔

پھر آواز آتی......'' کالج بند ہے کیا؟''

''نہیں نہیں ۔کل صبح سویرے چلے جانا ہے ......اب اتنی بے غیرتی بھی صحیح نہیں۔'' میرا منہ ہوتا ذہن مجھے تنبیہ کرتا۔

پھر پتہ نہیں کس وقت نیند آ گئی۔

اس کے بعد آگے جو معاملہ ہے وہ عجیب سا ہے۔

پتہ نہیں رات کا کون سمئے تھا۔ پتہ نہیں بارش ہو رہی تھی یا رک گئی تھی۔ پتہ نہیں چاند بادلوں کا سینہ چیر کر باہر آسکا تھا یا چاروں طرف اندھیرا ہی سر مار رہا تھا، پتہ نہیں نعیم کو اس کی عذرا ملی یا نہیں ، پتہ نہیں گوتم نیلمبر دوبارہ شیو پوری جا سکا یا نہیں، پتہ نہیں تبریز اور نعیم جس بھیڑ میں گم ہوئے اس میں سے انہیں نکلنے اور کسی سمت رخ کرنے کا موقع ملا یا نہیں، پتہ نہیں صفدر زندہ بچا یا مر گیا۔

پتہ نہیں میں جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔

مجھے کچھ نہیں معلوم تھا...... مجھے کسی بات کا علم نہیں تھا......کسی طرح کا احساس نہیں تھا...... میں بے خبری کی بے حد اندھی اور گہری کھائی میں گرتا ہوا یا تری تھا اور میرے چاروں طرف دھند براجتی تھی......آگے دھند پیچھے دھند دائیں دھند بائیں دھند، میں پور م پور دھند میں اٹا ہوا تھا بلکہ شاید خود بھی دھند میں گھرا ایک منظر تھا اور دھند میرا نظارہ تھی اور نزدیک و دور کہیں کچھ بھی نہیں تھا۔

شنۓ ؟ نہیں شنۓ نہیں ......شاید خلا بے چیزیت ......ایک گہرا اننت گڑھا...... خالی پن...... جس کے کسی طرف کچھ نہیں......کچھ بھی نہیں!

''پھر......''

پھر ''کچھ نہیں'' میں سے......''

''ہے'' کے گمان کی پرچھائیں کا ایک ننھا سا......''

بہت مہین نب کے ایک مدہم سے نقطے کی طرح......ایک ستارہ چمکا......بے خبری کی بے حد اندھی اور گہری کھائی میں وہ ننھا سا ستارہ بڑی آہستگی اور سبک روی کے ساتھ اترا......پھر پل کے شاید ہزارویں حصے میں پورا نہیں بہت ذرا سا جھمکا چمکا......اور پھر وہی بے خبری، وہی دھند، وہی اندھی گہری کھائی ......مگر یہ......خبر کے دامن کی ہوا پائی ہوئی بے خبری، بہت دیر تک اپنا آپ

سنبھال کر نہ رکھ سکی......اب کے بہت مہین نب کا وہ مدہم سا نقطہ پورا ستارہ بن کر چمکا۔

میرے خالی پن کے تانت میں جیسے کوئی سوئی ہلکے سے چبھی، مجھے لگا، اندر اندر کچھ کنمناہٹ سی ہو رہی ہے ......کچھ بہت مدہم سا...... آہستہ آہستہ اپنے ہونے کا ذرا ذرا سا احساس دلاتا ہوا...... یہ ستارہ جگنو بن گیا ...... بار بار جلنے بجھنے لگا ...... پھر ایک جگنو سے دو جگنو ...... پھر تین ......پھر چار...... پھر اندر ہی اندر ڈھیر سارے جگنو ہواؤں میں اڑتے نظر آئے ...... پھر یہ سارے جگنو ایک جگہ جمع ہو کر چاند بن گئے ...... پھر ایسا لگا جیسے سامنے چاند ہے...... پورا کا پورا چودھویں رات کا چاند!

مجھے یاد آیا: سونے سے پہلے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تھا وسطِ ماہ کا چاند بادلوں کی پرت پرت میں چھپا بیٹھا تھا، شاید چاند بادل کی قید سے رہائی پا گیا۔

یہ سوچ کر اچھا لگا کہ چاند کھڑکی کے راستے میرے بستر تک چلا آیا۔

میں نے نیند سے بوجھل پلکیں ذرا سی کھولیں پھر آنکھیں آپ ہی آپ مند گئیں، ایک رات کی پوری جاگی آنکھیں اب میرے کہنے میں نہیں تھیں اور خود میں بھی تو سونا چاہتا تھا یہ تو چاند کمرے میں چلا آیا......مگر چاند کی چاندنی میں گرمی کہاں ہوتی ہے؟ اچانک احساس ہوا کہ چاند مجھے چھو رہا ہے۔

''چاند''؟ مجھے یاد آیا ہے میں نے پوچھا تھا۔

بس پر چاند ہنسا تھا۔ کچھ بولا نہیں تھا۔

چاند کی ہنسی میرے ماتھے اور گال پر جگہ جگہ بکھری ......میری آنکھ کھلی، پھر بند ہو گئی پھر کھلی پھر لگا پلکیں آپ ہی آپ بند ہوتی جا رہی ہیں ......نیند کی دھند شاید ابھی بھی چھٹی نہیں تھی...... میں نے دھند میں گھرا ان کا دھندلا چہرہ دیکھا تھا......چاند ......پرت پرت بادلوں میں چھپا ......یا......ان کا ہاتھ میرے گال پر تھا یا میرے ماتھے پر تھا......چاند......ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والا چم چم چمکتا چاندی کا سکہ......''

بھابھی؟ میری آواز غالباً نیند کے برفانی بوجھ تلے دبی تھی۔

''سو گئیں؟'' ایک آواز ......مسافت طے کرتی...... کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہوئی ، مجھے لگا وہ بہت تھکی ہوئی ہیں۔

نیند کی پری مجھے پھر اڑا کر کوہِ قاف لے جا چکی تھی۔

''سو گئیں؟'' ایسا لگا جیسے کوئی آواز لاکھوں میل کا فاصلہ طے کر کے مجھ تک پہنچنے کا بار بار تھکا تھکا جتن کر رہی ہو۔

''اوں ہوں ہوں اوں ہوں ......'' میں نے اس آواز پر توجہ دینے کی کوشش بھی کی تھی مگر کوہ قاف میں بے چہرہ اور بے پیکر پریوں کا رقص اپنے عروج پر تھا۔

''کل مت جاؤ۔'' پھر ایک بہت ہلکی سی مدہم سرگوشی گونجی تھی۔

مجھے یاد نہیں۔ میں نے کچھ جواب دیا یا نہیں ......پھر کچھ دیر بعد ایسا لگا جیسے ہزاروں میل دور سے مجھے کسی نے پکارا ہو:

''سبطے......''

میں نے جواب دینا چاہا مگر پھر نیند کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

''مجھے بہت چاہتے ہو؟''

''لگتا ہے بھابھی پوچھ رہی ہیں۔'' میں نے سمندر کی تہوں میں اور اندر ہی اندر اترتے ہوئے سوچا۔

''میرا ایک کام کر دو گے؟''

''اتنی رات گئے؟'' اتنا سوچا تھا......ایسا کچھ یاد آتا ہے۔

''مجھے زہر لا دو''

میں نے کچھ سوچنا چاہا تھا مگر اب سمندر کی آخری تہہ میں چپ چاپ پڑا تھا......شاید اب میں ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا رہا تھا۔

''تم بہت یاد آؤ گے۔''

میں نے سنا تھا...... ہاں یہی کہا تھا...... الفاظ بالکل ٹوٹ ٹوٹ کر مجھ تک پہنچ رہے تھے...... مگر میں سن رہا تھا۔

کوہِ قاف میں نیند کی پریاں رقص کر رہی تھیں ......اور چاروں طرف آوازوں کے پھول گر رہے تھے۔

پھر لگا کوئی مجھ پر جھک رہا ہے، پھر لگا میرے سینے پر کسی نے اپنا سر رکھ دیا...... پھر لگا...... پھر لگا......''

پھر اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا؟

آگے کی تفصیلات بے معنی ہیں، صبح سویرے اس گھر سے روانہ ہو گیا تھا روانہ ہونے کے وقت میں نے دیکھا تھا: بھابھی دالان کے ایک کونے میں کھڑی تھیں، دالان کے دوسرے کونے میں ٹنگے پنجرے میں قید طوطا بڑی بے چینی سے پنجرے کے طول وعرض میں چکر لگا رہا تھا اور پھڑ پھڑا رہا تھا، وہ بار بار پنجرے کے لوہے پر اپنی چونچ مارتا، پنجرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا اور تھک جاتا تو پھر پنجرے کے طول وعرض میں چکر لگانے لگتا اور ٹیں ٹیں کرنے لگتا۔

گھر سے باہر گاؤں کی کچی سڑک پر کچھ دور چل کر بے ارادہ میری گردن پشت کی طرف مڑ گئی۔ میری پشت پر مظفر بھیا کے مکان کے پاٹے کی کھڑکی پڑتی تھی، میری نگاہ بے ساختہ کھڑکی کی طرف گئی اور میں پل بھر کو ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں۔

شروع جاڑے میں صبح سویرے کی بہت ہی بے ضرر دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی پرندوں کا چہچہانا نہیں سنائی دے رہا تھا، شاید ان کے چہچہانے کا وقت گزر چکا تھا، لوگ باگ جاگ چکے تھے مگر فضا میں ابھی چاروں طرف ایک طرح کی کسل مندی تیر رہی تھی، شاید رات کا خمار ابھی اترا نہیں تھا، ندی دودنوں کی طغیانی کے بعد آج آہستہ آہستہ یوں بہہ رہی تھیں جیسے تھک گئی ہو۔ بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں ،ان کی آنکھیں خشک تھیں ،ہونٹ سلے ہوئے ، بال بکھرے ہوئے اور بے ترتیب تھے۔

بھابھی کھڑکی پر کھڑی تھیں اور مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میری ان کی نگاہیں ملیں تب بھی ان میں کوئی حرکت نہیں ہوئی انہوں نے کوئی اشارہ نہیں کیا ،وہ بس ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔

ان تین دنوں میں پہلی بار میری آنکھیں بھیگ گئیں ،پہلی بار اندر اندر درد نے ابال پر آئی ندی کے پورے سر جوش کے ساتھ سر اٹھایا اور میرے پورے وجود کو روند گیا پہلی بار درد تیز دھار دار ہتھیار کی طرح مجھے یوں کاٹنے لگا جیسے سوکھی گھاس درانتی سے کاٹی جاتی ہے،پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ......''

اب اس سے آگے بیان بے معنی ہو جاتا ہے۔

صرف سُر باقی رہ جاتا ہے اور ابد اکی انتہاؤں تک ندی کی لہروں کی طرح ترل ترل بہتا چلا جاتا ہے......!!

☆☆☆

جلیبی کا رس

روشن بہاری کا غصہ اپنی حدیں چھور ہا تھا اور اسی غصے میں وہ سو سے زیادہ کی رفتار سے گاڑی دوڑائے لئے چلا جارہا تھا۔ برسات کے موسم میں یہ رفتار خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔ روشن یہ جانتا تھا مگر وہ کیا کرتا۔ گاڑی کیا وہ خود اپنے بس میں نہیں تھا اس کی نگاہیں سامنے کے شیشے پر جمی تھیں۔ مگر اس کا دماغ وہاں سے آٹھ نو کلو میٹر دور جمنا اپارٹمنٹ کے کوارٹر نمبر ۱۵۷ر پر مرکوز تھا: وہ اتنی رات گئے آخر وہاں کیوں ہے ؟ سالا ضرور جانتا ہوگا کہ میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں...... ''حرامی !'' روشن کے منہ سے گالی بے ساختہ پھسل پڑی ورنہ عام دنوں میں تو وہ سماج کا ایک مہذب فرد گنا جاتا تھا۔

''ارررے ......رے......رے ......سالا......مرے گا کیا؟'' اس نے جلدی سے بریک پر پیر کا پورا دباؤ ڈالا۔ گاڑی ایک چیخ کے ساتھ رک گئی۔

''ارے سالا ......دیکھ کر نہیں چلتا ؟'' روشن کا غصہ اپنے عروج پر تھا۔ اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھولا اور دوڑ کر سڑک پار کرتے ہوئے دیہاتی کو کالر سے پکڑ لیا ......دیہاتی بیچارہ ہکا بکا ہکلاتا رہا...... ''بب......بب......'' بابو ہم کا کیا؟''

''سالا پھٹیچر دیہاتی '' روشن نے اسے دھکا دیتے ہوئے پھر گاڑی کا رخ کیا ...... کالر پکڑتے پکڑتے اسے یاد آ گیا کہ گھر جلد پہنچنا زیادہ ضروری ہے۔

''اچھی خاصی گیدرنگ مس کرنی پڑی'' ۔ اس خیال نے روشن کے غصے کی آگ پر جیسے تیل چھڑک دیا...... شکچھا منتری، پری وہن منتری، اسپیکر سب موجود تھے، وہاں ایرے غیرے کی تو گنجائش ہی نہیں تھی۔ شکچھا منتری نے کیسا لپک کر اس سے ہاتھ ملایا تھا۔ کمشنر بھی وہیں پر کھڑا تھا۔ ہماری کمائی

اور کیا ہے؟ کوئی ویتن ملتا ہے؟ بھتے کے نام پر بھی تو کچھ نہیں ملتا؟ میں ہوں کیا؟ بس کبھی اس سبھا میں کبھی اس سبھا میں کبھی اس اخبار میں فوٹو، چہرہ دکھانے کے علاوہ کیا کر پایا ہوں اب تک؟ مگر میں ہی کیا۔ شیلیش کمار، رگھونش پرشاد، مرتنجئے، رنجیت ترویدی، مہتاب عالم، سب تو مجھ سے سینئر ہیں تو ان کو کیا مل گیا؟ وہ ابراہیم شاہ پوری ......وہ تو سات آٹھ برس سے لگا ہوا ہے۔ روز رنجن بابو کے گھر حاضری لگاتا ہے، کبھی دوڑ کے پان لاتا ہے، کبھی ان کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا رہتا ہے۔ اس کو تو آج تک بیس سوتری کی ممبری نہیں مل پائی جس کے لئے تین سال سے لگا ہوا ہے۔ بتا رہا تھا کہ ''یار آدمی ذرا سمجھ بوجھ والا ہو تو اس میں مال بہت ہے۔''

روشن بہاری کا نہ گاڑی پر اختیار تھا نہ خیال پر، دونوں اپنی رفتار سے بھاگے جا رہے تھے۔ بڑے شہروں میں فاصلہ کتنی بڑی مصیبت ہے، اس وقت اسے اس کا شدت سے احساس ہوا، جنگل کی طرح پھیلے اس شہر میں سلیقے کی جگہ مکان کا ملنا کتنا بڑا مسئلہ ہے اس شہر میں آنے کے بعد کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے یہ تو اس کا دل ہی جانتا ہے، شروع شروع میں کیا سمجھ میں آتا، جہاں مکان مل گیا لے لیا مگر جب کئی مرتبہ کئی مہان پرشوں نے عجیب سا منہ بنا کر پوچھا! اچھا تم وہاں رہتے ہو؟'' تو اسے عجیب سا لگا تھا۔ کیا وہاں رہنا کوئی پاپ ہے؟ یہ لوگ وہاں رہنے کی بات سن کر اس طرح منہ کیوں بناتے ہیں؟'' پھر بہت بعد میں یہ عقل آئی کہ علاقے میں ایک بھی انجینئر، ڈاکٹر، ایم۔ پی یا کوئی بڑا بزنس مین نہ ہو تو اس علاقے میں رہنے کا کیا معنی ہے؟ اس سوال سے گھبرا کر اس نے ''جمنا اپارٹمنٹ'' میں ایک فلیٹ بک کرا لیا۔ حالاں کہ یہ فلیٹ لینے کے لیے پہلے اسے اپنا آبائی گھر بیچنا پڑا اور اس سے بھی جب بات نہ بنی تو بیوی کے زیور کی نوبت آئی مگر جمنا اپارٹمنٹ میں فلیٹ تو مل گیا...... جمنا کے بالکل کنارے...... بالکل نیا فاؤنڈیشن ......حالاں کہ سڑک ابھی پوری پختہ نہیں ہوئی تھی اور الیکٹرک کا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا پھر بھی فلیٹ کا تام جھام دوسرے فلیٹس سے کم نہیں تھا۔ یہ اپارٹمنٹ کئی سیکٹروں میں منقسم تھا۔ ہر دو سیکٹر کے بیچ سڑک، اپارٹمنٹ کے چاروں طرف قدِ آدم دیوار اندر ہی پلے گراؤنڈ اور ایک چھوٹا سا پارک، گیٹ پر دربان جو ہر آنے جانے والے کا نام لکھا کرتا۔ اس کے ٹھیک سامنے فلیٹ میں ایشوری بابو، سکریٹریٹ میں چیف سکریٹری کی پوسٹ پر ہیں، ان کے بغل میں ستنام سنگھ تکنولاجی کے بڑے انجینئر ہیں بڑا نام ہے

ان کا۔جس گھر میں خود مکھیہ منتری دعوت کھانے آئیں اس کے بڑا ہونے میں کون شک کرسکتا ہے؟اس کے ٹھیک نیچے امبشٹا چیف ایڈیٹر ہیں، سڑک کے دوسری طرف سامنے یونیورسیٹی کے رجسٹرار،ان کے بغل میں سیف الہدیٰ ایم ایل اے۔

''روشن بھائی۔آپ نے تو ایسی جگہ فلیٹ لیا ہے کہ اب اس پرانت میں آپ کا کوئی کام نہیں رک سکتا۔'' ایک دن جب شیلیش نے یہ اعتراف کیا تو اس کا سینہ فخر سے چار ہاتھ پھول گیا۔اور اس نے کچھ غلط بھی تو نہیں کہا تھا۔یہاں آنے کے بعد لوگوں نے اس سے اتنا کام لیا کہ بیوی کا جتنا زیور بکا تھا اس سے دوگنا روشن نے اسے بنوا دیا۔

''سالی'' ۔بیوی کا خیال آتے ہی پھر اس کا چہرہ بگڑ گیا۔میں نے کیا نہیں دیا اس کو، خوبصورت بچے،خوبصورت گھر،اونچی سوسائٹی، میکے سے جتنا لے کے آئی اس سے دوگنا زیور...... سالی اس پر بھی رنگ بدل گئی......شروع میں ٹھیک ٹھاک تھی مگر وہ حرامی اسے برباد کر گیا،آج اچھی خاصی گیدرنگ بھی سالے نے مس کرا دی۔

پارٹی اپنے شباب پر تھی۔پارٹی دراصل منورنجن بابو کی گلوخلاصی کی خوشی میں تھی،اپوزیشن والوں نے ان کو ایک مقدمے میں پھنسا دیا تھا۔سالے اپوزیشن والے تو کسی کو چین سے رہنے نہیں دیتے۔جب خود ستاّ میں تھے تو کیا کم لوٹ مچائی۔اب منورنجن بابو نے اندرا وکاس یوجنا میں اتنا کام بھی کرایا اور سالوں نے اسی میں ہیرا پھیری کے الزام میں ان کو پھنسا بھی دیا۔سی۔بی۔آئی انکوائری بٹھوا دی۔مگر ہوا کیا؟ منورنجن بابو نے بھی کوئی پچھلی ٹکیہ تھوڑے ہی کھائی تھی کہ پانڈے جی کی طرح انکوائری میں کھنڈت ڈالتے۔انہوں نے انکوائری کا سواگت کیا۔ہم لوگوں نے جب اس پر اعتراض کیا تو ہنس کر کہنے لگے:''مورکھ ہیں آپ لوگ۔انکوائری والے آسمان سے آئیں گے کیا؟'' اس وقت تو ہم لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھے مگر اب سمجھ میں آ گیا۔اب تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا۔سی۔بی۔آئی والوں نے منورنجن بابو کو نردوش ثابت کر کے ان کی پرتشٹھا اور بڑھا ہی دی۔آج منورنجن بابو کتنا خوش تھے۔آج موقع تھا پارلیمنٹری بورڈ کی ممبرشپ کے لئے کہنے کا،الیکشن سر پر ہے،ٹکٹ بانٹنے کا کام تو یہی بورڈ کرے گا۔اس میں تو ایسی آمدنی ہے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکری رنگ آوے چوکھا۔اوپر سے جو ایم ایل اے ہو جائے وہ احسان الگ

مانے، بعد میں یہی سب تو کام آتا ہے۔ مگراس سالی نے سب چوپٹ کردیا۔ اوروہ کیا۔ میں خودکیا کوئی کم گدھا ہوں، مجھے کیا پڑی تھی دس بجے رات میں فون کرنے کی؟ مگر کیسے نہ کرتا؟ اس کو میری فکر نہ ہو بچے تو انتظار کرتے ہیں۔ ''پپا ابھی تک نہیں آئے۔'' فون کیسے نہ کرتا۔ رات کا دس بج چکا تھا اور پارٹی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ پارٹی بھی تو خاصی بڑی تھی۔ کیسے نہ ہوتی۔ جب ان کو جنتا جناردھن لائن لگا لگا کر بدھائی دینے آنے لگی تو وہ جنتا کو کیسے نہ بلاتے۔ پھر سب منتری لوگ، ان سے جڑے پارٹی کے چھوٹے بڑے ورکر، ہزار سے کم مجمع نہیں ہوگا، بارہ بج جاتا، فون کیسے نہ کرتا؟

روشن پارٹی شروع ہونے کے بہت پہلے منورنجن بابو کے یہاں چلا گیا تھا۔ اس وقت بھی پچاسوں آدمی جمع تھے۔ ہال میں ہنسی خوشی کا ماحول تھا اسی وقت منورنجن بابو نے ہنس کر کہا تھا: ''پچھلے سال بھر سے تو میں اس سسری جانچ کے چکر میں آپ کے لئے کیا اپنے لئے بھی کچھ نہ کرسکا مگر اب بہت ہوا۔ اور آپ لوگ بھی منورنجن بابو ذرا زور سے ہنسے تھے۔'' بہت دھیرج سے کام لیا ہے۔ پارٹی کے بعد رکئے گا۔ اپنی متر منڈلی کے لئے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہے۔''

اس لئے پارٹی چھوڑ کر آنے کا تو کوئی سوال نہیں تھا۔ پارٹی ختم ہوجانے پر بھی جب تک منورنجن بابو اجازت نہیں دے دیتے۔ وہ منورنجن بابو کے پاس سے ہٹنے والا نہیں تھا اور اسی لئے جب دس بج گیا تو اس نے گھر فون کر دینا مناسب سمجھا تا کہ بیوی کو بتا دے کہ آنے میں دیر ہوسکتی ہے۔ مگر فون اٹھایا نوکر نے: ''جی سر ہم رامو ہیں۔''

''بی بی جی کو فون دو۔''

''سر وہ یہاں پر نہیں ہیں۔''

''سوگئی ہیں کیا۔''

''نہیں سر۔ سوئی تو نہیں ہیں۔''

''تو پھر؟......''

''سر وہ''......اتنا کہہ کر رامو رک گیا۔

''کیا بات ہے؟ بولتے کیوں نہیں؟ روشن نے نوکر کو ڈانٹا۔

''سر وہ بیڈروم میں ہیں۔''

''تو ایسے کہو نا کہ سونے چلی گئی ہیں۔''

''نہیں سر سوئی نہیں ہیں۔''

''عجیب پاگل آدمی ہے۔ جب سوئی نہیں ہیں تو ان کو فون کیوں نہیں دیتا؟''

''سر وہ......ششی بھوشن بابو......ان کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہے۔'' رامو ہکلانے لگا تھا۔

''کیا بکتا ہے؟ ششی بھوشن اس سمئے وہاں کہاں سے؟

''سر وہ آئے تھے سات ہی بجے ......مگر ......انہوں نے ...... راموا پنی ہکلاہٹ پر قابو نہیں کر پا رہا تھا۔

''ابے ہکلاتا کیوں ہے؟ صاف صاف بول''۔ روشن کا غصہ آسمان چھونے لگا۔

''جی سر......انہوں نے زیادہ پی لی ...... چلنے کے قابل نہیں رہے ......میڈم نے بیڈروم میں ان کو سلا دیا ہے ...... کمرہ اندر سے بند ہے ...... ہلہ کرنے کو منع کیا ہے ...... بابا لوگ بھی دوسرے کمرے میں سوئے ہیں''۔ روشن نے فون پٹخ دیا۔

اسے لگا وہ جل رہا ہے۔ آگ کی تیز لپٹوں میں اس نے خود کو گھرتا محسوس کیا۔ اس کا پورا سراپا رواں رواں جل رہا تھا......اس نے چاروں طرف نگاہ کی، نجات کوئی نجات، پناہ کوئی پناہ ...... کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ وہ بے تھاہ تھا اور اکیلا تھا اور اس کے چاروں طرف آگ تھی۔ وہ گھبرا کر ہال سے نکل آیا۔ بے ساختہ اس کے قدم اُس سمت بڑھے جہاں اس نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی ...... گاڑیوں کی بھیڑ میں اپنی گاڑی تلاش کرتے ہوئے اسے منورنجن بابو کا جملہ سنائی دیا...... پارٹی کے بعد رکئے گا...... جانچ کے چکر میں آپ کے لئے کیا اپنے لئے بھی کچھ نہ کر سکا مگر اب بہت ہوا...... پھر اس آواز کے ساتھ ساتھ دوسری آواز سنائی دی ......میڈم نے بیڈروم میں ان کو سلا دیا ہے کمرہ اندر سے بند ہے...... پھر آوازیں گڈمڈ ہونے لگیں......آپ لوگ پارٹی کے بعد ......میڈم نے بیڈروم میں...... رکئے گا...... ان کو سلا دیا ہے......متر منڈلی کے لئے

......کمرہ اندر سے ...... کچھ کرنا ہی پڑے گا ...... بند ہے ...... روشن آوازوں کے اژدھام میں گھرا اپنی گاڑی تک آیا۔

گاڑی کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ پھر آواز سنائی دی ......آپ لوگوں کے لئے کچھ نہ کرسکا...... جب وہ کار اسٹارٹ کر کے مین روڈ پر آیا تو پھر آواز گونجی ...... پارٹی کے بعد رکئے گا......''

مگر روشن سُنی اَن سنی کرکے گھر کی طرف دوڑ پڑا......'ششی بھوشن ! آج تمہیں بتا تا ہوں ......''اس نے دانت کچکچا کر ایکسلیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھادیا......اسپیڈ انڈیکیٹر میں گاڑی ۱۰۰ سے اوپر کا کانٹا چھوتی نظر آرہی تھی ۔ بارش پھر تیز ہوگئی تھی ، ویسے تو آج بارش صبح ہی سے رک رک کر مسلسل ہوتی رہی تھی ، موسم بھی دن بھر دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلتا رہا تھا مگر اس وقت تو تاحدِ نظر بادلوں کا جماؤ تھا ، روشن نے سامنے کے شیشے سے آسمان کی طرف نگاہ کی مگر آسمان پہ کوئی تارا نہیں تھا...... اندھیرا......گھٹا ٹوپ اندھیرا...... گاڑی کے شیشے چاروں طرف سے چڑھے ہوئے تھے اردگرد کچھ نظر نہیں آرہا تھا بس سامنے کے شیشے سے راستہ کسی طرح دکھائی دے جا رہا تھا۔

''اگر ہوجائے؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ انہونی؟ کیوں؟ آخر انہونی کیوں؟ انہونی کی کوئی وجہ تو ہوتی نہیں......

اچانک روشن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے ......کیا انہونی ہو ہی جائے گی ......؟ وائپر کی آواز گاڑی کے اندر گونجنے لگی تھی ......کھٹ کھٹ ......کھٹ کھٹ ...... کیا وائپر خراب ہوگیا؟ ......آواز بار بار ابھر رہی تھی ......کھٹ کھٹ ......کھٹ کھٹ ......پھر آواز کے ساتھ روشن نے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سنی ......دھک دھک ......دھک دھک ......پھر دونوں آوازیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہونے لگیں ......کھٹ دھک ......دھک دھک ......کھٹ دھک ......دھک دھک......''

بے ارادہ ، بے سوچے سمجھے ، بے اختیارانہ...... بے خیالی میں اس کا پیر بریک پر پڑ گیا تھا۔ وائپر کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی ۔ گاڑی کے سارے شیشے چاروں طرف سے چڑھے ہوئے ...... گاڑی چاروں طرف سے بالکل بند ...... وائپر ایک طرف جھکا ہوا......

باہر چھاجوں برستی برسات اور دھواں دھار برستا اندھیرا، سڑک پر آدم نہ آدم زاد، گاڑی میں صرف روشن بہاری ...... اور ایک ...... بس ایک ...... گونجتی ...... گاڑی کے اندر ...... چاروں طرف ......دھوئیں اور دھند کی طرح پھیلتی آواز......دھک دھک دھک......''

روشن ایک سرد رات میں بھی سر سے پیر تک پسینے میں تر بتر ہو گیا۔

۱۰۰ سے ۱۱۰ کے درمیان دوڑنے والی گاڑی اچانک پورا بریک لگنے سے الٹتے الٹتے بچی تھی ۔مگر روشن ابھی ہوش میں کہاں آیا تھا۔

وہ تو عجب ٹرانس میں تھا اسے یاد نہیں تھا کہ وہ منورنجن بابو کے یہاں سے اپنے گھر جانے کے لئے نکلا ہے، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بھری برسات کا موسم ہے، اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ وہ ایک ہلکی گاڑی چلا رہا ہے جو ذرا سا اسکٹ کرنے پر الٹ سکتی ہے، وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ وہ ۱۰۰ سے زیادہ کی رفتار سے گاڑی چلا رہا ہے......سامنے کی ہر یاد اور ہر خیال دم توڑ چکا تھا اور ایک چہرہ......بس ایک چہرے کا کلوزاپ اس کے سامنے پھیلے شیشے کے پورے جسم پر پھیل چکا تھا۔ مینا؟ ہاں مینا؟ ہاں ہاں مینا ہی تھی۔

ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سامنے سے آنے والی گاڑی کے اندر مینا کی شبیہ جھلکی تھی۔

اچانک بریک لگنے سے الٹتے الٹتے بچنے والی گاڑی کو وحشیانہ انداز میں اس نے بیک گیر میں لیا۔ روشن اب صرف ایک خیال کے حصار میں تھا...... مینا...... ہاں مینا ہی تھی ......بیس برس ......بیس برس پہلے کی مینا...... کالج ڈیز کی سب سے اچھی دوست ......اس کا پہلا پیار، شادی نہیں ہو سکی...... ہو بھی نہیں سکتی تھی...... جب دونوں نے کالج چھوڑا تو دونوں بیس اکیس برس کے تھے...... کس منہ سے وہ اپنے بڑوں کے سامنے خواہش کا اظہار کرتے ...... روشن اس وقت کس لائق تھا۔ مینا کی شادی تو کالج سے نکلتے ہی ہوگئی، پھر وہ اپنے شوہر کے ساتھ امریکہ چلی گئی اور دونوں ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے۔

بیس برس......بیس برس...... مدت ہجر کتنا پھیل گئی! اور اب اس لمحے میں؟

روشن گاڑی کو بیک گیر میں لیتے لیتے رک گیا......اس لمحے میں تو روشن، ششی بھوشن کی لگائی

آگ میں جل رہا تھا۔سڑک پر آدھی مڑی گاڑی رکی کھڑی تھی۔روشن نے اس آدھی مڑی گاڑی کی ہیڈ لائٹ کے انتہائی کنارے پر نگاہ جمائی تو مینا کی گاڑی ...... بہت دور پر...... ایک سرخ نقطے میں تبدیل ہوتی دکھائی دی ...... اسی وقت اچانک ایک آواز گونجی ...... میڈم نے بیڈروم میں ان کا سلا دیا ہے...... کمرہ اندر سے بند ہے۔'' روشن نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے مغز کو کسی نے اس کے سر کے اندر سے نکال کر کسی بوائلنگ فرنیس میں ڈال دیا ہو، اس کے کان میں کسی نے سیسہ پگھلا دیا ہو،اس کی انتڑیاں اس طرح اینٹھ رہی تھیں جیسے کوئی نوکیلا زنگ آلود چاقو آنت میں گھس کر چاروں طرف گھوم رہا ہواوراس کے ہاتھ ایسے بھاری اور بے حس ہورہے تھے جیسے ان پر اچانک فالج گر گیا ہو۔

اس نے بڑی مشکل سے بہت کوشش سے اور بہت تھکے تھکے انداز میں گاڑی کا رخ پھر سیدھ میں کیا۔اس کا چہرہ ایسا سرخ ہورہا تھا جیسے سارے جسم کا خون اس کے چہرے میں سمٹ آیا ہو۔''ششی بھوشن مادر ...... غلیظ گالی بکتے ہوئے اس نے گاڑی پھر جمنا اپارٹمنٹ کی طرف دوڑا دی ......ایک منورنجن کی میٹنگ چھوٹی، دوسرے یہ مینا ...... پتہ نہیں یہ کب آئی ...... جانے اس کو میرے یہاں ہونے کا علم بھی ہے یا نہیں ......اس حرامزادی کے چکر میں تو میری دنیا لٹ گئی ...... میں نے تو شادی کے بعد یہی سوچ کر کسی دوسری لڑکی یہاں تک کہ کسی پرانی دوست سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا کہ اپنی بیوی کے جذبات سے کھیلنے کا مجھے کوئی حق نہیں اور یہ سالی میری عزت سے کھیلنے لگی......ششی بھوشن کے بارے میں، پہلے میں نے اسے اشاروں میں سمجھایا جب اس سے کام نہیں چلا تو بہت نرمی سے مگر صاف صاف اسے بتایا کہ ''یہ آدمی سیاسی دنیا میں عورت خور مشہور ہے۔'' مگر وہ کیوں سمجھنے لگی۔الٹا مجھ ہی سے بحث کرنے لگی: آپ نے خود ہی ششی بھوشن بابو سے مجھے ملوایا،ان کو اپنے گھر لائے، مجھے ان کے گھر لے گئے۔اب وہ گھر آجاتے ہیں تو میں کیا کروں ؟ آپ کا جی چاہے تو آپ انہیں یہاں آنے سے منع کر دیجئے'' ......سالی مجھے بلیک میل کرتی ہے جانتی ہے کہ میں یہ تو کر نہیں سکوں گا۔ششی بھوشن مکھیہ منتری کی ناک کا بال ہے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلاتی ہے......حرامزادی! پھر روشن کے خیال کی رو ششی بھوشن کی طرف مڑ گئی۔

یہ سالا ششی بھوشن بھی تو شروع شروع میں بالکل ریز رو رہا۔ میں نیا نیا راج نیتی میں آیا تھا، دھوکا کھا گیا ۔ پہلے تو لفٹ ہی نہیں دیتا تھا ۔اس زمانے میں تو میں منورنجن بابو کے بھی قریب نہیں ہوا تھا، سوچا اسی کے قریب ہو جاؤں، یہ تو منورنجن بابو سے بڑی چیز ہے ......مگر یہ تو بھر منہ بات ہی نہیں کرتا تھا...... وہ تو ایک مرتبہ میں اسکوٹر پر......اسی بے شرم کو لے کر جا رہا تھا کہ سامنے سے وہ اپنی گاڑی پر آتا دکھائی دیا، میں نے راج نیتک بھل منساہٹ کے ناطے اسے نمستے کیا......اور یہ تو سب کے تئیں میرا عام ویوہار ہے ۔کبھی کبھی تو اس کی گاڑی زن سے نکل جاتی تھی ، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اس نے جواب دیا یا نہیں مگر اس دن تو انہونی ہو گئی ۔

''روشن جی ۔کہاں جا رہے ہیں ؟'' ششی بھوشن نے گاڑی روک دی تھی اور بتیسی نکال کر ہنس رہا تھا۔

''جی ذرا ریڈیو اسٹیشن کے پاس'' میں نے حیرت زدہ لہجے میں جواب دیا۔

''آج کل کہاں ہیں ۔آپ؟ بہت دنوں سے بھینٹ ملاقات نہیں ہوئی ۔''

''یہیں تو ہوں سر!''

''تو پھر ملاقات ہونی چاہئے ۔''

''جی سر!''

''ضرور ملئے گا۔''

''جب کہئے سر''۔

''کل شام میں ڈیرے پر آیئے ۔''

''جو حکم سر!''

اس کے بعد میرا اس کا سمبندھ بڑھتا گیا ۔میں تو یہی سوچ کر خوش تھا کہ پردیش کی راج نیتی کا اتنا بڑا انیتا مجھے یاد رکھتا ہے، میں اسی جھونک میں اس کے قریب ہوتا گیا ۔پھر ایک دن اس نے خود ہی کہا: روشن جی آپ کے گھر آؤں گا ...... آپ کے ساتھ کھانا کھاؤں گا ......میں بھلا انکار کیسے کرتا۔ مجھے تو لگا میرے بھاگ کھل گئے مگر کیا پتہ تھا کہ وہی دن میری ۔

بدقسمتی شروع ہونے کا دن بن جائے گا اس دن کے بعد تو وہ مجھ سے زیادہ اس بے غیرت کے قریب ہوتا گیا...... کتنے دن تک برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ تو حد ہوگئی پھر اسے آواز سنائی دی......کمرہ اندر سے بند ہے۔''''مگر غلطی میری ہی ہے'' ۔ روشن نے سوچا۔ میں نے اس پر روک کیوں نہیں لگائی ؟ کیسے روک لگاتا ؟ اس سے کیا کہتا کہ آپ میرے گھر نہ آیئے ...... کچھ کہنے کے لئے کچھ Base چاہئے ۔ میرے پاس کیا پوائنٹ تھا؟ مصیبت یہ تھی کہ میں منورنجن بابو سے بھی اس کی شکایت نہیں کرسکتا، دوگروپ کے آدمی ہیں، کہتا تو دونوں طرف سے مارا جاتا۔

''پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری'' ۔اچانک اسے منورنجن بابو کی میٹنگ یاد آئی۔

''اچھا ششی بھوشن۔'' روشن ایک لمبا سانس بھر کر بدبدایا۔تم نے میرے ساتھ جو کیا ہے اس کا بدلہ آج تمہیں مل ہی جائے گا۔آج تم رہو گے یا میں......اور تو چھنال......خیال کی رو بیوی کی طرف مڑ گئی تجھ کو تو میں وہ زندگی دوں گا جس سے موت بھی کانپے گی ......سالی نے آج میری ساری پلاننگ کا ستیاناس کر دیا......منورنجن بابو آج سب کو خوش کرنے کے موڈ میں تھے ۔اقلیتی کمیشن کی چیرمین شپ تو مہتاب کی رکھی ہوئی ہے ۔ دوسرا اور کون مقابلے میں ہے، ابراہیم شاہ پوری بیس سوتری کے لئے لگا ہی ہوا ہے شیلیش سیٹزن کاؤنسل کی سیٹ کے لئے دوڑ رہا ہے ۔اسٹیٹ منسٹر کی پوسٹ ہے......رگھوونش ...... ہاں رگھوونش نکل جائے گا۔ مجھ سے تو نہیں بولا ہے مگر رنجیت بتا رہا تھا کہ اس کی نظر بھی پارلیمنٹری بورڈ پر ہی ہے ۔مگر بورڈ میں تو کئی ممبر ہوتے ہیں اس سے کیا۔ سب سیٹ منورنجن بابو کے آدمیوں ہی کو تو نہیں مل جائے گی ۔ رگھوونش اگر نکال لے گیا تو میرا چانس کہاں ؟ منورنجن بابو کو بھی تو کہنے کا موقع مل جائے گا۔ میں نے تو تم کو روکا تھا۔تم چلے کیوں گئے؟ اب کیا بچا ہے جو تم کو دلواؤں؟ روشن کی گاڑی جمنا اپارٹمنٹ میں داخل ہو چکی تھی ۔

بارش نے ابھی تک رکنے کا نام نہیں لیا تھا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کچھ زیادہ بڑھ گئی تھی ......''جو بجلی کسی ایک جگہ چمکتی ہے وہ کسی نہ کسی مقام پہ گرتی بھی ہے۔'' روشن کو پھر ششی بھوشن یاد آ گیا ......آواز پھر گونجی :'' کمرہ اندر سے بند ہے......'' سارا اپارٹمنٹ رات کے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ کے اسٹریٹ بلب عارضی طور پر کھڑے کئے گئے لکڑی کے کھمبوں میں لٹکے ہوئے تھے اور ہواؤں کے ریلے میں آگے پیچھے ڈول رہے تھے اور درختوں کے بیچ سے چھن چھن کر آتی روشنیاں

بارش کی بڑی بڑی بوندوں کے درمیان اس طرح نیچے اوپر ہوتی نظر آ رہی تھیں جیسے پانی میں سانپ بل کھاتا ہے۔روشن نے اپنی گاڑی پارک کے شیڈ میں کھڑی کی اور تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا تو شاید ڈر جاتا۔غصے کی زیادتی کے سبب چہرہ بالکل سرخ ہو رہا تھا۔دانت بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں کی کیفیت عجیب ہو رہی تھی جیسے کسی پاگل کی بے کیفیت آنکھیں یا کسی خونی کی وحشت زدہ آنکھیں۔اس نے اپنے فلیٹ کے کال بیل پر بے تابانہ انگلی رکھی،گھنٹی بجی،شاید نوکر دروازے کے پاس ہی تھا،دروازہ فوراً کھل گیا۔

''وہ دونوں کہاں ہیں؟'' روشن کی دہاڑ سے فلیٹ گونج اٹھا۔

''سر آہستہ......میڈم بگڑیں گی......ہلہ کرنے سے منع کیا ہے۔''

''اس کی تو میں...... روشن نے گالی بکتے ہوئے نوکر کو ایک جھانپڑ جڑ دیا......''بتا دونوں کہاں ہیں؟'' نوکر کے لئے یہ بالکل انہونی تھی۔کئی فلیٹس میں اس نے کام کیا تھا مگر روشن جیسا اچھے سبھاؤ والا مالک اسے آج تک نہیں ملا تھا۔وہ تو کچھ کہہ نہیں سکا...... چودہ پندرہ برس کا لڑکا ......بالکل حیرت زدہ سا دیوار کے ایک کونے سے لگ گیا اور آہستہ آہستہ روتے ہوئے بیڈروم کی طرف اشارہ کیا۔روشن تیزی سے بیڈروم کی طرف بڑھا اور دروازے پر ایک زور کی تھاپ ماری دروازہ کھلنے میں ذرا دیر ہوئی ...... دروازہ کھلا تو سامنے کا منظر غصے کو مزید بڑھانے والا تھا۔ششی بھوشن اس کی مسہری پر دراز تھا۔

اس کے لیٹنے کا انداز اور بستر کی شکنیں بتا رہی تھیں کہ وہ بستر پر تنہا نہیں تھا،سائڈ ٹیبل پر شراب کی بوتل اور گلاس ......اس کی بیوی نائٹی پہنے ہوئی تھی۔ماتھے کی بندیا ماتھے پر نہیں تھی۔ہونٹوں کی لپ اسٹک پھیل کر ہونٹوں کے نیچے اور اوپر والے حصے تک پھیل گئی تھی۔بال کھلے ہوئے تھے اور بے ترتیب تھے۔کمرے میں روم فرشنر کی وہ خوشبو تیر رہی تھی جو بالعموم نائٹ بلب جلانے کے بعد روشن اسپرے کرتا تھا۔دروازہ کھلنے اور سامنے کا منظر دیکھنے میں شاید منٹ سے بھی کم کا وقفہ رہا ہوگا......اس وقفے میں روشن ہیجان کے سمندر میں ڈوبا ابھرا......''فوراً حملہ......نہیں پہلے ذلیل کروں ...... باندھوں ......گلا گھونٹ کے ماروں،ریوالور تو یہیں دراز میں...... باندھ کر گولی سے اڑا دوں......اور اس سالی کو ......نہیں طلاق نہیں......اسی گھر میں......اسی کے سامنے دوسری عورتوں کے ساتھ......''

ہیجان کے انتہائی خطرناک جوار بھاٹا یا بھنور یا باڑھ میں گھرا وہ ابھر رہا تھا ڈوب رہا تھا ، پٹخنیاں کھا رہا تھا، اور سیکنڈ منٹ تک بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ اچانک وہ چونک کر اچھل پڑا۔

یہ آواز......؟ یہ آواز......؟ اسے لگا وہ منورنجن بابو کے پاس بیٹھا ہے......ان کے قدموں میں...... اور وہ مسکرا کر کہہ رہے ہیں : روشن بہاری پارلیمنٹری بورڈ کی ممبری مبارک ہو' ۔'' مگر نہیں......وہ پھر چونکا......'' وہ تو اپنے بیڈروم میں ہے اور سامنے......مکھیہ منتری کی ناک کا بال......ششی بھوشن ہے۔''

'' ارے بھائی دھنیہ واد بھی نہیں دو گے ہم کو، ششی بھوشن مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

'' میں کچھ سمجھا نہیں۔'' روشن کو لگا کئی روشن اس پر تلے اوپر چڑھے آ رہے ہیں۔

'' ہاں۔تم کیسے سمجھو گے۔تم کو تو ہم پر وشواس ہی نہیں، ششی بھوشن نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا:'' لو۔اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔تم پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر بنائے گئے ہو۔''

'' سر......مگر میں سر......'' روشن کی کیفیت عجب ہو رہی تھی۔وہ غصہ برقرار رکھنا چاہ رہا تھا مگر ہنسی آئی جا رہی تھی اور چہرہ روہانسا ہوا جا رہا تھا اور آواز غصہ، خوشی، حیرت اور مجبوری کے رس میں ایسی تر بتر ہو رہی تھی جیسے پھلجڑی 'انار' یا کریکر جلیبی کے رس میں تر بتر ہو جائے......روشن کو لگا یہ تو اس کی اپنی آواز ہی نہیں ہے......مگر پھر بھی بول تو رہا تھا روشن ہی! '' لیکن سر......مگر سر......ہم نے تو کبھی آپ سے کہا نہیں۔''

'' ہاں تم ہم سے کیوں کہو گے؟ تم تو منورنجن سے کہو گے......ہم کو تو پرایا سمجھتے ہو...... پرنتو ہم تو تم کو اپنا متر مانتے ہیں......تمہاری پتنی سے ہم نے پوچھا تھا......اس اسائنمنٹ کا کریڈٹ تو اسی کو جاتا ہے......کتنا خیال رکھتی ہے تمہارا......''

ششی بھوشن اور بھی کچھ بولتے رہے......''

مگر آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ روشن نے اپنے آپ کو ششی بھوشن کا پیر چھوتے ہوئے دیکھا......!!!

☆☆☆

نجات......کوئی نجات!

اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا تھا......

اس نے حوالات میں لوہے کے چھڑ لگے دروازوں سے باہر دیکھنا چاہا تو سارا منظر اندھیرے کی دھند میں کھوتا نظر آیا اسے کچھ دکھائی نہیں دے پا رہا تھا حوالات سے لگے ہال میں بیٹھے منشی اور کھڑے کھڑے کھینی ٹھونکتے سپاہی، باہر لگا ٹیبل اور کرسیاں، کرسی پر اکڑوں بیٹھا داروغہ...... یہ سب کچھ اس نے محسوس کیا۔اس نے پھر حوالات کے باہر نظر جمائی تو دھند کے درمیان سے عجیب گڈمڈ تصویریں ابھرتی دکھائی دیں...... پیٹ کے بل رینگنے والے کیڑے......کئی منہ والے بڑے بڑے خوفناک راکھشس......بلبل جس کی دونوں ٹانگیں چیر دی گئیں،اس نے خوف سے گنگنا کر آنکھیں بند کرلیں اندھیرا بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اچانک حوالات کا دروازہ کھلا اور چار سپاہی اندر آئے اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی اس نے محسوس کیا وہ کانپ رہا ہے، اپنے کو سنبھالنے کی ہر کوشش بیکار جا رہی تھی، اس نے ایک مرتبہ پھر سپاہیوں کو دیکھا، ایک کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا......وہ چاروں اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور وہ پیچھے ہٹ رہا تھا، پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ دیوار سے ٹکرا گیا۔

''سچی بات بتا دے!'' ایک سپاہی پھنکارا۔

''کون سی بات بھائی؟'' اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

بھائی کے جنے چالا کی مت کر'' ! دوسرے نے کالر پکڑ کر گردن پر مٹھیوں کا دباؤ بڑھا دیا......دباؤ بڑھتا گیا جیسے کوئی آنتوں کو کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہو۔

وہ بری طرح چھٹپٹانے لگا تو پہلے نے دوسرے کا ہاتھ ہٹا دیا، اسے لگا جیسے کسی نے تپتے صحرا

سے اٹھا کر اسے ٹھنڈے پانیوں کے چشمے کے نیچے بٹھا دیا ہو۔

''سیدھی طرح سے صحیح بات کیوں نہیں بتا دیتا؟''

''آخر کون سی بات یہ پوچھنا چاہتے ہیں؟ اس نے جلدی جلدی لمبا لمبا سانس لیتے ہوئے سوچا۔

''ارے سالا مر جائے گا نہیں تو اگل دے'' تیسرے نے اسے دھمکی دی۔

اس نے پھر سوچا ''میں انہیں کیا بتا سکتا ہوں؟ مجھے بیچ راستے سے اٹھا لائے اور اب یہ بھی نہیں بتاتے کہ انہیں کس بات کا جواب چاہئے۔ نہ دوا لانے نکلتا نہ ان کے چنگل میں پھنستا اسے خود اپنے آپ پر غصہ آیا۔

''بہت ڈھیٹ لگ رہا ہے یہ ایسے نہیں بتائے گا، چوتھے کا لہجہ بہت خطرناک تھا۔

''بتائے گا تو اس کا باپ...... ما......اچانک ایک سپاہی گالی بکتا ہوا اس پر چڑھ دوڑا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا اس نے اس کے دونوں پیر میں اپنا سر پھنسا کر اسے گرا دیا۔ اس کا بیلنس تو پہلے ہی گڑ بڑا چکا تھا، سپاہی نے جھکائی دے کر چھوڑا تو سر کے بل گر پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اچانک سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو اور پھر اس سے پہلے کہ وہ سر پر ابھرنے والے گومڑ کو کم از کم ٹٹول پاتا وہی سپاہی اچھل کر اس کے سینے پر چڑھ گیا اور اس کے بال مٹھیوں میں پکڑ کر اسے گیند کی طرح ٹکرانے اور اچھالنے لگا، اور وہ بس پھٹی پھٹی بھیانک آواز میں چیختا رہا اور سب قہقہہ لگاتے رہے اور اسے گالیاں بکتے رہے۔

یہ سارا کچھ کتنی دیر تک چلتا رہا اسے یاد نہیں، اسے صرف اتنا یاد تھا کہ وہ شام میں چار ساڑھے چار کے آس پاس ہتھے چڑھا اور وہ جب اسے مرے چوہے کی طرح ایک کونے میں پھینک کر حوالات سے باہر نکلے تو ایک گاڑھا گندہ اور لجلجا اندھیرا اس کے چاروں طرف پھیل چکا تھا اور باہر کتے بھونک رہے تھے۔ اچانک وہ اچھل پڑا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا، چوٹ اندر اندر اسے اس طرح کاٹ رہی تھی جیسے نوچے بھنبھوڑے جسم پر پروا کے جھونکوں کی مار...... بے بسی کے شدید احساس نے اس پر گریہ طاری کر دیا......اچھلا تو وہ

اس لئے تھا کہ کتے اس کا جسم چاٹ رہے تھے......حلق تک غلاظت اترنے کا احساس......مگر بے ساختہ اچھلتے ہی درد کا احساس گھن پر غالب آ گیا اور پھر وہ بلک بلک کر روتا رہا۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا قصور کیا ہے؟ دو گھنٹے کے لئے کرفیو ختم ہوا تو وہ اپنی بیمار بہن کی دوا لینے نکلا اور واپسی میں ان کی زد میں آ گیا......کیا اسے کرفیو ختم ہونے پر بھی نہیں نکلنا چاہئے تھا ؟ مگر بہن کی دوا جو ختم ہو چکی تھی ، پھر انہوں نے کرفیو ختم ہونے کا اعلان کیوں کیا ؟ آخر مجھ سے کس بات کا جواب چاہتے ہیں؟

اس کے پاس صرف سوالات تھے۔ وہ سوچتا رہا اور درد سے تڑپتا رہا۔

اچانک پھر حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور وہ خوف سے لرز پڑا۔ ''یہ آخر مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔''

''کیوں بے؟ ہوش ٹھکانے آیا؟'' شکاری ٹارچ کا پوارا فوکس اس کے منہ پر پڑا

''دیکھو لاٹ صاحب کی اولاد کو۔ کیسا آرام سے لیٹا ہوا ہے۔''

ایک سپاہی نے بوٹ سے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا اور وہ پھر بلبلا کر رونے لگا......دوسرے نے تڑاخ سے ایک جھانپڑ مارا۔ سالے بہت نخرہ ہم دیکھ چکے ہیں، بھومیکا مت باندھ...... سچی بات بتا دے۔''

''ارے کیا بتاؤں؟ خدا کے لئے کچھ بتایئے تو'' وہ بے ساختہ چیخ پڑا۔

''چیخ مت ! ایک ہاتھ نے گردن دبائی تو اس کی آنکھیں نکل پڑیں ۔'' لاش کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔''

وہ ایک ٹک سامنے والے کو دیکھتا رہا......قصائی کی چھری تلے قصائی کو دیکھتا جانور!

''بول! کرفیو کا النگھن کر کے تو چھپتے چھپاتے بینک پر بم مارنے جا رہا تھا؟''

نہیں...... نہیں...... نہیں! سپاہی کو ایک زور دار جھٹکے سے کنارے پھینک کر وہ چیخا......''خدا کی پناہ! ارے میں نے آج تک بم دیکھا بھی نہیں......میں بے قصور ہوں سپاہی جی، میں نے کرفیو کا النگھن نہیں کیا، دو گھنٹے کے لئے جو کرفیو ہٹا تھا اسی میں بہن کی دوا لینے نکلا تھا۔'' وہ

عجیب انداز میں بولے چلا جا رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا جانور دم توڑنے تک نرخرے سے آواز نکالتا رہتا ہے۔

''ای سسرا ایسے نہیں مانے گا......اس کو الٹا لٹکا کر اس کی ناک میں مرچ کا دھواں دو۔'' حکم دینے والا غالباً انسپکٹر تھا۔

اسے الٹا لٹکا دیا گیا، اس کی ناک اور آنکھ میں مرچ کا دھواں دیا جاتا رہا اور اس کا حال اب یہ تھا کہ کبھی وہ رونے لگتا، کبھی سسکیاں بھرتا، کبھی دمے کے پرانے مریض کی طرح کھانستا، کبھی اس طرح چھٹپٹانے لگتا جیسے شعلوں میں گھرا آدمی، یا کسی پرشور دریا میں گر جانے والا آٹھ برس کا بچہ۔

اور اس سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھے لوگ کھینی ٹھونکتے رہے۔

ہوش آیا تو صبح ہو چکی تھی......وہ ایک کونے میں زمین پر پڑا ہوا کوٹھری کی چھت کو ایک ٹک تکے جا رہا تھا......عجیب بے خیالی، ناقابلِ بیان کیفیت کا حصار......کوئی خیال، کوئی فکر، کوئی خوف، کوئی امید، کوئی احساس......کچھ بھی نہیں!

''ایسی کیفیت کیوں ہے؟'' اس کے پاس صرف سوال تھا......جواب کوئی جواب......ایسے سوالات کا کبھی جواب ملا ہے؟

اچانک وہ چونکا......ایک سپاہی حوالات کا تالا کھول رہا تھا......''پھر یہ جواب مانگیں گے۔''

یک بارگی تمام حسیات جاگ اٹھیں مگر فوراً ہی ہر احساس پر خوف کا احساس غالب آ گیا......
''اب اذیت کی کون سی شکل باقی بچی ہے؟''

''چل بے۔ ایس پی صاحب بلا رہے ہیں۔'' سپاہی نے تالا کھولتے ہوئے زور سے ڈانٹ کر کہا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور سپاہی کو تکنے لگا......کیا وہ چل سکے گا؟ مگر انکار کا مطلب......''

''ابے الو کی طرح منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ باہر چل!''

باہر ورانڈے میں......ایک ٹیبل اور اس کے گرد کئی کرسیاں......ایک شخص کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور باقی سب کے سب مودبانہ کھڑے ہوئے تھے، سپاہی نے اسے لے جا کر ٹیبل کے پاس کھڑا کر دیا۔

''تم کرفیو کے درمیان باہر کیوں نکلے؟'' اس نے چونک کر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا ، وردی تو وہ بھی پہنے ہوئے تھا مگر اس کا لہجہ وردی والا نہیں تھا۔

''بینک لوٹنے والے کس گروہ سے تمہارا سمبندھ ہے؟'' اسے حیرت ہوئی کیسی عجیب عجیب باتیں پوچھ رہا ہے یہ شخص؟

اس نے سوچا، اس کو ساری بات بتا دے، اس پر جو ظلم ہوا ہے سب بیان کر دے۔

مگر عین اسی وقت اس کی نگاہ سامنے اٹھ گئی ، میدان میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، اسے اپنا اکلوتا بچہ یاد آ گیا ، پھر بیوی یاد آئی ، پھر بہن یاد آ گئی ...... باجی کتنا بیمار تھیں ، پتہ نہیں کیسی ہیں، میں تو ان سے کہہ کر نکلا کہ بس گیا اور آیا......اس کا کہاں پتہ تھا کہ ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں گا ...... پتہ نہیں کسی کو خبر مل سکی یا نہیں؟ خبر کیسے ملے گی؟ پانچ بجے شام میں تو اسے تھانے لایا گیا، وہ کرفیو لگ جانے کا وقت تھا......سب گھر کی طرف دوڑ رہے ہوں گے اس کو کس نے دیکھا ہوگا؟

''حضور! کل سے یہی کر رہا ہے تھکا کر رکھ دیا ہے اس نے کوئی جواب ہی نہیں دیتا''۔

''مگر اس کا بیان تو ضروری ہے۔''

''جی سر'' سب نے ایک ساتھ ہنکاری بھری۔

''اور آپ لوگ کہہ رہے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتا تو بیان کیسے لیجئے گا؟۔

''لے لیا جائے گا سر!'' وہی شخص بولا جس نے اس کی ناک میں مرچوں کا دھواں دلوایا تھا۔

وہ سر سے پیر تک کانپ گیا، جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا اس کا تصور ہی رونگٹا کھڑا کر دینے والا تھا...... یہ پھر اپنے مطلب کی باتیں اگلوانا چاہیں گے......''

''بہر حال قانون کے گھیرے سے بچ کر ہی چلنا چاہئے۔'' ایس پی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جی سر! اس کا تو خیال رکھا گیا ہے۔'' سب نے گندے گندے دانت نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

''آج اس کا چارج شیٹ کاٹ ہی دو......کوئی لینے نہیں آیا؟

نہیں سر......کوئی نہیں آیا، لگتا ہے اردگرد کے لوگ بھی اس سے ڈرے ہوئے اور پریشان ہیں۔

''کسی نیتا کا بھی فون نہیں آیا۔''

''نہیں سر!''

''حیرت ہے......ویسے ٹھیک ہی ہے تم لوگوں کو آسانی ہو جائے گی، ایس پی نے مسکرا کر کہا۔

''جی سر'' انسپکٹر کھلکھلا کر ہنسا۔

اس نے حیرت سے سب کچھ سنا مگر اسے یاد صرف اتنا رہ گیا کہ وہ ابھی پھر اس کا بیان لینے کی کوشش کریں گے، اس کا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا، اسے لگا اب وہ مر جائے گا......جو کچھ ہوا وہی نا قابل برداشت......اور اب وہی سب کچھ......اور اگر جیل چلا گیا تو مقدمہ...... پرائمری اسکول کا معمولی ماسٹر......جیل جانے کا مطلب ہے سپنشن ...... وہ کانپ اٹھا......سب بھوکے مر جائیں گے......اس کی نگاہ پھر سامنے میدان کی طرف مڑ گئی......بچے کھیل رہے تھے......اسے اپنا اکلوتا بچہ یاد آ گیا......''

ایس پی کرسی سے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے آگے بڑھا، سب اس کے پیچھے پیچھے تھے......

جب وہ چلنے لگتا تو سب چل پڑتے، جب وہ رک جاتا سب رک جاتے......

اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا......تین طرف کرسیاں......ایک طرف ذرا کھلا اسپیس! سامنے تھانے کا عقبی دروازہ!

سامنے میدان میں بچے کھیل رہے تھے......''ابا''......اس کے بچے نے پکارا۔

''تم دوا لینے گئے تو کہاں پھنس گئے؟ باجی کی آواز۔

باہر مت جایئے۔خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا؟ بیوی کی سسکی۔

جیل جانے کا مطلب ہے سپنشن......عقبی دروازہ!

عقبی دروازہ......میدان میں کھیلتے بچے ...... ابا ابا......دوا لائے ...... باہر مت جایئے ......عقبی دروزہ...... بیان لے لیا جائے گا سر...... چارج شیٹ کاٹ دو......عقبی دروازہ......عقبی دروازہ......دروازہ......؟

اسے لگا کہ وہ چکرا کر گر جائے گا......ٹیبل کا سہارا لینے کے لئے ذرا آگے بڑھا۔

''ارے بھا گا۔'' اچانک ایک سپاہی چیخا۔

''دوڑو......پکڑو!'' انسپکٹر پھٹی پھٹی آواز میں چیخا اور پھر خود بھی دوڑ پڑا۔

وہ بھاگ رہا تھا اور اس کے پیچھے پیچھے پورا تھانہ بھاگ رہا تھا۔

ایس پی صاحب اچھل کر اپنی جیپ پر چڑھ گئے اور جیپ اس کے پیچھے دوڑ پڑی۔ وہ دوڑ رہا تھا......دوڑتا چلا جا رہا تھا......جیسے کسی نے اسے پر لگا دیئے ہوں۔

وہ دوڑتے دوڑتے اچھلا اور کچھ اوپر اٹھ کر پھر سینے کے بل نیچے گر پڑا......گولی غالباً ایس پی صاحب نے ہی چلائی تھی۔

آگ کے گولے جیسی کوئی شئے اس کے اندر اترتی جا رہی تھی......رگ رگ میں جلن اور تناؤ......اس نے مڑ کر دیکھا، وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا، انسپکٹر اور ایس پی ریوالور تانے، اس کی طرف نشانہ لئے ہوئے چوکنا ہو کر بڑھ رہے تھے......

''ہوشیاری سے......بہت خطرناک ہے۔'' ایس پی نے انسپکٹر کو کہا۔

''تمہارا کھیل ختم ہو چکا ...... اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو''۔ انسپکٹر نے دور ہی سے پکار کر کہا۔

اسے ہنسی آ گئی ......آخری وقت میں شاید اس کی اوقات بڑھ گئی ہے......مگر اس کے پاس جان کے علاوہ کیا ہے؟ اور جان بھی کیا؟ یہ تو لاش ہی اٹھائیں گے......اس کی بند ہوتی آنکھیں نم ہو گئیں......اس نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی ......مگر آنکھیں تو اب بند ہونے کی راہ پر تھیں......اسے بہت دور سے آتی آوازیں سنائی دینے لگیں ......ابابا...... دوالائے ...... باہر مت جایئے!

دھند کی گہری چادر اس کے چاروں طرف تنتی چلی جا رہی تھی...... اس نے مندمند آنکھوں سے دیکھا۔ جوان اسے چاروں طرف سے رسیوں میں کستے چلے جا رہے تھے۔

اُسے کیا ثابت کیا جائے گا؟ فسادی؟ یا دہشت گرد؟

اگر وہ زندہ رہتا تو شاید اتنا ضرور ہی سوچتا......!

☆☆☆

نیو کی اینٹ

سلامت اللہ نے آفس جاتے ہوئے دیکھا تھا پھر دفتری کاموں کی بھیڑ میں بات دماغ سے نکل گئی

مگر شام کو جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچا تو بھیڑ ویسی ہی نظر آئی۔صبح میں آفس جانے کی جلدی بھی تھی اور ایک خیال یہ بھی تھا کہ ہوگا کوئی فنکشن ...... بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے تلک چھیکا وغیرہ کا فنکشن بھی کیا کم بھیڑ اکٹھا کرتا ہے......مگر شام کو بھی بھیڑ ویسی ہی نظر آئی تو اس کو فکر ہوئی ......کیا کوئی بیمار ہے؟ اب آفس کی جلدی تو تھی نہیں۔اس نے سائیکل اپنے دروازے پر لگائی اور دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے بھائی؟ شیو پوجن بھائی کہاں ہیں؟'' ایک آدمی سے اتنا ہی پوچھ پایا تھا کہ شیو پوجن نظر آ گئے۔

''آداب شیو پوجن بھائی، بڑی بھیڑ ہے؟ صبح بھی دیکھا،سب کشل منگل ہے نا؟''

''ارے آپ نہیں جانتے؟ شیو پوجن جی تو......''

ایک آدمی بہت لہک کر کچھ بتانے کے موڈ میں تھا کہ اچانک شیو پوجن نے اسے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے قدم گھر کے باہر لگے منڈپ سے آگے بڑھانے شروع کر دیئے سلامت اللہ بھی شیو پوجن کے ساتھ آگے بڑھنے پر مجبور تھا۔اس آدمی کے بولنے ،شیو پوجن کے اس آدمی کو ایک طرف کرنے ،سلامت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھنے اور منڈپ سے آگے کی طرف قدم بڑھانے میں شاید دو سکنڈ کا وقت گذرا ہوگا۔اس بیچ شیو پوجن چپ رہے پھر بولے، ''نہیں کوئی کھاس بات نہیں......ہم تنِک باہر گئے تھے......'' شیو پوجن کے

ان جملوں کے درمیان ہی ایک آواز سنائی دی، جو آدمی سلامت اللہ کو شیو پوجن کے بارے میں کچھ بتانے جا رہا تھا اس کو کوئی اور دوسرا آدمی شاید بتا رہا تھا،''سالا متلّا ہے۔''

یہ جملہ سلامت اللہ نے بھی سنا اور شیو پوجن نے بھی ...... دونوں کے بیچ یہ جملہ پہنچتے ہی شیو پوجن زور سے ہنسے......''اور سنائیے کیا خبر ہے؟'' سب کچھ کشل ہے نا؟

سلامت اللہ کو اچانک احساس ہوا کہ وہ تو ننگا ہے۔ مادرزاد برہنہ۔ وہ اور شیو پوجن دونوں گیٹ تک آ چکے تھے۔''اچھا شیو پوجن جی آداب'' وہ سمجھ نہیں پایا کہ اس کے اور شیو پوجن کے درمیان اب اور کون سا لفظ باقی بچا تھا۔

''نمستے''، شیو پوجن نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ سلامت اللہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

شام وہ بھی دسمبر کی۔ چاروں طرف اندھیرا جھک آیا تھا۔ بجلی غائب تھی لہٰذا ہر گھر میں لیمپ لالٹین روشن ہو چکی تھی۔ اچانک اسے اپنا گاؤں یاد آ گیا۔ شام ہوتے ہی وہاں بھی ہر گھر میں مٹی کا چراغ اور لالٹین روشن ہو جاتی تھی، پوس اور ماگھ کے جاڑے میں گھر کی بیٹھک میں سب جمع ہوتے، رحیم چاچا، سبطے ماموں، رامیشور چاچا، منگرو کاکا۔ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک نظر شیو پوجن کے گھر پر ڈالی اور اپنے گھر میں آ گیا۔

گھر میں داخل ہو رہا تھا تو گلی میں بچوں کے کھیلنے کی آواز سنائی دی،''جیئے کنہیا رام کی۔''

بچے ماں کے کمرے میں لوڈو کھیل رہے تھے۔ بڑا لڑکا ٹیبل پر پڑھ رہا تھا۔ بیوی باورچی خانے میں تھی۔ دیکھتے ہی عجیب انداز میں بولی،''آپ آ گئے؟''

''کیوں کیا بات ہے؟'' اسے کچھ حیرت سی ہوئی۔ وہ روز ہی آتا ہے اور بیوی بغیر کچھ کہے بس ہلکی سی مسکان سے اس کا استقبال کرتی ہے......پھر یہ؟

''نہیں اندھیرا ہو رہا تھا اس لئے جی لگا ہوا تھا۔''

''کیا اٹ پٹی سی بات کر رہی ہو؟ اندھیرا کیا آج ہی ہوا ہے؟''

اچھا اچھا منہ ہاتھ دھو لیجئے، چائے تیار ہے۔'' اسے لگا وہ بات کا رخ بدل رہی ہے۔

''ابوابو! شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے۔'' اس کی بیٹی اس کی آواز سنتے ہی دوڑی آئی، وہ شاید عادت کے مطابق دن بھر کی خاص خاص خبریں سنانے کے موڈ میں تھی۔

''چلو جا کر پڑھو، لائٹ آ گئی ہے۔'' بیوی نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کی طرف دھکیل دیا۔

''پاگل ہوگئی ہو؟ اس طرح کیوں ڈانٹتی ہو؟ اور یہ شیو پوجن کے یہاں اینٹ کیسی؟''

چپ رہئے۔'' اس نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دھیرے سے بولی، '' آواز دوسرے گھروں میں بھی جاتی ہے۔ پہلے منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا پی لیجئے۔'' سلامت اللہ کچھ نہ بولا، وہ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا؟ اور بھوک بھی لگی تھی۔ ٹفن کے وقت کا کھایا کتنی دیر تک پیٹ میں رہتا ہے؟ آج تو کوئی اسامی بھی نہیں پھنسا تھا کہ ناشتہ پانی کرا دیتا۔ مگر شیو پوجن......اسے باہر کی بھیڑ یاد آئی۔

پھر بیٹی کا جملہ، ''اینٹ آئی ہے'' اور اچانک شیو پوجن کا جملہ گونجا، '' ذرا باہر چلے گئے تھے۔''

''سنو'' اچانک اس کی چھٹی حس جاگ اٹھی اور اس نے دھیرے سے بیوی کو پکارا۔

''کیا ہے؟'' بیوی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''شیو پوجن......اجودھیا......گیا تھا کیا؟''

''جی ہاں باہر اسی کی بھیڑ ہے۔'' بیوی ہلکے سے بولی اور تھکے قدموں پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

بجلی پھر گم ہوگئی تھی اور پورے گھر میں عجیب سا سناٹا رینگ رہا تھا۔ آس پاس کے گھروں سے لالٹین کی ناکافی لو اس طرح تھرتھراتی اور رینگتی اس کی کھڑکیوں اور روشندانوں سے گھر کے اندر چلی آ رہی تھی کہ اسے لگا کہ سانپ کی کینچلی چمک رہی ہے۔

اندھیرا کچھ گہرا ہو گیا تھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے...... جۓ کنہیا رام کی۔

''سنو'' اس نے بیوی کو پھر پکارا۔

''جی''

''تمہارے ابا کا دو تین خط آ چکا ہے نا؟ اب تو بڑے دن کی چھٹی بھی ہونے والی ہے۔ اپنے مائیکے ہو آؤ۔''

''اچھا چلی جاؤں گی۔ لیجئے کچھ کھا لیجئے۔'' وہ دھیرے سے بولی اس کا انداز دل رکھنے والا تھا۔
اس نے تھوڑا سا کھایا۔ وہ لگ بھگ پانچ گھنٹوں کا بھوکا تھا۔ مگر اب بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔ چائے پی کر اس نے سگریٹ سلگائی اور صوفے پر ہی لیٹ کر ایک کش لیا اور ایک عجیب پس وپیش کی حالت میں خیال آیا۔ مکان ملتا کہاں ہے...... مسلم علاقوں میں تو کرایہ آسمان چھوتا ہے، مکان مالک سمجھتا ہے وہ خدا ہے، مکان نہیں دے رہا ہے۔ کرایہ دار کی عمر بڑھ رہا ہے...... مگر کرایہ دار بھی تو بیوی بچوں کے لئے ...... لیکن یہاں تو آمدنی محدود، رشوت کے نام پر چائے پانی یا کبھی قسمت نے ساتھ دیا تو دس بیس روپئے...... آمدنی والا ٹیبل اسے آج تک ملا ہی نہیں۔

ایسے میں وہ سرکاری کوارٹر چھوڑ اور کہاں جاتا؟ اور کوارٹر بھی کیا؟ ایل آئی جی فلیٹ۔ مگر ایک کلرک کو ایل آئی جی نہیں ملتا تو اور کیا ملتا۔

''جئے شری رام'' اچانک ایک زوردار نعرہ گونجا اور وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھئے بیٹھئے'' بیوی جلدی سے پاس آئی اور دھیرے سے بولی، گھبرانے کی بات نہیں، صبح سے ہی چل رہا ہے۔ دیکھنے والوں کا پھر کوئی نیا قافلہ آیا ہوگا۔''

وہ بیٹھ گیا مگر دل کی دھڑکن تو بڑھ گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا، اس سردی میں بھی ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

گئی رات تک بھیڑ کا احساس ہوتا رہا۔ رہ رہ کر نعرے سنائی دیتے رہے اور تنہائی کا اگیا بیتال سلامت کے کندھے پر چڑھ کر چپڑ چپڑ اس کی کھوپڑی کھاتا رہا۔

''مائیکے جانے کی بات آپ نے کیوں کی؟'' رات میں جب بچے سو گئے تو بیوی نے پوچھا۔

''کیوں نعرے نہیں سن رہی ہو؟''

نعرے تو عقیدت کے طور پر لگائے جا رہے ہیں۔

''عقیدت کو نفرت بنتے کتنی دیر لگتی ہے؟''

بیوی چپ ہوگئی۔ رات دھیرے دھیرے گہری اور اندھیری ہوتی جارہی تھی۔ وہ بہت دیر تک جاگتا رہا۔ عادت کے برخلاف جاگتا رہا۔ عام دنوں میں تو وہ دن بھر کا تھکا ہارا بستر پر اس طرح گرتا

تھا کہ اسے اس کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ بیوی کس وقت آ کر اس کے پاس لیٹی۔ مگر آج وہ جاگ رہا تھا ۔آج کیوں جاگ رہا تھا؟ شیو پوجن؟ مگر اس کے سلوک میں تو کوئی اہم بات نہیں تھی۔ اینٹ؟ نہیں، جب ۶ ر دسمبر گزر رہی گیا تو......تو پھر؟ اچانک جملہ گونجا ''سالا مُتُلّا ہے'' اسے لگا کسی نے اس کے کانوں میں انگارے ڈال دیئے۔ یہی وہ لفظ ہے جو سات گھنٹوں سے اس کی آنتیں کاٹ رہا ہے۔ پندرہ سال کی زندگی میں پہلی بار ایسا ہوتھا۔ کل تک وہ صرف سلامت بھائی تھا۔

اچانک اسے اپنے رشتہ دار یاد آ گئے، اپنا بھائی برکت اللہ، چچا عزت اللہ، ماموں عبدالستار ...... یہ سب لوگ اب کراچی میں تھے، ایک بار شادی میں وہ بھی کراچی گیا تھا ۔مگر گیا اور چلا آیا۔ اس وقت کوئی خاص بات محسوس نہیں ہوئی۔

بلکہ اسے یاد آیا، اس کے ماموں نے جب کہا۔ سلامت تم بھی یہیں آ جاؤ تو وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔ کیوں؟ کیا میں وہاں بھوکوں مر رہا ہوں؟

'نہیں یہ بات نہیں ہے۔' ماموں نے اسے سمجھانا چاہا۔ وہاں اتنے زیادہ فسادات ہوتے رہتے ہیں کہ برابر فکر لگی رہتی ہے۔

ماموں 1971 کے بعد آپ لوگ تو کم سے کم فسادات کا حوالہ نہ دیجئے، شاید اس کے لہجے میں تلخی زیادہ تھی۔

ماموں ایک دم چپ ہو گئے اور دیگر لوگوں نے بھی جب تک وہ وہاں رہا، پھر اس حوالے سے کوئی بات نہ کی۔

'کیا ماموں صحیح کہہ رہے تھے؟' اچانک اس کے ذہن میں ایک زہریلا ناگ پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہاں نہیں کے بھنور میں چکراتا رہا۔ پھر سر کو جھٹکا دیا۔ نان سنس، جو کچھ میرے چاروں طرف ہے وہی میرا ہے۔

''ہرے رام، ہرے کرشنا......'' اسکی سوچ کی رفتار اچانک رک گئی۔ شیو پوجن کے یہاں بھجن شروع ہو چکا تھا۔

''یہ؟'' اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

یہ تو ایک جھانکی ہے۔ متھرا، کاشی باقی ہے۔ اسے شہر کی دیوار پر لکھا ہوا ایک نعرہ یاد آ گیا۔

دور سے ایک گاڑی کی آواز رات کے سناٹے کو چیرتی اس تک پہنچی۔ سردی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ باہر ہواؤں کا زور اپنے شباب پر تھا۔ بیوی اور بچے لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ اس نے لحاف سے ذرا سا سر نکال کر دیوار گھڑی دیکھی۔ دو بج رہے تھے۔

پھر نظر خود ہی کلنڈر کی طرف چل گئی۔

۲۰ر دسمبر ......اچانک ایک عجیب اٹ پٹی سی بات اس کے ذہن میں آئی۔ ''کیا ۶ر دسمبر گزر گیا؟'' پھر اسی سے لگے لگے ایک اور دھند میں کھویا سوال...... ۶ر دسمبر کیوں آتا ہے؟۔

پھر ایک اور ڈر...... کیا ۶ر دسمبر پھر آئے گا؟ ایسے ہی اٹ پٹے خیالوں میں گم اسے نیند آ گئی۔

صبح سویرے بھجن کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹی۔ بچے اسکول، کالج کی تیاری میں مصروف تھے۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا۔ شیو پوجن کے یہاں بہت بھیڑ تھی۔ شاید بہت سارے لوگ رات میں یہیں رک گئے تھے۔ نل کے نیچے منہ دھونے اور نہانے کا سلسلہ جاری تھا۔ نوکر پورے گھر میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ شاید نئے مہمانوں کے استقبال کی تیاری تھی۔

''آج بچوں کو اسکول نہ جانے دو اور تم بھی تیار ہو جاؤ۔ میں تم لوگوں کو حیات بھائی کے یہاں چھوڑ دوں گا تب آفس جاؤں گا۔'' سلامت نے بیوی سے کہا۔

''کیوں؟''

''تم لوگوں کو اکیلا چھوڑ کر آفس میں جی نہیں لگے گا۔''

بیوی ایک منٹ سوچتی رہی پھر بولی کالونی میں عزیز بھائی، انعام صاحب اور فضل احمد بھی تو ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے بھی بات کر لیجئے۔

سلامت اللہ کو یہ بات پسند آئی۔ وہ گھر سے نکلا اور سیدھے نظر جھکائے ان تینوں سے ملنے چلا گیا۔ وہ تینوں بھی نئے حالات سے ڈرے ہوئے تھے، مگر چوں کہ شیو پوجن کا گھر ان کی لائن میں نہیں تھا اس لئے اتنا زیادہ اثر نہیں تھا۔ ویسے فضل احمد کی بات اس کے دل کو بھی لگی کہ آج دن بھر دیکھ لیا جائے۔ پھر انعام الحق کہنے لگے ''میری چھٹیاں باقی ہیں۔ تم لوگ بے فکر ہو کر جاؤ میں آج چھٹی لے لیتا ہوں۔''

مگر آفس میں بھی چین کہاں ! شیو پوجن بھی اسی آفس میں تھے جس میں سلامت اللہ تھا۔ اور شیو پوجن کے لوٹ آنے کی خبر سب کو مل چکی تھی بلکہ ایسا محسوس ہوا جیسے آفس والوں میں سے کئی لوگ کل شیو پوجن کے یہاں سے درشن کر آئے ہیں کیوں کہ بات چیت گھوم پھر کر شیو پوجن تک پہنچ رہی تھی حالاں کہ سلامت اللہ اپنے ٹیبل پر تھا مگر میزوں پر ہونے والی گفتگو سے اپنے کان کیسے بند کر لیتا؟

مگر بھائی نکالنے والے بھی بڑے گنی تھے۔ ایسا نکالا ہے، کہیں سے ٹوٹی نہیں ہے۔

ارے تو ہے بھی تو پانچ چھ سو سال پرانی تب میٹریل میں بھی تو کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی تھی۔

شیو پوجن کی تو پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہے اور کیوں نہ ہو اس کو ۴۷ء جیسا سنگھرش تو مان ہی لیا گیا اب کل کو شیو پوجن مجاہد آزادی کا پنشن بھی لے گا۔ جو درشن کرتا ہے وہ دان بھی دیتا ہے اور پھر دھارمک سنگھرش کا ایک حصہ بن کر شیو پوجن راتوں رات دھارمک بھی بن ہی گیا۔

سلامت کا گھر تو شیو پوجن کے پاس ہی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟ دھیمی سی آواز گونجی۔

''وہی ہوگا جوان لوگوں کا سارے دیش میں ہے۔''

سلامت اللہ اچانک چونک اٹھا۔ تو اس سارے رگڑے جھگڑے میں وہ بھی ایک پارٹی ہے؟ اچانک جیسے پورا منظر نامہ بدل گیا۔

اب تک وہ صرف اپنے بچوں، اپنے گھر اور اپنی کالونی کے حوالے سے سوچ رہا تھا مگر اسے اچانک احساس ہوا کہ شکست کھائی فوج کا ایک سپاہی وہ بھی ہے۔ وہ ایک ایسی جنگ میں ہارا ہے جس میں اس نے حصہ ہی نہیں لیا۔ اسے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور ترس بھی آیا۔ مگر ان کا کیا کروں؟ اسے اپنے ساتھی یاد آ گئے ان میں ایک شیو پوجن تو ہے ہی جو ایک ایسی جنگ کا فاتح ہے جس میں اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہیں تھا اور پھر باقی بچے یہ میرے دوست جو ایک ایسی جیت پر خوش ہیں جس میں ان کی کوئی حصہ داری نہیں۔ مگر تب اسی وقت مولانا عبداللہ بخاری کا ایک جملہ یاد آیا، انہیں کی طرح ہم نے بھی مادر وطن کو خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، گرینڈ ٹرینک روڈ، تاج محل، لال قلعہ ہم نے بنوایا۔

سلامت اللہ نے اچانک ہی اپنے کو ایک تلخ نفرت اور اوب کے گھیرے میں گھرتا محسوس کیا......اوب تو حالات سے مگر نفرت کن سے؟ دوستوں سے یا مولانا عبداللہ بخاری سے؟ اسے اس سوال کا کوئی صحیح جواب نہیں مل سکا۔ بے خیالی میں اس نے میز کا ڈراور کھولا اس میں پڑا ہفت نامہ نکالا جو اس نے کچھ دن پہلے خریدا تھا۔ وہ بے خیالی میں ہفتہ وار کا ورق الٹنے لگا۔ الٹتے الٹتے وہ ایک صفحے پر رک گیا۔ پورے صفحے پر ایک رنگین تصویر تھی۔ ڈھیر سارے لوگ گنبد پر چڑھ کر اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

درد کی ایک تیز لہر اٹھی اور بھنور یا بگولے کی طرح اس کے اندر اندر سر سے پیر تک دوڑتی رہی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس درد میں دکھ کے ساتھ شرمندگی بھی شامل تھی۔ اُس کا جی چاہا وہ چیخ کر روئے۔ اس کا جی چاہا کوئی اسے پرسہ دے، دلاسے کے دو جھوٹے بول ہی سہی۔ اسے بیٹی کا جملہ یاد آیا گیا۔ ''شیو پوجن چاچا کے یہاں اینٹ آئی ہے۔'' اس ایک اینٹ پر تصویریں نمایاں ہونے لگیں۔ سورت میں مادر زاد ننگی بھاگتی عورت کی تصویر۔ بمبئی میں لہولہان لاشیں۔ اسے گلزار یاد آ گئے۔ یہ زندہ بوند ہے بیٹی جہیز مانگے گی۔ پھر خسرو کی جیسے چیخ سنائی دی۔ ارے لکھی بابل مورے...... ہفتہ وار سے نکل کر وہ تصویر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور سینہ پٹنے لگی...... ظالمو! میرے گوہر نہ چھینو۔''

اسے کہیں بہت دور سے آتی ایک آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا۔ اس کا کلیگ فضل احمد اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے پکار رہا تھا۔

اس نے چونک کر اپنے کو دیکھا۔ ہفتہ وار کھلا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور آفس کے سبھی لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ ہڑ بڑا کر باتھ روم کی طرف دوڑا۔ باتھ روم سے ہاتھ منہ دھو کر نکلا تو اس کی طبیعت بالکل اچاٹ ہو چکی تھی۔ اسی حالت میں وہ باس کے کمرے میں چلا گیا۔ ''سر، میں گھر جانا چاہتا ہوں۔''

''گھر؟'' باس نے گھڑی دیکھی صرف دو بجے تھے۔

''جی سر، میں بہت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔''

''اچھا جاؤ'' باس نے جانے کیا سوچ کر اجازت دے دی۔

''سلامت؟'' جب وہ چیمبر سے نکلنے لگا تو باس نے پکارا۔

''جی سر؟''۔

کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے ہونے یا نہ ہونے پر اپنا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ایسے میں آدمی کو تھوڑا صبر سے کام لینا چاہئے ہر فیز ٹمپوریری ہوتا ہے۔''

باس جو کچھ کہنا چاہ رہے تھے شاید سلامت نے وہ سن لیا اور دھیرے سے آفس سے باہر آ گیا۔

مگر وہ تصویر اسے بار بار یاد آتی رہی اس کے اندر پھر ایک ہلچل سی مچی۔کاش وہ وہاں ہوتا تو کم سے کم اپنی جان تو دے ہی دیتا۔ دلی میں بیٹھے کئی لوگوں کے لئے بڑی بھدی بھدی گالیاں اسے یاد آئیں ۔ان سبھوں کو تو گولی مار دینی چاہئے ۔حفاظت کا نعرہ بلند کر رہے تھے۔ دھوکے باز کہیں کے! کم سے کم وہ وہاں ہوتا......

پھر اس نے اپنے آپ کو میدان جنگ میں بڑے دھواں دھار انداز میں جنگ لڑتے دیکھا ۔اس کے چاروں طرف دشمنوں کا ایک ہجوم ڈھال تلوار، تیر، بھالے سے لیس اور وہ اکیلا، بغیر زین کسے ہوئے گھوڑے پر ایک ٹوٹی تلوار لئے ہوئے ......اس نے دیکھا کہ وہ ٹوٹی تلوار کے سہارے لڑ رہا ہے، دائیں، بائیں اوپر نیچے سے اس پر حملے ہو رہے ہیں۔وہ سب کا سامنا کرتے ہوئے، مارتا کاٹتا گنبد پر چڑھ جاتا ہے اور ان سے ایک دھواں دھار جنگ لڑنے لگتا ہے جو گنبد گرانے کی کوشش کر رہے تھے۔اسی ادھیڑ بن میں گھر آ گیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی جیسے بیوی نے بم پٹخ دیا،'' کئی بار شیو پوجن جی آپ کو تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔''

''شیو پوجن؟ مجھے کھوج رہے تھے؟''

''جی ہاں۔''

''کیوں؟ مجھے کیوں؟''

''پتہ نہیں۔لیکن کئی بار آ چکے ہیں، جا کر مل لیجئے۔''

''میں کیا کروں گا مل کر؟ پھر کوئی پاگل کچھ نہ کچھ کہہ دے گا۔''

اچانک اسے جملہ یاد آ گیا سالا مُتُلّا ہے۔

''کیوں کسی نے کچھ کہا کیا؟''

''نہیں......مطلب نعرہ۔وارا''۔اب وہ بیوی سے اتنا بکھان کیا کرتا۔

''نعرہ؟ کوئی ضروری ہے کہ آپ ہی کو سنانے کے لئے ہو۔ ویسے بہت دیر سے کوئی نعرہ بھی سنائی نہیں دیا اور پھر ایک دن کا معاملہ نہیں۔ہمیں بھی تو یہیں رہنا ہے۔ جا کر مل لیجئے۔دریا میں رہ کر......''

وہ ایک پس وپیش کی حالت میں گھر سے نکلا اور شیو پوجن کے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

''ارے؟''اس کی آنکھیں تعجب سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں آفس سے واپسی پر وہ اپنے ہی خیالوں میں ایسا گم رہا کہ شیو پوجن کے گھر کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ وہاں تو نظارہ ہی دوسرا تھا۔منڈپ ہٹ چکا تھا۔بھیڑ تقریباً ختم ہو چکی تھی۔بھجن بھی بند ہو چکا تھا۔اس کے پکارتے ہی شیو پوجن ہڑ بڑا کر باہر نکلے۔

''ارے،سلامت بھائی،آپ؟ میں آپ کو کئی بار کھوج چکا۔''

''کیا بات ہے؟''

''آیئے،آیئے نا''وہ اسے لئے بیٹھک میں چلے گئے۔''بدھنا......چائے لے آرے۔''انہوں نے نوکر کو آواز دی۔

دیکھئے ایسا ہے کہ......'' تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ اصل بات پر آ ہی گئے۔''میں نے آپ کو بتایا ہی تھا کہ میں باہر گیا تھا پھر آفس میں بھی آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔ یہ تو آستھا کا معاملہ تھا سلامت بھائی۔آپ کچھ خیال مت کیجئے گا آپ دیکھ ہی رہے تھے کتنی بھیڑ تھی۔مگر آج خبر ملی ہے......تھوڑا ٹھہر کر بولے،''اصل میں دلی اور یہاں دونوں جگہ تو ہم لوگوں کی وِرودھی پارٹیاں ہیں تو اب اسی کو بہانہ بنا کر دھڑ پکڑ ہو رہی ہے۔تھانہ سے داروغہ جی خبر بھجوائے ہیں کہ اوپر کا حکم ہے...... پالن کرنا ہی ہوگا،آج کسی وقت چھاپا پڑ سکتا ہے......اب اسے کہاں لے جاؤں؟''

اس نے بڑی حیرت سے شیو پوجن کو دیکھا ......مجاہد آزادی ...... دھارمک سنگھرش؟ وہ شیو پوجن کو ایک ٹک دیکھتا رہا وہ بولتے رہے،''رمیش جی، ہزاری پرساد اگروال صاحب سب نے

انکار کر دیا اور بات بھی ٹھیک ہے، میرے بعد ان لوگوں کے گھروں کی بھی تلاشی ہوسکتی ہے۔ایسے میں اب لے دے کر آپ ہی بچ جاتے ہیں، جہاں تلاشی کا چانس نہیں ہے کرپا کر کے اس کو آپ اپنے یہاں رکھ لیجئے۔ میں نے سوچا مگر ادھر ادھر پھینکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔شری نرائن بتا رہے تھے کہ سی آئی ڈی والے گھوم رہے ہیں''اور پھر اتنا کہہ کر وہ رکے،سلامت اللہ کو دیکھا اور دھیرے سے بولے ''یہ تو آپ کے لئے بھی اتنی ہی اہم اور ضروری ہے۔''

سلامت اللہ کو ہنسی آ گئی۔اس نان سنس میں اب کیا سنس تلاش کیا جائے۔

مگر پھر اچانک گلزار یاد آ گئے۔یہ زندہ بوند ہے بیٹی جہیز مانگے گی ......اس لگا جہیز دینے کا وقت آ گیا۔ایک بار پھر میگزین سے تصویر نکل کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔اس کا پورا جسم آگ میں جھلس رہا تھا اور شعلے سانپ کی زبان کی طرح لپلپا رہے تھے۔لاکھوں میں ایک بے کس ودلگیر ہائے ہائے......اسے لگا وہ پکار رہی ہے......سلامت اللہ......سلامت اللہ......''

اچھا یہ تو بتایئے یہ کس حصے کی ہے؟''اچانک سلامت اللہ نے ایک بہت ہی عجیب سوال کر ڈالا۔

''یہ؟ یہ نیو کی ہے۔اوپر کا تو زیادہ حصہ برباد ہی ہو چکا۔''شیو پوجن نے بلا جھجھک بڑی صفائی سے جواب دیا۔مگر جب وہ اسے لئے اپنے گھر پہنچا تو بیوی بالکل بلبلا اٹھی اور شیرنی کی طرح جیسے اس پر جھپٹ پڑی۔آپ کی عقل ماری گئی ہے کیا؟ کل اسی کو لے کر اتنا پریشان تھے اور آج اسی کو گھر اٹھا لائے؟''

''یہ بہرحال اپنی چیز ہے۔''سلامت اللہ نے سمجھانا چاہا۔

''اپنی چیز؟''بیوی غصے میں ناچ ناچ گئی۔''کسی کو ناسور یا پھوڑا ہو جائے تو وہ بھی تو اس کی اپنی چیز ہوتا ہے۔تو کیا وہ سینت سینت کر اپنے پاس رکھے رہتا ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ''۔سلامت اللہ بگڑ اٹھا۔''کیا بے ہودہ باتیں کرتی ہو؟ کہاں ناسور؟ کہاں یہ! ارے اس کی حفاظت کرنا اور اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔''

''اچھا ابا ایک بات بتایئے۔''اچانک کالج میں پڑھنے والا بیٹا بول پڑا۔آپ ہی نے بتایا تھا کہ واجد علی شاہ کے وقت سے یہ ہمارے لئے مسئلہ بنی ہوئی ہے،تو پھر ایک ایسی چیز جو ہر زمانے

میں ہر آدمی کے لئے مسئلہ بن جاتی ہے۔حد یہ ہے کہ اب شیو پوجن چاچا کے لئے بھی مسئلہ بن گئی ۔اسے اپنے سر منڈھ لینا کہاں کی عقلمندی ہے؟ سلامت اللہ نے آنکھیں پھاڑ کر سامنے دیکھا...... وہاں اس کا بیٹا ہی تھا مگر دھند گہری تھی اس لئے پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی۔

پھر بیوی کی آواز سنائی دی،کورٹ، کچہری، تھانہ......ان کا کوئی ٹھکانہ! کہیں یہ شیو پوجن کے گھر جاتے جاتے ہماری طرف مڑ گئے تو؟ نا بابا نا...... بیوی بالکل مرنے مارنے پر تلی ہوئی تھی۔

''دیکھو تم لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔'' سلامت اللہ کو لگا کہ اب وہ اپنے گھر میں بھی ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔

''ارے جائیے جائیے'' بیوی غصہ میں ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔''کسی اور کو جا کر سمجھائیے اور اس سے پہلے خود سمجھنے کی کوشش کیجئے۔دلی میں بیٹھے سورما تو اس آگ سے گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے، ہم لاچار لوگ کس گنتی میں ہیں۔''

یہ بات سلامت اللہ کے جی کو لگ گئی ۔سچ مچ جب آگ لگی تو دلی میں بیٹھے سورما بھی تو صرف دور دور ہی سے آگ آگ کا شور مچاتے رہے۔

''مگر قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔جب وہ باہر آیا تو دیکھا کہ شیو پوجن کے گھر والے کہیں جا رہے ہیں۔

''کہاں جا رہے ہو؟''اس نے شیو پوجن کے لڑکے سے پوچھا جو گھر میں تالا لگا رہا تھا۔

''جی ہم لوگ موسی کے یہاں کاشی جا رہے ہیں۔''

''اور شیو پوجن جی......؟''

وہ پہلے ہی اسٹیشن جا چکے، اتنا کہتے ہوئے لڑکا بھی رکشہ پر بیٹھ گیا۔

شاید باپ کے حکم کے مطابق وہ زیادہ بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔شیو پوجن کی اسٹریٹجی سلامت اللہ کی سمجھ میں آ گئی۔بال بچوں والا آدمی ڈر کے بھاگے نہیں تو اور کیا کرے۔

مگر اصل مسئلہ یہ نہیں ہے۔شیو پوجن تو گیا سے نکلتا ہے اور کاشی چلا جاتا ہے۔ اور چاہے گا تو کاشی سے اپنے ماما کے گھر متھرا چلا جائے گا لیکن سلامت اللہ کیا کرے جس کو شیو پوجن نے زبردستی نیو کی اینٹ سونپ دی ہے

واَحسرتا

سب سردیوں میں کِھلا چاند بن گئے تھے۔

اور سردی ان کی ریڑھ کی ہڈی چیر کران کے اندر اندر اتر رہی تھی اور اپنا آپ سارا کا سارا ان کے آپے سراپے میں اتارتی جارہی تھی۔

پارک کے اندر دور دور تک دسمبر کی ٹھنڈی شام اتر آئی تھی دیودار اور چیڑ کے درختوں پر کُہاسہ گرر ہا تھا۔ابھی پانچ بھی نہیں بجا تھا مگر بادلوں کے ٹکڑوں نے سورج کو چھپا لیا تھا اور پورے پارک میں سردیوں میں کھلے ان پانچ چاندوں کے علاوہ کوئی نہ تھا،دربان بھی سردی سے بچنے کے لئے پارک کے ایک گوشے میں بنی لائبریری کی دالان میں گرم کپڑوں میں لپٹا تھرتھرا رہا تھا۔

''یار لگتا ہے ناصر ہتھے چڑھ گیا!'' جنید کے لہجے پر مایوسی کا عنصر حاوی تھا۔

''کیا پتہ ہتھے چڑھا یا بلی چڑھا!''افروز آہستہ سے بولا۔

''تم کو شرم نہیں آتی ؟ بلی کہتے ہو......شہید کہتے ہوئے شرم آتی ہے ؟''اعجاز کے لہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔

''کیسی ظالمانہ باتیں کررہے ہو تم لوگ ؟''رؤف تڑپ اٹھا۔صرف اس لئے کہ وہ یہاں پہنچا نہیں،تم لوگ اس کی موت کی نوعیت پر بھی بحث کرنے لگے؟''

جنید،افروز،اعجاز اور رؤف مسلسل گفتگو میں مصروف تھے۔

شعار احمد خاموش بیٹھا بس سامنے لائبریری کی دالان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔جہاں دربان گرم کپڑوں میں لپٹا تھرتھرا رہا تھا۔

''لیکن کیسا بھیانک منظر تھا یار؟''افروز شاید سوچ کر سہم گیا تھا۔

''مگر سارا پروگرام سالوں نے کرکرا کر دیا ورنہ آج تو ہم لوگ اسمبلی میں گھس ہی جاتے۔''

اعجاز کے لہجے میں تاسف کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

''ہاں اور کیا؟'' جنید بولا شہید میموریل تک تو ہم لوگ پہنچ ہی چکے تھے، وہاں سے اسمبلی کتنی دور ہے؟ اگر دس منٹ وہ سب اور ٹھہر جاتے تو سارا مرحلہ ہو طے جاتا۔''

''یار پتہ نہیں منظور کا کیا ہوا؟''اعجاز کو اچانک یاد آیا۔''بم کا اسٹاک تو اسی کے پاس تھا۔''

''کیا؟''شعار احمد اچھل پڑا۔بم بھی تھا؟''

''ہاں منے بم بھی تھا۔'' اعجاز نے بھنچا بھنچا قہقہہ لگایا۔تم کیا سمجھ رہے تھے؟ ہم لوگ کیا گڈے گڈی کی شادی کرنے گئے تھے۔؟''

''مگر یار اس کی کیا ضرورت تھی ؟ تم لوگوں نے بتایا تھا کہ ہم لوگ اپنا احتجاج درج کرائیں گے

''تو وہاں احتجاج ہی تو درج ہوا......اور کیا ہوا؟ افروز بولا۔

''یہ احتجاج تھا؟''

''ہاں پیارے احتجاج تھا۔''

''یار کیا بات کرتے ہو تم لوگ ؟''شعار انتہائی جھلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ یہ احتجاج تھا؟ حالات کو ہم لوگ کھینچ کر فائرنگ پوائنٹ تک لے آئے اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ احتجاج تھا۔

''ہاں بھولے راجہ یہاں احتجاج ایسے ہی ہوتا ہے۔''

''تو پھر یار، ہنگامے اور احتجاج میں کیا فرق ہے؟''

اس پر سب دوست کچھ دیر چپ رہے......پھر رؤف بولا......جان من یہاں تو ہر احتجاج ہنگامہ ہے اور ہر ہنگامہ احتجاج۔''

پھر اس سے پہلے کہ بات کچھ اور آگے بڑھے، اچانک سب کو چپکی لگ گئی ......جیسے سب کو سکتہ مار گیا ہو......

رات آ چکی تھی، جاڑے میں تو سورج ساڑھے پانچ بجتے بجتے ہی غروب ہو جاتا ہے، اب تو ساڑھے چھ بج چکا تھا، نزدیک و دور ہر چہار سمت رات کا ڈیرا تھا اور پارک میں لگے دودھیا بلبوں کی دودھیا روشنی جھک جھور ٹھنڈی رات میں گرتے کُہاسے میں رل مل کر یوں مند مند دکھائی دے رہی تھی جیسے قمقموں کو بھی نیند آ رہی ہو......اور دور پارک کے ایک گوشے میں بنی دالان میں، پھٹے پرانے گرم کپڑوں اور کمبل میں لیٹا دربان اونگھ اونگھ جا رہا تھا......'' اور ان پانچوں کو چپکی لگی ہوئی تھی ......جیسے سب کو سکتہ مار گیا ہو!

سب کے سب سامنے پارک کے چاروں طرف پھیلی سڑک گھورے جا رہے تھے......''

''جہاں اسمبلی کی طرف سے آتی ہوئی سڑک پر سے......''

''پولیس کی گاڑیاں مسلسل قلبِ شہر کی طرف دوڑ رہی تھیں......'' سات، آٹھ، نو، دس، گیارہ ، بارہ......'' جنید بدبدا رہا تھا۔

''بارہ گاڑیاں ہیں نا؟'' افروز سرگوشیوں میں بولا، شاید اس نے بھی گِنا تھا۔

''ہاں!''

یار معاملہ کیا ہے؟'' رؤف گھبرایا گھبرایا دکھائی دینے لگا۔''

''تشویش کی بات ہے۔'' اعجاز بولا......''سب کا جماؤ تو نارتھ بلاک سے شہید میموریل تک تھا پھر ادھر رخ کیوں مڑا؟''

''ادھر یہ کہاں جا سکتے ہیں؟ جنید نے جیسے خود سے سوال کیا تین محلے تو ان کے ہیں اور پارک کے آس پاس ہی ہیں، یہاں سے اتنا اندازہ تو کیا ہی جا سکتا ہے کہ ان تین محلوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ مگر باقی محلے جو اپنے ہیں شاید وہاں بھی کوئی گڑبڑی نہیں ہے۔'' جنید قیاس کے سہارے کسی فیصلے تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔'' کیوں کہ اپنے محلے بھی ان تین محلوں سے متصل ہیں۔ اگر ان میں کوئی گڑبڑی ہوتی تو سامنے کے ان تین محلوں میں بھی کچھ نہ کچھ کنمناہٹ تو ضرور محسوس ہوتی۔''

''یار اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیٹی گڑبڑ ہے؟'' رؤف کے لہجے سے گھبراہٹ عیاں تھی، اس کا گھر سیٹی میں تھا۔ کسی نے کچھ کہا نہیں......سب بس سامنے کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

''مگر یار......ناصر کا کیا ہوگا۔'' جب چاروں طرف پولیس کی گاڑیاں دوڑنے لگیں تو شعار احمد کو ناصر یاد آ گیا۔

''ہاں یار! ناصر کی بات تو ہم لوگ بھول ہی گئے۔''

اعجاز چونکا...... ''اب تک تو اس کو آ جانا چاہئے تھا۔''

''تم نے سارا پروگرام اس کو بتا دیا تھا؟ شعار نے پھر سوال کیا۔

''مگر یار! اب واقعی انتہا ہوگئی۔'' جنید کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

سب نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں یارو......دیکھتے کیا ہو؟ اب اس سے زیادہ انتہا کیا ہوگی کہ ہمارے ہی خلاف فیصلہ کر دیا جائے اور جب صدائے احتجاج بلند کرنے جائیں تو گولیوں کی باڑھ ماری جائے۔''

''مگر احتجاج تو اور جگہوں میں بھی ہوا، گولی تو کہیں نہیں چلی؟'' شعار بھی اپنا اصل سوال، ناصر کی بات بھول کر، ان کے ساتھ بحث میں شامل ہوگیا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ رؤف نے دخل دیا......اور جگہ نہیں چلی......ارے یہاں تو چلی؟''

''اور پھر......کوشش کہاں نہیں کی گئی؟'' جنید نے کہا......کامیابی نہیں ملی ہوگی ......یہاں کامیابی مل گئی......موقع مل گیا......شروع ہوگئے......''

''مگر یہ سوچنے والی بات ضرور ہے۔'' افروز بولا۔اگر جنید کی بات مان بھی لی جائے تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ یہاں کامیابی کیوں مل گئی؟''

رؤف ،جنید ،افروز ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے ،اعجاز سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اور شعار سر جھکائے خاموش بیٹھا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''ارے ارے......یہ کیا؟'' اچانک اعجاز اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہوگیا......سب کی نگاہ اعجاز کی ناک کی سیدھ میں اٹھی ......پورب کی سمت بہت دور پر آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے......''

''یار یہ...... یہ...... رؤف نے شدتِ جذبات میں اعجاز کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا......

''یار شعلے دور پر ہیں...... یار یہ سب کچھ سیٹی میں ہو رہا ہے......''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' کسی دوست نے کہا، اور سب کے دل میں ہمدردی کی اک لہر اٹھی۔

سبھی جانتے تھے کہ رؤف اپنے محلے میں تنہا ہے اور اس کا محلّہ بغل کے محلے کی وجہ سے خاصا Sensative ہے۔ظاہر ہے ایسی صورتِ حال میں رؤف کی بے چینی بالکل بجا تھی۔''یار مجھے جانا چاہئے۔'' رؤف بے خودی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔

صورتِ حال ایک ایسے موڑ تک پہنچ چکی تھی کہ اب کوئی جانے والے کو رکنے کا مشورہ دینے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا، سب نے خالی خالی نگاہوں سے رؤف کو دیکھا...... رؤف آگے بڑھا مگر اچانک ٹھٹھک گیا۔

ایک گاڑی کچھ اعلان کرتی گذر رہی تھی۔

سب نے اعلان سنا اور ایسے دکھائی دینے لگے جیسے سب پر ایک ساتھ فالج گر گیا ہو!!

اس کا مطلب یہ کہ معاملہ بہت سنگین رخ اختیار کر چکا ہے۔'' جنید آہستہ بولا۔

''ظاہر ہے ورنہ عام طور پر تو دفعہ ۱۴۴ سے ہی کام چل جاتا ہے۔ افروز نے سرگوشی کی۔

''تم لوگوں کی بھی بات؟'' اعجاز نے بات کاٹی۔''کبھی کبھی یہ معاملے کو سنگین بنانے کے لئے بھی ایسا کرتے ہیں۔''

''ایسی پیچیدہ صورتِ حال میں قیاس پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔'' شعار احمد بہت دیر کے بعد پھر بولا۔ شعار کی بات پر اعجاز ہنس دیا۔

پروفیسر شعار احمد! آپ اپنا فلسفہ اپنے پاس رکھیں؟

شعار چپ ہو گیا اور ادھر دیکھنے لگا جدھر دربان پھٹی کمبل میں لپٹا تھر تھرا رہا تھا۔

''مجھے جانا چاہئے۔'' رؤف پھر کھڑا ہو گیا۔

''مگر کیسے جاؤ گے؟''

''کسی بھی طرح جانا چاہیئے۔''

''یہاں سے اگر روانہ بھی ہو جاؤ تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ تم وہاں پہنچ پاؤ گے؟ افروز نے سوال کیا۔

''میرے خیال میں تو اس کی کوئی امید نہیں ہے۔'' اعجاز بولا۔

''مگر مجھے جانا چاہیئے۔'' رؤف ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا: ''میں تم لوگوں کی طرح مشترکہ خاندان کا حصہ نہیں ہوں، بچے گھر میں تنہا ہیں۔'' اتنا کہتے کہتے اچانک اسے شاید کچھ اور یاد آ گیا، وہ بالکل بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا، اس کا سانس دھنکی کی طرح چل رہا تھا، چہرہ تو اندھیرے میں نہیں دکھائی دے رہا تھا مگر سانس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ انتہائی گھبرایا ہوا تھا...... ''مجھے کسی بھی حال میں پہنچ جانا ہے۔''

''کیا بات ہے......اس طرح اچانک کیوں پریشان ہو گئے؟'' شعار نے پوچھا۔

میں گھر سے چلا تو بیوی مارکیٹنگ کے لئے نکل رہی تھی...... بچے گھر میں بالکل تنہا تھے۔''

''تم دو بجے کے قریب نکلے تھے......اب تک لوٹ نہ چکی ہوگی؟''

''سو تو ہے......لیکن نہ لوٹی تو؟''

تو......اس تو کا جواب کس کے پاس تھا؟......اس ''تو'' کا جواب کس کے پاس ہے؟

''یہاں تو کم از کم ہم محفوظ ہیں'' اعجاز بولا ''کہ اس وسیع میدان کے بارے میں کوئی سوچ نہ سکے گا۔ اور اس طرح رات گزار کر صبح کو اپنے گھروں تک پہنچا جا سکتا ہے لیکن یہاں سے نکل کر اگر کسی بھیڑ میں گھر گئے تب بھی......اور اگر جوانوں کے ہتھے چڑھ گئے تب بھی ہمیں اپنے گھروں تک پہنچنا نصیب نہیں ہوگا۔'' اعجاز کی اس دلیل پر رؤف نے بوکھلا کر اعجاز کو دیکھا۔ رؤف کے پاس اعجاز کی اس بات کا جواب نہیں تھا!

رؤف کھڑا رہا......رات نہ ایک پل ادھر ہٹی نہ ایک پل ادھر بڑھی...... پولیس کی گاڑیاں پارک کے چاروں طرف دوڑتی رہیں......دور پر آگ کے شعلے اٹھتے رہے اور رؤف سوچتا رہا کہ یہ سب کچھ سیٹی میں ہو رہا ہے، اور اس کا گھر سیٹی میں ہے اور گھر میں بچے اکیلے، اور وہ گھر پہنچنا چاہتا ہے......مگر وہ گھر جا نہیں سکتا!

''ایسے ہی حالات میں ہجرت واجب ہو جاتی ہے۔'' اعجاز بیٹھے بیٹھے آپ ہی آپ بد بدایا۔

''اب تم تاریخ کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔'' شعار احمد چپ نہ رہ سکا۔

''یار......اسے تم تاریخ کا پھٹا کہتے ہو......ارے یہ تو تاریخ کا چراغ ہے۔'' اعجاز کو غصہ آ گیا۔

''تم بھی کیا بات کرتے ہو پیارے؟ شعار بول اٹھا۔'' جان کے خوف سے بھاگ جانے کو تاریخ کا چراغ کہہ رہے ہو!''

''ارے ارے تمہارا دماغ خراب ہے؟ اعجاز غصے میں کھڑا ہو گیا۔ حضورؐ کے عمل کو تم جان کے خوف سے بھاگنا کہہ رہے ہو؟''

''تم اپنی اصلاح کرو''۔ شعار بہت آسان سے بولا۔ ''میں تمہارے عمل کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔

''اچھا مانا'' اعجاز نرم پڑا۔ ''تو کیا حضور کو جان کا خطرہ نہیں تھا؟''

''مگر حضورؐ نے جان کے خوف سے ہجرت نہیں کی تھی۔'' شعار زوردار لہجے میں بولا۔

''تو یہاں بھی صرف جان کے خوف کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔'' اعجاز نے شعار کی بات کاٹی۔ ''شریعت نرغے میں گھر چکی اور تم ابھی تک جان کے خوف کی بات کر رہے ہو؟

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنے لئے نہیں، شریعت کے لئے پناہ گاہ تلاش کرنی چاہئے۔''

''یہی کہہ لو۔''

''مگر ہجرت کا فلسفہ پناہ گاہ کی تلاش کا فلسفہ نہیں ہے۔''

''تب کیا ہے فلسفی صاحب؟'' اعجاز ہنسا، پھر موڈ میں آ گیا تھا۔

''ہجرت دراصل زرخیز زمینوں کی تلاش کا استعارہ ہے۔''

''خوبصورت الفاظ کی دوکان سجاتا ہے...... یہ ہمارا شعار احمد'' افروز نے رؤف کے کان میں سرگوشی کی اور ہنس دیا۔

''ارے یار .....تم لوگ کہاں کی بحث لے کر بیٹھ گئے ؟ادھر ناصر کا پتہ نہیں، ادھر ہنگامہ شروع ہو چکا اور تم لوگ فلسفہ کی دنیا میں گم ہو؟'' جنید جھلا گیا۔

''ناصر کو سارا پروگرام معلوم تھا؟'' شعار پھر اعجاز کی طرف متوجہ ہوا۔

''یار! وہ پروگرام کا معاملہ کچھ ایسا ہے کہ......'' اعجاز آدھی بات کہہ کر رک گیا

''ہاں ہاں......کیا معاملہ ہے پروگرام کا؟ شعار ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا۔

''جنید! تم ہی بتا دو یار، میرا اب دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔'' اعجاز جنید کی طرف مڑا۔

''یار مجھے بھی کیا پتہ؟ تم نے کہا چلو، میں ساتھ ہولیا۔'' جنید نے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''اچھا چھا تمہیں پتہ نہیں ...... ہاں تم تو بیچ راہ میں ملے تھے......افروز تم ہی بتا دو بھائی۔ میرا تو اب بولنے کو جی ہی نہیں چاہ رہا ہے۔''

''لو...... میں کون سا ابتداء سے انتہا تک کا، تمہارا رفیق ہوں، مجھے تو رؤف نے کھینچ لیا۔

''اور میرا معاملہ یہ ہے کہ...... رؤف پھیکی ہنسی ہنسا ...... جب جلوس میرے محلے سے گزر رہا تھا تو میری رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور میں ساتھ ہولیا......پھر جلوس ہی میں تم لوگوں سے ملا۔

......ہم سب لوگ گویا

راہ میں آن ملنے والے رفیقوں میں ہوئے ......تو اب لے دے کر اعجاز ......شعار احمد اُس کی طرف متوجہ ہوا......تم ہی بچ جاتے ہو۔!

شعار احمد کی اس بات پر سب نے ہنکاری بھری اور سب کی توجہ اعجاز کی طرف ہوئی......اعجاز بہت دیر تک ،سب سے بے خبر چپکا بیٹھا رہا، جانے کیا سوچتا رہا، پھر سر اٹھائے بغیر دھیمی آواز میں بولا۔'' ہاں میں جلوس کی شروعات ہی سے جلوس کے ساتھ ہوں مگر پروگرام کا تو سچ پوچھو تو مجھے بھی پتہ نہیں......بس اتنا علم ہے کہ منظور کو سب معلوم تھا۔''

اور منظور کے پاس بم کا اسٹاک تھا۔'' شعار احمد ہنسا۔

''مگر شعار احمد......'' افروز نے سوال کیا جلوس والوں کی طرف سے وہاں کوئی بم تو چلا نہیں؟

''اعجاز جانیں......بم کی بات انہی نے بتائی ہے۔''

''بم میں نے بھی دیکھا نہیں تھا۔'' اعجاز بولا۔ ''باتوں بات میں منظور بولا تھا کہ اگر آج ہم لوگوں کو روکا گیا تو بم مار دیا جائے گا۔''

''اور بس اتنی سی بات پر تم نے سمجھ لیا کہ اس کے پاس بم کا سٹاک ہے؟ شعار پھر جھلا گیا۔

''یار ناصر والی بات تو پھر رہ گئی۔'' افروز نے یاد دلایا۔

''مار سالے کو'' جنید کو غصہ آ گیا۔ سالا ہمیشہ یہی کرتا ہے، پچھلی مرتبہ کی بات یاد ہے نا؟ جنتر منتر میں جب ہم لوگ راستہ بھول گئے اس وقت بھی وہ ہم لوگوں کے ساتھ نہیں تھا......''

''مگر یار!'' افروز بولا۔ وہ بھی عجب حادثہ تھا، آج بھی یاد آ جاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ تو خدا بھلا کرے ڈاکٹر شرما کا ورنہ ہم لوگ تین کے بجائے تیس گھنٹہ بھی چکراتے رہتے تو شاید راستہ ملتا۔''

''اور وہ......اکیلے گم ہوا اور اکیلے ہی راستہ ڈھونڈ نکالا......

''ہمیں نجات کے لئے مسیحا چاہئے وہ اپنی صلیب خود اٹھاتا ہے۔'' شعار نے سرگوشیوں میں کہا۔''

دکھ سکھ مل کر سہنے سے کم ہو جاتا ہے یار'' جنید کہنے لگا۔ ایسے لوگ کتنے ہوں گے جو سب کچھ خود ہی سہن کر لیں۔''

''کم ہوتے ہیں مگر ہوتے تو ہیں......اور ہر دور میں ہوتے ہیں'' افروز نے کہا۔

''وہاں بھی اس نے یہی کہا۔'' افروز جنتر منتر سے شہید میموریل کی طرف مڑ چکا تھا...... ساتھ چلا اور پھر وہاں پہنچ کر آگے بڑھ گیا۔''

''پتہ نہیں صرف آگے بڑھنے والوں میں رہا یا مشتعل ہونے والوں میں شامل ہو گیا۔'' شعار نے جیسے خود سے پوچھا۔

''غلط الزام لگانا اچھی بات نہیں ہے۔'' اعجاز نے فوراً بات کاٹی، مشتعل صرف پولیس والے ہوئے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟'' افروز نے جوابی حملہ کیا۔تم تو ہمارے ساتھ سب سے پیچھے تھے۔''

''اور تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اعجاز کی بات غلط ہے، جب کہ تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ تم بھی پیچھے ہی تھے۔'' جنید ہنسا۔

''ہاں ایسے میں دوٹوک فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے۔شعار نے بیچ کی راہ نکالی۔

''مگر یار......ناصر؟ جنید کو پھر یاد آیا۔

''ناصر......ناصر......'' رؤف بلبلا کر پھر کھڑا ہو گیا۔ادھر پورا محلّہ جل رہا ہے اور تم لوگ بس ایک ناصر کی فکر میں گم ہو......''

سب چپ ہو گئے، رؤف سے سب کو ہمدردی تھی مگر جس صورت حال میں وہ گھرے ہوئے تھے اس صورت حال سے چھٹکارا پائے بغیر کچھ ممکن نہ تھا۔اور اس صورت حال سے نکل جانا۔رؤف سمیت سبھی اس نقطہ پر آ کر سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کی قوت کھو بیٹھتے۔رؤف کی اس بات پر بھی سب چپ ہو گئے کہ ایسی صورت حال میں چپ رہنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے؟ مگر خاموشی طاری ہوئی تو صورت حال کا بھیانک پن چمکا۔دسمبر کی سرد اندھیری رات...... کٹکٹاتا جاڑا......جسم کو برف بناتی سردی۔ ۸/بجے شب کا عمل۔سارے شہر میں کرفیو۔دور پر اٹھتے شعلے......گم شدہ یار کی فکر۔سامنے لائبریری کی دالان میں پھٹے پرانے کپڑوں میں لپٹا تھرتھراتا اور اونگھتا دربان ......اور چاروں اور جھوم جھم کر برستی برسات اور چیخ چیخ کر دوڑتی پولیس کی گاڑیاں......''

''یار یہاں تو اب جان نکل جائے گی......دالان میں کیوں نہ چلا جائے؟'' افروز نے تجویز رکھی۔

''ہاں کم از کم کھلے آسمان کی مصیبت سے بچا جا سکتا ہے۔'' جنید نے حامی بھری۔

''نہیں، ایسی صورت حال میں کسی بھی اجنبی کا سامنا مناسب نہیں۔'' شعار نے اختلاف کیا......

پہلی مرتبہ ایک اچھی اور صحیح بات تم نے کہی ہے۔'' اعجاز ہنسا

......رؤف اپنے آپ میں گم تھا......

پڑوسیوں سے تمہارے تعلقات کیسے ہیں؟'' شعار نے رؤف کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھا......

تعلقات کا کیا پوچھتے ہو، بہت اچھے تعلقات ہیں، مگر ایسے وقتوں میں تعلقات بے معنی بھی تو ہو جاتے ہیں اور پھر مانا کہ پڑوسیوں کی طرف سے کوئی بات نہ ہو، سارا محلّہ اگر بدنیت ہو جائے تو پڑوسی کیا کرلیں گے۔اور اگر سارا محلّہ بھی ٹھیک رہے مگر باہر سے بلوائی آ جائیں تو محلے والے کیا کرسکیں گے؟

''نہیں، بہت سی ایسی مثالیں ہیں کہ پڑوسیوں اور محلے والوں نے جان پر کھیل کر مظلوموں کی جانیں بچائی ہیں۔'' جنید بولا''۔

یہ سب کہنے کی باتیں ہیں یار''۔رؤف پھیکی ہنسی ہنسا......

مگر تم نے یہ کیسے طے کرلیا کہ سب کچھ تمہاری ہی سمت ہو رہا ہے؟'' شعار نے پوچھا......

کیوں؟ یہ تم نے کیوں کہا؟ جنید چانکا۔

اس لئے کہ آگ دور پر دکھائی دے رہی ہے اور پھیلی ہوئی ہے، ایسے میں سمت کا اندازہ ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ کہ آگ پورب میں نہیں لگی ہے۔'' جنید قدرے بے چین ہو گیا۔

''ہاں یہ تو صحیح کہہ رہا ہے شعار۔آگ کا رخ تو قدرے جنوب بھی ہے۔افروز بولا۔

''ارے......تو جنوب میں تو میرا گھر ہے۔'' جنید تڑپ اٹھا۔

''نہیں میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔'' شعار نے بات سنبھالنی چاہی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔اب رؤف اور جنید دونوں کے دلوں میں شک نے گھر پکڑا کہ آگ ان کی سمت میں لگی ہے! دونوں مخمصے میں گرفتار ہوئے ......اور ناصر کے معاملے میں سب ہی مخمصے میں گھرے ہوئے تھے کہ آخر اب تک وہ آیا کیوں نہیں۔

''یار ناصر کے معاملے میں ہم لوگ ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔'' افروز کو پھر ناصر یاد آیا۔

''کیا مطلب؟ اعجاز چونکا؟''

''مطلب یہ کہ......افروز نے کہنا شروع کیا......ہم ناصر کے بارے میں تشویش میں مبتلا ضرور ہیں مگر اس بات پر اب تک غور نہیں کیا کہ ناصر واقعی کسی مصیبت میں گرفتار ہوا، یا وہ کسی اور سمت نکل گیا۔''

''اب تم نے یہ ایک نیا پہلو پیدا کیا؟ اعجاز جھنجھلا گیا۔ اتنی بات تو صاف ہے کہ ناصر آگے بڑھ گیا تھا، اور آگے والے اسمبلی تک پہنچ کر میمورنڈم خود وزیر اعلیٰ کے حوالے کرنا چاہ رہے تھے یہ بھی طے ہے...... پولیس اپنی ضد پر اڑی رہی اور مظاہرین اپنی بات پر ڈٹے رہے، یہ بھی آنکھوں دیکھی بات ہے، جب پولیس مظاہرین سے اپنی بات منوانہ سکی تو اس نے پہلو آنسو گیس چھوڑی اور پھر گولی چلا دی، اس کی گواہی بھی یہاں موجود ہر شخص دے سکتا ہے۔ پیچھے والے بھاگے، یہ بھی سب نے دیکھا...... مگر آگے والوں کو بھاگنے کا بھی موقع کہاں ملا؟ اور ناصر آگے تھا۔ پھر وہ کسی اور سمت کیسے نکل سکا ہوگا؟......

''مگر ناصر کس مقام پر ہم لوگوں سے الگ ہوا؟'' شعار نے پوچھا۔

''ایں...... یہ کیا بات ہوئی؟ اعجاز چونکا۔

''یہی نہیں۔'' جنید بولا، ''سوال یہ بھی ہے کہ وہ کس مقام سے ہمارا رفیق ہوا؟''

''ارے ارے؟ اعجاز نے بوکھلا کر جنید کی طرف دیکھا۔

''بالکل صحیح سوال ہے۔'' افروز بولا ......جلوس جہاں سے شروع ہوا، وہاں سے تم ساتھ تھے پھر راہ میں جنید، رؤف، شعار اور میں سبھی ساتھ ہوئے......مگر وہ کہاں سے ساتھ ہوا؟ یہ کسے یاد ہے؟''

''مجھے بھی بس اتنا یاد ہے'' جنید نے حامی بھری کہ شہید میموریل کے پاس جہاں مقررین نے تقریریں کی تھیں، اور جہاں پولیس والوں نے ہمیں روکنے کی کوشش کی تھی، وہاں ناصر بار بار نعرے لگا رہا تھا'' ......مگر اس سے پہلے وہ کہاں کہاں ہمارے ساتھ تھا؟ اور کس مقام پر ہم سے الگ ہوا؟ شعار نے خود کلامی کی ،سب چپ رہے، کسی کو اس سے پہلے کی رفاقت اور آخری جدائی کا کوئی منظر یاد نہیں آ رہا تھا۔

''یارو! ہم بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔'' جنید کی آواز میں کراہ شامل تھی۔

''کیسی مصیبت؟'' اعجاز ہنوز انجان بنا ہوا تھا۔

''اب ایک سوال اور سر اٹھا رہا ہے......وہ جو اچھل اچھل کر نعرے لگا رہا تھا، وہ ناصر ہی تھا ؟اس کا کیا ثبوت ہے؟''

''لو......لو...... اب یہ کیا فساد تیرے ذہن میں آیا مسٹنڈے ؟اعجاز بوکھلا کر کھڑا ہو گیا ۔شعار ہنسا،افروز مسکرایا،جنید نے سر ہلایا......اور اعجاز ناچ ناچ گیا۔

یہ سوال کیوں اٹھا کہ وہ ناصر نہیں تھا۔اعجاز کا لہجہ اب بہت تیکھا ہو گیا تھا۔

''اس لئے کہ یہاں سبھی اس بات پر متفق ہیں کہ ناصر آگے بڑھ چکا تھا تو پھر پیچھے سے نعرہ لگانے والا کون تھا؟'' افروز نے کہا۔

''اور جنید کا کہنا ہے کہ وہ ہمارے پاس نعرہ لگا رہا تھا تو پھر آگے بڑھ جانے والا کون تھا ؟'' شعار احمد نے پوچھا۔

''نعرہ لگانے والا ناصر نہیں،آگے بڑھنے ولا بھی ناصر نہیں تو پھر ناصر کون تھا؟'' اعجاز جھنجھلا گیا۔

''یہ تم بتاؤ گے اعجاز صاحب !'' افروز بہت ہی تیکھے لہجے میں بولا کیوں کہ وہ تم ہی تھے جو ہمیں اشارہ کر کے یہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنا ناصر نعرے لگا رہا ہے ۔ وہ آگے بڑھ رہا ہے ......سنو سنو! پولیس سے بحث کر رہا ہے......''

''اور تم سب کی کوئی یاری ناصر سے نہیں تھی ؟اعجاز دانت کچکچا کر بولا۔

''مگر وہ ناصر ہمیں ملا کہاں جانی ؟'' رؤف بھی چپ نہ رہ سکا اور جھنجھلا کر بولا۔

''بس اب تو خدا ہی حافظ ہے......شعار نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا......دسمبر کی کٹکٹاتی سردیاں ......ہم کھلے میدان میں......سامنے دالان موجود وہاں جا نہیں سکتے ...... چاروں طرف کرفیو براجمان سو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے......شہر میں گڑ بڑ مگر کدھر، پتہ نہیں......آگ کے شعلے روشن مگر یہ کہنا مشکل کہ آگ کس طرف لگی ہے......ناصر کا انتظار مگر یہ پتہ نہیں کہ یہ ناصر کون ہے؟ کب ملا؟ کب جدا ہوا اور ہمیں اس کا انتظار کیوں ہے؟''

سب نے شعار احمد کی بات سنی اور سبھی کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے بے تاب ہوئے مگر کہہ نہ سکے ...... ''

''بس اعجاز اندر اندر تلملا رہا تھا مگر پتہ نہیں کس بات پر تلملا رہا تھا!

☆☆☆

کربلا

چاروں طرف ہُو کا عالم ہے-------

دُکانیں سرِ شام بند ہوچکی ہیں، رات کا پہلا پہر ہے مگر ایسا سناٹا ہے کہ اگر ایک کنکر بھی گر جائے تو شاید ''چھن'' کی آواز سے پورا علاقہ گونج اٹھے، ماؤں نے بچوں کو سویرے سویرے کھلا کر زبردستی سلا دیا ہے۔ گاہے گاہے کسی گھر سے بکری کے ممیانے یا گائے کے ڈکارنے کی آواز آتی ہے------اور بس!------

سڑکوں نے شاید ایسا سناٹا مدتوں سے نہیں دیکھا ہوگا، صرف کبھی کبھی وین آکر رکتی ہے تو اس کے آنے، رکنے یا دوبارہ اسٹارٹ ہونے سے فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا ہے ------یا پھر بوٹوں کی ٹاپ گونجتی ہے------ٹاپ---ٹاپ---اور سروں پر ''خود'' پہنے اور پشت پر لکڑیوں کی ڈھال رکھے نوجوان چارسیل کی ٹارچ جلاتے ہیں، اور تاریکی کا سینہ چیرتے ہوئے ٹارچ کا فوکس رات کی ہیبت ناکیوں میں اور اضافہ کر دیتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹارچ نہیں جلا بلکہ گھنے سیاہ جنگلوں میں اگیا بیتال اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اپنا شکار ڈھونڈھ رہا ہے۔ اور اپنے اپنے گھروں میں محصور لوگ یوں سہم جاتے ہیں جیسے چمبل گھاٹی میں کسی تنہا مسافر کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا ہو، یا بھیانک جنگل کی خوفناک اندھیری رات میں کوئی بھولا بھٹکا راہی کسی چھلی پیری کے نرغے میں آگیا ہو------''

ہر گھر کا دروازہ بند ہے لیکن شاید نیند سب کی آنکھوں سے چھن چکی ہے، سڑک کے کنارے جو مکانات ہیں، ان کے مکین اور زیادہ بے چین ہیں جب ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو یوں چونک اٹھتے ہیں جیسے آسمان سے بجلی اب تک کراہی کو نشانہ بنانے والی ہے، البتہ سڑک سے ذرا دور پر جو محلے بسے ہوئے ہیں، وہاں یہاں سے ذرا کچھ مختلف صورت حال ہے کہ وہ اپنے دریچوں اور بالا

ریزوں سے کم از کم حالات کا اندازہ لگا پاتے ہیں، مگر جیسے ہی ٹارچ کی روشنی ان محلوں کی طرف مڑتی ہے اور بوٹوں کی ٹاپ کا رخ ادھر ہوتا ہے وہ جلدی جلدی سب کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے کواڑوں اور کھڑکیوں کی جھریوں سے جھانکنے لگتے ہیں۔ اور جو سڑک سے بہت دور پر بسنے والے محلے ہیں، وہاں محلے کی چوک پر یا کسی درگاہ کے اردگرد کچھ شریف صورت نوجوان بیڑی اور سگریٹ پیتے ہیں، اور ہر دوسرے لمحے چوکنا ہو ہو کر اندازہ لگاتے ہیں کہ قدموں کی چاپ کدھر سے آئی اور جیسے ہی ٹارچ کی روشنیاں گلیوں کی طرف مڑتی ہیں اور بوٹوں کی ٹاپ ہوا کے دوش پر تیرتی ان کے کانوں کے قریب آ کر ٹھہرتی ہے، وہ بھر بھرا کر متعینہ اڈوں کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور دروازے بند ہو جاتے ہیں، کھڑکیاں لگا دی جاتی ہیں، سہمے ہوئے زرد چہرے کسی بھی آنے والے حادثے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، اور وہ جو ابھی ابھی نوجوان ہوئے ہیں، گاہے خوف زدہ ہوتے ہیں، گاہے غصے سے اپنے دانت کاٹتے ہیں اور بزرگ انہیں سمجھاتے ہیں، ڈانٹتے ہیں اور کسی کسی طرح انہیں ٹھنڈا کرتے ہیں۔

کئی دنوں سے مسلسل یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور اس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں ہے، دن افواہوں میں گزرتا ہے، یا گھر سے باہر نکلنے کے جو اوقات مقرر کیے گئے ہیں ان میں جلدی جلدی سودا سلف لانے میں ------ اور رات ---- بھیانک رات دہشتوں اور خوفناکیوں کی سفیر بن کر آتی ہے، چاروں طرف مہیب سناٹے رینگتے ہیں، اور وین، بوٹوں کی ٹاپ، ٹارچ کی روشنی اور ناسمجھ بچوں کے نیند میں ڈر کر رونے کے علاوہ کبھی کوئی گدھا رینکنے لگتا ہے، یا بیک وقت ڈھیر سارے کتے بھونکنے لگتے ہیں---- گدھے کے رینکنے پر شاید دو چار زندہ دل مسکرا دیتے ہوں، مگر کتوں کے بھونکنے پر ایک ایک فرد چوکنا ہو جاتا ہے اور بھونکتے ہوئے کتے جدھر جدھر بھاگتے ہیں ادھر ادھر بے چینی اور خوف بھی دوگنا ہو کر قلانچیں بھرتا پہنچ جاتا ہے، اور جب صرف بھونکتے ہوئے کتے بھاگتے ہوئے گزر جاتے ہیں تو یہ سوچ کر اطمینان کی سانس لی جاتی ہے، اور ماتھے کا پسینہ پونچھا جاتا ہے کہ ''جوانوں نے بھگایا ہوگا۔''

میں مسلسل کئی دنوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا ہوں اور برداشت کر رہا ہوں۔ گزرے ہوئے ان چند ایام میں، میں کس کس طرح سے ٹوٹا ہوں، تڑپا ہوں اور کھنڈر بنا ہوں اس کا حساب کس

کو دوں؟ یہ خسارہ کون پورا کرے گا؟ میں اس سارے گندہ، بے ہودہ، ذلیل اور بد بو سے بھبھکتے ہوئے تسلسل میں کہاں تک شامل ہوں؟ اور کہاں سے الگ ہوتا ہوں؟ جو کچھ ہوا، جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا میرا حصہ اس میں کتنا ہے؟ میں ایک کمزور دل کا آدمی ------ جو رقت طاری ہونے پر دو چار غزلیں کہہ کر دل کا غبار نکال لیتا ہے---- میں اس کی توسیع یا تخفیف میں کتنے کا حصہ دار ہوں؟

میں مسلسل کئی دنوں سے یہ سب کچھ سوچ رہا ہوں اور چپ ہوں لیکن اندر ہی اندر درد کی جو تیز اور زہریلی اَنی مجھے کاٹتی اور ذبح کرتی گذرتی چلی جا رہی ہے وہ میرے لئے سرمد کی کٹی گردن کے عروج سے زیادہ تکلیف دہ ہے، کیوں کہ یہاں تو مرشد یا مسترشد کسی کو بھی کوئی روکنے والا نہیں ہے بس ایک گندہ ذلیل ،بجبجاتے مواد جیسا لس دار ،بدبودار اور گھناؤنا تسلسل -----اور یہ تسلسل دوسروں سے زیادہ میرے لیے بے نیام ،چم چم کرتی ،سر پر لٹکتی تلوار کہ دوسروں پر صرف ظاہر کا گھناؤنا پن عیاں ہے ۔مگر میں تو وہ مرغ ہوں جس کی آدھی گردن کاٹ کر چھوڑ دی گئی ہے،اور وہ آدھی گردن لیے سارے میں دوڑ رہا ہے۔

ملفوظاتِ خواجگانِ چشت میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ نے غریب نواز حضرت معین الدین چشتی کی انگلی پکڑ کر فرمایا:...... ''اے فرزند دیکھ'' ......اور حضرت نے دیکھا کہ یک لخت اٹھارہ ہزار عالموں پر سے پردے اُٹھ گئے اور یہ ساری کائنات حضور کے سامنے شیشے کی طرح جگ مگ جگ مگ کرنے لگی ،اور جب حضور حضرت غریب نواز نے تمام عالموں کا معائنہ فرما لیا تو حضرت خواجہ عثمان ہرونیؒ نے اپنے فرزند معنوی کو اس وسعتِ معنوی سے قلتِ ظاہری کی طرف کھینچ لیا......لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے وجود میں چھپا میرا مرشد مجھے نئے جہانوں کے دروازوں تک چھوڑ کر خود واپس ہو جاتا ہے اور میری راہ گم ہو جاتی ہے۔

مسلسل کئی دنوں سے یہ ہو رہا ہے،سورج ڈوبنے سے سورج نکلنے تک گھروں کے دروازے بند ہونے سے گھروں کے دروازے کھلنے تک......سرگوشیوں میں باتیں ہوتی ہیں، دیواروں سے کان لگا کر باہر پیدا ہونے والی تیز اور مدھم چاپ کی نیتوں کا تعین کیا جاتا ہے اور کواڑوں کے شگافوں سے جھانک جھانک کر یہ اطمینان کیا جاتا ہے کہ بوٹوں کی چاپ کے پیچھے دبے قدموں چلنے والے تو نہیں ہیں......

اور جب یہ سب کچھ گزر جاتا ہے اور اطمینان ہو جاتا ہے تو پھر نہلے پر دہلے کی چوٹ پڑنے لگتی ہے، بادشاہ پیدل سے مات کھاتا ہے اور کوئن ڈراپ ہو کر بھی واپس آ جاتی ہے کیوں کہ سفید یا سیاہ ،کوئی گوٹی اسٹرئیکر کے نشانے پر ٹھیک نہیں بیٹھتی ...... اور جب یہ سب کچھ گزر جاتا ہے تو میرے سینے پر سے ایک ریل گاڑی گذرتی ہے...... چھک چھک ...... چھک چھک ......اور گزرتی چلی جاتی ہے ......اور ذبح ہوتا ہوا کوئی کبوتر مجھ سے آنکھیں لڑاتا ہوا چیختا ہے ......غڑغوں ...... غڑغوں ......اور گولی کھایا ہوا کوئی پپیہا درد بھری آواز میں پوچھتا ہے پی کہاں ...... پی کہاں ......''

اور یہ سب کچھ گزر کر، گزر نہیں جاتا ہے ......ٹھہر جاتا ہے ...... میرے سینے پر...... بالکل وہاں ...... جہاں سے آواز ابھرتی ہے...... دھک دھک دھک دھک ......تو ایسے میں آہستہ سے اٹھ کر ادھر آ جاتا ہوں، جدھر میرے ہنر مند دوست اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔

یاروں نے اسے لیبوریٹری کا نام دے رکھا......''

''پروفیسر صاحب! یہ دیکھیے۔'' ایک ہنر مند مجھے اپنے ہنر کا نمونہ پیش کرتا ہے...... یہ سو آدمی کے لیے بہت کافی ہے،اس کے لیے گرنا شرط نہیں ہے،صرف ہاتھ سے الگ ہو جانا چاہئے۔

دوسرا ہنر مند مجھے متوجہ کرتا ہے......اور یہ، یہ ستر گز تک مار کر سکتا ہے۔سر! اس کی گولی پہلے سیدھے جاتی ہے، پھر جسم کو چھوتے ہی چرخی کی طرح گھوم جاتی ہے، ایک مرتبہ ہم لوگوں نے اس سے ایک نیل گائے ماری تھی ......سر! گولی تو پیٹ میں لگی تھی اور اوپر میں بس ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آ رہا تھا مگر پیٹ کھولنے کے بعد پتہ چلا کے اندر سے وہ حصہ اس طرح چھلنی ہو گیا تھا کہ دل ،گردہ، کلیجی سب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تباہ ہو چکا تھا......اور یہ سر......اور یہ پروفیسر صاحب......اور یہ بھائی صاحب......''

اور اسی لمحہ میرے وجود میں چھپے میرے مرشد نے میری انگلی پکڑی اور حکم دیا۔''فرزند! ادھر بھی دیکھ!'' ......اور فرزند نے ادھر نگاہ کی تو ادھر بھی ایسا ہی منظر درپیش تھا......''

''بندھو پیسوں کی چنتا مت کرو......'' مستری کو سمجھایا جا رہا تھا۔''بس مال ایسا ہو کہ چھیتر کا چھیتر ملیامیٹ کر دے......''

’’شریمان آپ نشچنت رہیں، کیول یہی پانچ سات سو کے لئے کافی ہے۔‘‘

’’خواجہ مجھے واپس لے چلو...... خواجہ مجھے واپس لے چلو......‘‘ میں چیخ رہا ہوں، اور مرشد دروازے تک پہنچا کر خود واپس ہو چکا ہے اور میری راہ گم ہے---اور سینے پر ہزار بوٹوں کی ٹاپ گونج رہی ہے---ٹاپ ٹاپ---ٹاپ---‘‘ اور میرے چاروں طرف سناٹا ہے اور تاریکی!

ابھی ابھی نیچے کنارے کی طرف بنے ہوئے کمرے میں میری بیٹی روتے روتے سوگئی ہے، کل سے اس کا دودھ ختم ہوگیا ہے، اب صرف فیرکس بچ گیا ہے یا دال بھات----ان ہی چند دنوں میں اسی دال بھات سے اس کی نمک چشی بھی ہوئی مگر چونکہ دودھ کی عادت چھوٹ نہیں سکی ہے، اس لئے بار بار رورو کر اٹھتی ہے اور اٹھ اٹھ کر روتی ہے اور اس کے رونے ہی کے ڈر سے اسے نچلے حصے میں منتقل کرنا پڑا تا کہ آواز باہر نہ جائے ورنہ بڑوں کے جاگتے رہنے سے شکوک و شبہات سر اٹھا سکتے ہیں۔ اور دروازہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔

’’ہالٹ......!‘‘ سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک تیز آواز کی گونج۔

’’فائر............ٹھائیں............آہ آہ..................‘‘

’’اللہ......اللہ......میں سینہ پکڑے تڑپ رہا ہوں......‘‘ اللہ کیسا تڑپا ہوگا؟ کیا گزری ہوگی؟‘‘

’’خدا کرے ہم میں سے نہ ہو......‘‘ ایک دوست دعا کرتا ہے۔

اور تب ایسے میں یاد آتا ہے کہ ’’فوائد الفواد‘‘ کا مطالعہ کرتے ہوئے جب تزکیہ نفس کے بارے میں پڑھ رہا تھا تو ایک سوال نے سر اٹھایا کہ ’’جب وجود کی وحدت ہے تو غیر کون ہے؟‘‘

غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟......‘‘

جواب دھند میں گم ......اور میں ذات اور غیر ذات کے دھندلکوں میں گھرا......ایک مجبور فرد!......

ایک مجبور فرد......جس کا مقدر تماشا ہے......

حادثہ پہلے دن ہوا......

میرے نقطۂ نظر سے وجود کی وحدت تھی مگر قلتِ ظاہری نے وسعت معنوی کے احساس

کوتھپک تھپک کر سلا دیا......اور تب یوں ہوا کہ ڈرے اور سہمے ہوئے لوگ یک جا ہوئے کہ حفاظت کی کچھ سبیل نکالی جائے ،مگر رستوں کی تلاش پتھر بن کر برسی اور بجلی بن کر چمکی ......اور بیڑی بنانے والا غریب عبدالجبار صرف نظر اٹھا کر اتنا دیکھ سکا کہ ٹارچ اس کے سر پر کس نے جلائی اور پھر چھتیس گھنٹوں بعد پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں لکھا گیا کہ ''مقتول کے لئے رائفل سے نکلی ہوئی صرف ایک گولی کافی تھی۔''

تو مرنے والے کی نماز جنازہ میں سارا شہر امنڈ پڑا کہ مرحوم شہادت کے درجے پر فائز ہوا تھا اور شہید کی نماز جنازہ میں شرکت ثواب دارین کا باعث ہے......اور جب سارا شہر شہید ملت کے جنازے کے ساتھ قبرستان چلا گیا تو میں چپکے سے اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا......گھر کے اندر سے بیوہ کے سسکنے کی آوازیں آرہی تھیں ، اور ایک بچہ رو رو کر کہہ رہا تھا......اماں بھوک لگی ہے ، بھات دو۔''اور دوسرا اسے سمجھا رہا تھا ''بابو چپ ہوجا''اماں کہاں سے کھانا دے گی ، باوا شام میں اناج لے کر آئیں گے'' تب تو کھانا پکے گا۔''اور تیسرا پوچھ رہا تھا''اماں اماں باوا کو لوگ چرپائی پر لٹا کر کہاں لے گئے ہیں؟''......اور چوتھا جو سب سے بڑا تھا وہ اسے سمجھا رہا تھا......ہم لوگ کے باوا شہید ہوگئے ہیں!''......اور تب میں دروازے ہی سے لوٹ آیا۔

اور اس دن سے ایک سمندری طوفان بار بار میرے وجود کی جڑیں اکھاڑنے کے درپۓ ہے ،اور میں طوفان میں گھرا ، جڑ سے اکھڑا ، وہ درخت ہوں جو اپنے جنگل سے اڑ کر اور بھٹک کر کسی گہری کھائی میں گرنے کے عمل میں بتدریج مصروف ہے......اوپر آسمان......دائیں بائیں دورویہ پہاڑ......اور نیچے تا حدِ نظر گرتا ہوا اپنا وجود اپنی ہی آنکھوں سے گر گیا......'''

کاش یہ سب کچھ نہ دیکھا ہوتا......کاش! یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے نہ ہوا ہوتا!...... کتنے اطمینان سے چلا آرہا تھا...... پتہ نہیں مل کے آرہا تھا، یا ملنے جارہا تھا......مگر تھا بڑی موج میں ...... جب کوئی بھی تمہارا ہر دیۓ توڑ دے......تب تم میرے پاس آنا پریۓ ...... جب کوئی بھی تمہارا ہر دیۓ توڑ دے...... جب کوئی بھی......

''ارے ارے ......ارے یہ کیا کر رہے ہو......ارے بھیا...... بچاؤ...... بچا...... بب

......بغ......اوغ......اوغ......''

دھیرے دھیرے آنکھیں بند ہوتی گئیں......مسافر کو رستے میں شام آ گئی۔

کٹی ہوئی گردن کنارے پڑی تھی......بے سر کا جسم کچھ دیر تڑپا پھر ٹھنڈا ہو گیا......گڈھا جب تک کھودا نہیں جا چکا، چاروں طرف سخت پہرہ پڑتا رہا، پھر جب اسے اٹھا کر گڈھے میں ڈالا جانے لگا تو مرشد نے سوال کیا۔

''فرزند بتا غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟'' میں کیا جواب دیتا؟ آہستہ سے رام نام ستیہ ہے......رام نام ستیہ ہے، بدبداتا ہوا گڈھے کی طرف بڑھا، اور ایک ہنرمند سے صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا کہ ''بھائی اسے قبلہ رُو ہی رہنے دو'' کہ چوطرفہ خون آشام آنکھوں کے حصار نے ایک ہی جملہ دہرایا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' تو اب میں انہیں مطلب کیا بتاتا کہ انہیں تو غالبؔ بھی فلم ''غالبؔ'' کی غزل......''یہ نہ تھی ہماری قسمت......'' کی وجہ سے یاد ہوگا......بھلا وہ۔ ''وفاداری بہ شرطِ استواری'' والے غالبؔ کو کہاں سے جانتے!

تو میں وہاں سے چپکے کھسک گیا، مگر آگے کی منزلوں میں مرشد بار بار سوال کرتا رہا ''فرزند بتا! غیر کہاں ہے؟'' اور میرے سارے وجود میں ایک قیامت خیز زلزلہ سر مارتا رہا، اور گھر پہنچتے پہنچتے خبر مل گئی کہ ''سورج ڈوبنے سے سورج نکلنے تک اب کوئی باہر نہیں نکلے گا۔''......اور ہنرمند دوست مطمئن تھے کہ بدلہ لے لیا گیا۔

اور اب ہر رات یہ ہوتا ہے کہ سرِ شام گھروں کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور گلی میں ابھرنے والی چاپ کا اندازہ دیوار سے کان لگا کر کیا جاتا ہے اور بوٹوں کی ٹاپ ہر گھر کے دروازے پر ٹھہرتی ہے اور میرے سینے کو روندکر گزر جاتی ہے......اور گلیوں میں بوٹوں کی ٹاپ سے پہلے، بعد میں، اور ساتھ، کوئی بال بکھرائے، چہرے پر بھبھوت ملے، خون میں لہولہان، گاہے روتا اور گاہے قہقہہ لگاتا گزرتا ہے...... اور نوجوان اندھیری گلیوں میں دس سیل کا ٹارچ روشن کرتے ہیں، اور سپاہی آواز لگاتا ہے...... جاگتے رہو......اور دروازے کی جھریوں سے خوف میں ڈوبے چہرے آنے والے حادثے کے خوف سے کانپتے رہتے ہیں......''

اور پھر جب یہ سب کچھ گزر جاتا ہے تو نہلے پر دہلے کی چوٹ پڑنے لگتی ہے۔

اور گریہ اور قہقہے کی یہ ساعت میرا مقدر ہے۔ کیوں کہ میں نے اپنے وجود میں ایک مرشد کی بلا پال رکھی ہے جو نئے جہانوں کے دروازوں تک مجھے پہنچا کر خود واپس ہو جاتا ہے اور میری راہ گم ہو جاتی ہے...... جب کہ دوسروں کے لیے یہ اور اس جیسے بہت سارے دوسرے وقوعات یا تو وقتی حادثے ہیں یا سیاسی سازش، یا قومی مسئلہ۔

اور تب ایک ایسی ہی بلا خیز شب میں دروازے پر دستک ہوئی اور خوف سے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں، میری بیوی مجھ سے لپٹ کر رونے لگی،'' آپ کو کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گی؟''...... اماں نے مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو یوں اپنی آغوش چھپایا جیسے ہم دونوں مرغی کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہوں، جن پر چیل کے جھپٹّے (اچانک حملہ) کے خوف سے مرغی اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے......''

جب کئی دستک کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہیں دیا گیا تو باہر سے آواز آئی ......
کھولو بھائی...... میں ہوں ذکی......

میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا'' اس خطرناک رات میں آپ کہاں ذکی بھائی ؟......''

تو ذکی بھائی نے شعر پڑھا۔

چراغوں کی لو سے ستاروں کی ضو تک
وہاں میں ملوں گا جہاں رات ہو گی

میں نے ہنس کر کہا۔'' کیوں ذکی بھائی، یہاں جان پر بنی ہوئی ہے، اور آپ کو شعر یاد آ رہا ہے؟''

تو ذکی بھائی ذرا سا کبیدہ ہو گئے اور سنجیدگی سے کہا'' میاں میں نے تو بادۂ و ساغر کا سہارا لیا کہ جب جبر کار فرما ہو تو دوٹوک لہجے میں کچھ کہنا ذرا مشکل ہوتا ہے، ورنہ حقیقت تو یہی ہے کہ میں ہر خطرناک رات میں تمہارے ساتھ رہا ہوں...... مگر تم بھول جاؤ تو یہ الگ سی بات ہے--!''

''کہاں کہاں ذکی بھائی ۔ذرا بتائیے تو؟'' میں نے پھر ہنس کر کہا تو ذکی بھائی خفا ہو کر کہنے لگے:

اب گن کر تو نہیں رکھا مگر اس وقت بھی جب ٹونک سے چل کر رنتھمبور میں رات ہو گئی تھی، اور تم لوگ راستہ بھول گئے تھے......اور اس وقت بھی جب تمہارا گھر جل رہا تھا......اور اس وقت بھی جب ہٹیا میں تمہاری باجی شمیمہ جلتے ہوئے مکان کی کھڑکی سے بار بار جھانک کر دیکھ رہی تھیں، اور بے تابانہ تمہارا انتظار رہی تھیں، اور تم پہنچے نہیں پہنچ رہے تھے......اور اس وقت بھی جب جامع مسجد میں اللہ کی ذات تھی......''

اور تب میں نے انہیں جان لیا اور آہستہ سے پوچھا'' ذکی بھائی !اتنا دور دیس کا سفر کرنے کے بعد بھی آپ یہ فیصلہ نہیں کرائے کہ آپ کو صرف ہنسنا چاہیئے یا صرف رونا چاہیئے ......؟ تو ذکی بھائی یوں کھڑے ہو گئے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا:

''اتنا تیز مت بھاگو افسانہ نگار، ورنہ میرا ولی عہد بننا ہوگا''

میں نے ہنس کر کہا''عمل میں تو ممکن ہے لیکن اظہار میں بندے کو انکار ہے......تو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ذرا سا رُکے اور مڑ کر کہا......

''قہقہہ قہقہہ اور گریہ گریہ میں فرق کرنا جانو برادر......''!

اور ابا جب تیزی سے انہیں روکنے کے لیے بڑھے تو میں نے انہیں روک دیا۔'' انہیں جانے دیجئے ،ان کو کچھ نہیں ہوگا ......''ابا حیرت سے کہنے لگے ۔عجب آدمی ہو، ایسے حالات میں کہتے ہو کچھ نہیں ہوگا، جب کہ ایسے حالات میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے......کیا باہر گھومنے والے جوانوں سے ان کا کوئی تعلق ہے......؟''

''نہیں ! یہ تو......''میں کہتے کہتے رُک گیا اور ابا بھی چپ ہو گئے۔

بوٹوں کی ٹاپ پھر گونجنے لگی تھی ۔اور اسی کے ساتھ ساتھ کسی کے رونے اور قہقہہ لگانے کی آواز سنائی دی۔

اور مرشد نے پھر سوال کیا''فرزند بتا غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟''

اور تب اسی لمحہ ایک روایت یاد آئی جو بہت مشہور ہے کہ دیوان صاحب کے عرس میں بہت دنوں قبل دور دور سے وجودی فقراء تشریف لاتے تھے، ایک سال شہر کے ایک رئیس کو جو تصوف کا قائل نہیں تھا۔ مذاق سوجھا، اور ایک خوان ورقِ نقرہ سے سجا فقیروں کی خدمت میں بھیجا ۔اور جب فقراء نے غلاف اٹھایا تو ورقِ نقرہ پر ایک پُرزہ رکھا نظر آیا جس پر لکھا تھا۔'' جب وجود کی وحدت ہے تو مرغ مسلم اور غلیظ میں کیا فرق ؟ ''اور جب خوان کو ہاتھ لگایا تو معلوم ہوا کہ پورا خوان غلیظ سے لباب تھا۔ فقراء غصے سے سرخ ہوگئے ،سب بیک وقت تالاب میں کود ے، خنزیر بن کر نکلے اور سارا خون ہضم کر گئے۔

لیکن اب وہی تالاب جو کبھی فقراء کی کرامتوں کے صدور کا منبع اور مخرج تھا، بھولے بھٹکے ، بے جسم کے سروں اور بے سر کے جسموں کا خزانہ ہے اور یہاں میں ہوں اور میرے اِرد گرد بجبجا تے زخموں کی تمثیل ......ابھی ابھی میرے پڑوسی نے دیوار کے پاس آ کر اپنے بیمار بچے کے لیے کوئی دوا مانگی ہے، ان کے بچے کو ایک سو تین ڈگری بخار ہے، ڈاکٹر بلانے کی ضرورت ہے مگر کون ڈاکٹر بلائے گا اور کون ڈاکٹر آئے گا...... مسیحائی کا ہر عمل لنجُ ہو چکا ہے۔ اور قاتلوں کا گھیرا دن بدن تنگ ہوتا جا رہا ہے۔'' خار پشت'' کے کتے'' اور سیار ایک مرتبہ پھر آدمیوں کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتے جا رہے ہیں، اور سارے شاعر اور افسانہ نگار بند دروازوں کے شگافوں سے اس سارے نج بج کرتے تسلسل کے خاموش تماشائی ہیں...... یہ وہ کربلا ہے جس میں نہ فرات پر پہرہ بیٹھا ہے اور نہ ہی مارشل لا ایڈ منسٹریٹر کا کوئی حکم نامہ صادر ہوا ہے کہ جو متابعت نہ کرے اس کا سر اڑا دیا جائے لیکن شہر بانو پھر بھی ڈری اور سہمی ہوئی ہے کہ کب کون جانے کس حسین کے گھر پر دستک ہوا اور بند گاڑی میں پرندے چھٹپٹاتے پھریں اور آزاد ہونے کی ہر راہ مسدود ہو چکی ہو۔

میں آہستہ سے نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں، میرا شہر، شہر شامِ غریباں کی تمثیل ہے کھپریل کے مکانات کے شگافوں سے اور پختہ مکانات کے شعاع دانوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنیاں ایسی محسوس ہو رہی ہیں جیسے قبرستانوں میں قبروں پر شمعیں بڑی مدھم لَو میں جل رہی ہوں............

اور تب اسی وقت میری بیوی تیز تیز چلتی ہوئی میرے پاس آتی ہے۔

''کیا بات ہے نشاط؟''

''آپ......آپ ٹھیک ہیں نا؟......نشاط مجھے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔

ٹھیک ہوں؟ کیا مطلب؟ ٹھیک تو ہوں ہی..........کیا تم کو بے ٹھیک نظر آ رہا ہوں؟''

مجھے ہنسی آئی......

تھوڑی سی جھلاہٹ بھی ہوئی......کہ شاید اب زینب کی دوبارہ نمود کا کوئی امکان نہیں ہے۔

''سنیے تو......''نشاط مجھے کنارے بلاتی ہے۔''میں نے ابھی ایک خواب دیکھا کہ میں آپ کے ساتھ بہت سے سامان کے ساتھ کہیں جانے کے لیے بس پر سوار ہوئی ہوں، جہاں اترنا ہے ،وہاں ہم دونوں اتر نہیں پاتے ،بس آگے بڑھ جاتی ہے ،مجبوراً آگے بڑھ کر ہم دونوں بس سے اترتے ہیں،اترتے ہی میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے، میں بیچ سڑک پر گر جاتی ہوں، میرا سارا سامان بکھر جاتا ہے،آپ سے اٹھانے کے لیے کہتی ہوں لیکن آپ چالیس قدم دور کھڑے ہنستے رہتے ہیں، میں کسی کسی طرح رینگ رینگ کر اپنا سامان یک جا کرتی ہوں، پھر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، تکلیف بڑھنے لگتی ہے، تکلیف کی شدت سے میری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں، میں دھیرے دھیرے مند ہوتی ہوئی آنکھیں بڑی مشکل سے کھولتی ہوں، اور ہر بار آپ چالیس قدم کے فاصلے پر کھڑے مسکراتے دکھائی دیتے ہیں، اور میری آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوتی جاتی ہیں......بند ہوتی جاتی ہیں......اور پھر چاروں طرف اندھیرا......اتھاہ گہرا اندھیرا۔

میں ہنس کر اس کے گال تھپتھپاتا ہوں، اور اسے اطمینان دلاتا ہوں کہ ہر دکھ دکھ میں اس کے ساتھ رہوں گا، وہ چلی جاتی ہے، مگر میں اس کائنات میں پھیلے ہوئے اسرار اور ان اسرار کے اشاروں اور کنایوں کے ساتھ اظہار کے پہلو پر غور کر رہا ہوں ...... اور باہر سروں پر خود پہنے اور پشت پر ڈھال رکھے نوجوان چار سیل کا ٹارچ روشن رتے ہیں، اور بوٹوں کی آواز گونجتی ہے......

ٹاپ......ٹاپ......ٹاپ......

اور سپاہی کی آواز گونجتی ہے......جاگتے رہو......''

اور ابھی سپاہی کی آواز کی گونج ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دھماکے کی ایک آواز سے پورا شہر

لرزاتھا...... اور پھر لگاتارکئی دھماکے ......ہم دوڑ کر چھتوں پر پہنچے ......روشنی ......روشنی ......روشنی ......شعلے آسمان سے محوِ گفتگو ......اور بوٹوں کی بھاگتی دوڑتی آواز ...... ٹاپ ......ٹاپ ......ٹاپ ......ٹاپ......"

"فائر......فائر......فائر......سناٹے میں گونجتی، کسی میجر کی کرخت آواز سے درو بام لرزاٹھے۔

"ٹھائیں......ٹھائیں......آہ......آہ......آہ......"

"جانے کون؟ جانے کدھر؟" میرے اردگرد بے چینی کا اژدہام اور میں خون میں لہولہان ......درد سے تڑپ رہا ہوں...... جانے کیوں جانے کیوں......؟؟"

اورایک تیز رفتار ٹرین میرے سینے پر سے دندناتی گزر رہی ہے، اور چاروں طرف زرد چہروں پر سائے لہرا رہے ہیں......اور میرے ہنرمند دوست جلدی جلدی اپنا کام نپٹا رہے ہیں ......جانے کب ادھر رُخ ہو جائے......اور سرحدوں پر نوجوان پہرے دے رہے ہیں

پَل پَل کی خبریں لگاتار آرہی ہیں......

اور نیچے کے کمرے میں میرا بھائی ...... پاگل شاعر ......میری روتی بچی کو بہلا رہا ہے ......اور مسلسل گا رہا ہے......

جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں

نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام وسبو

جو رنگ در و دیوار پر پریشان ہیں...... یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو

وہ گائے جاتا ہے مسلسل گا رہا ہے......اور باہر آگ لگی ہوئی ہے۔

شاید فلسطین کا آخری کیمپ مسمار کیا جارہا ہے، یا لینن گراڈ کا آخری گھر فتح ہو رہا ہے ...... یا شاید اکہتر افراد ختم ہو چکے اور قافلے کا سردار سجدے میں ہے اور شمر سر پر چمچماتی تلوار سونت کر آخری وار کی تیاری کر رہا ہے......اور باہر گلیوں میں کوئی گا ہے روتا، گا ہے قہقہہ لگاتا گزر رہا ہے اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ پکار کر کہوں "ذکی بھائی اب بس کیجیے، اس کا کچھ حاصل نہیں......" لیکن میرے اردگرد کی فضا میرے ارادوں کی قاتل ہے اور چاروں طرف بوٹوں کی ٹاپ گونج رہی ہے

......ٹاپ......ٹاپ......ٹاپ ٹاپ............ٹاپ......"

اورتب اسی لمحہ بجلی بہت زور سے چمکی ، بادل بہت زور سے گرجا، آندھی بہت زور سے اٹھی ،اور آسمان سے شعلوں کی بارش شروع ہوگئی ،زمین میں چھپے آتش فشاں کا دہانہ کھل گیا ،دائیں بائیں سے بھیانک عفریت اپنے جبڑے کھولے آگے بڑھی ...... اور بیک وقت ڈھیر ساری بلاؤں کا نزول شروع ہوگیا اور مائی لائی سے کوئی عورت اپنے بچوں کو اپنے دامن میں چھپا کر دیوانہ وار بھاگی ،اور ہندستان یا بنگلہ دیش کی سرحدوں سے کوئی بہاری دھکے دے دے کر پیچھے ہٹایا گیا............

اورخبر لانے والے دوڑتے ہوئے آئے اور سرگوشیوں میں بتایا وہ آ گئے ...... بوٹوں کی ٹاپ چند لمحوں کے لیے کسی دوسری طرف مڑ گئی تھی......

اورسائے منہ پر نقاب لگائے اور ہاتھوں میں مشعل لئے ......اور جیبوں میں ...... اور شانوں پر......"

مدافعتی جنگ کا اختتام تو اکثر فرار ہی پر ہوتا ہے......

باہر ہنر مند دوست اپنے اپنے جوہروں سے مایوس ہوکر رو برو مقابلے کے لئے دروازے کھول چکے ہیں ،اور کہیں دور کوئی سسکیاں بھرتا ، پھوٹ پھوٹ کر روتا اور قہقہہ لگا تا بے تابانہ دوڑ رہا ہے......اور گھر خالی کیے جا رہے ہیں......"

میں جب نیچے والے کمرے میں پہنچتا ہوں تو میرا بھائی بے تابانہ کمرے کے طول وعرض میں چکر لگا تا اور گنگنا تا نظر آ تا ہے...... یہاں سے کچھ نہیں کھلتا یہ پھول ہیں کہ لہو!!......

"چلو پیارے،شاعری بھی نا کام ہو چکی ہے"۔میں نے آہستہ سے اس سے کہا......اور اس کے چہرے کے بھیانک پن سے ڈر کر نظریں نیچی کر لیں۔

آگے میں،اور پیچھے پیچھے میری ماں اور میری بیوی ،میری نگرانی میں بھاگ رہی ہیں اور لاٹھیوں سے لاٹھیاں اور تلواروں سے تلواریں ٹکرا رہی ہیں،اور دھماکوں سے سارا شہر لرز رہا ہے ......اور کھپریل کے مکانات میں لگی آگ کی تیز لپٹیں،میرے پختہ مکان کی طرف بڑھ رہی ہیں

......اور تب ایسے میں......

میرے وجود میں چھپا ہوا ......میرا مرُشد میرے ساتھ بھاگتے بھاگتے مجھ سے سوال کرتا ہے''فرزند بتا! غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟''

''چپ غیر کے بچے !'' میں بھاگتے بھاگتے جھلا کر کہتا ہوں ،اور وہ خاموشی سے میرے ساتھ بھاگنے لگتا ہے۔لیکن کچھ دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے۔

''فرزند بتا! غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟''

''ارے حرامی! جینے دے گا، یا نہیں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے گالی نکلتی ہے......وہ چپ ہو جاتا ہے۔

لیکن کچھ دیر کے بعد پھر پوچھتا ہے''فرزند بتا! غیر کون ہے؟ غیر کہاں ہے؟''

میں رک جاتا ہوں......

وہ بھی رک جاتا ہے......

کچھ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں......

اور پھر......میں جھپٹ کر اس کی گردن میں اپنے دانت گاڑ دیتا ہوں ،وہ کچھ دیر چھٹپٹاتا ہے ،پھر ٹھنڈا ہو جاتا ہے......اور میں بوند بوند کر کے اس کا خون پی رہا ہوں ......میرے متعلقین بھاگ چکے ہیں کچھ دوسرے لوگ میرے اردگرد سے بھاگتے ہوئے گذر رہے ہیں ،لیکن میں اس کا خون پینے میں مصروف ہوں...... اور اپنا خوبصورت گھر دھڑا دھڑ جل رہا ہے ۔اور میں سوچ رہا ہوں ،میری لائبریری بھی جل گئی ہوگی ......نہیں لائبریری نہیں ......شاید ادبیات ،سیاسیات ،مذہبیات ،سماجیات ،اخلاقیات ،روحانیات ،معاشیات ،تہذیب وتمدن ......سب جل چکا۔

میں دیکھ رہا ہوں......میری لائبریری شعلوں میں گھری روشن ہے ،اور میرا مرشد مردہ پڑا ہے ،اور اس کا قاتل میں ہوں......اور کہیں دور کوئی روتا سسکیاں بھرتا اور قہقہے لگاتا گزر رہا ہے...... اور بھاگنے والوں کی آخری کھیپ نے جب مجھے کھڑا دیکھا تو مجھے بھی گھسیٹتی ہوئی بھاگنے لگی ...... میں نے بھاگتے ہوئے دوسروں کی گفتگو پر کان لگایا......

''عبدل شاہ پھنس ہی گئے ......'' میرے دوست باتیں کر رہے تھے......

''کیا ہوا؟......'' میں تڑپ اٹھا۔ ''عبدل شاہ کو کیا ہوا؟ وہ تو مجذوب آدمی ہیں، سب ان کی عزت کرتے ہیں۔''

''مجذوبیت ہی میں تو مارے گئے ......'' ایک دوست بتاتا ہے......

''ہم لوگوں کے سامنے کی بات ہے، اچانک وہ میدان میں کودے اور پورب ،پچھّم ،اتر ،دکھن چاروں سمتوں پر پیشاب کرنے لگے، یہاں تک تو شاید قابلِ معافی ہوتا، مصیبت تو اس وقت آئی جب چاروں طرف پیشاب کر کے مڑے ...... اور کرتا اٹھائے اٹھائے جوانوں کے سامنے آئے اور ایک جوان کے منہ پر پیشاب کر دیا......

''تب......؟ تب......؟ میں بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا......تب کیا ہوا؟'' ....

وہی جو ہونا تھا ...... اور کیا ہوتا ؟ اور یہ تم رک کیوں گئے ؟ ہم سب کو بھی مرواؤ گے کیا؟''......ایک دوست پھر مجھے گھسیٹتا ہوا بھاگنے لگا۔

بھاگتے بھاگتے کسی نے کہا...... میں نے سنا......لیکن قلندر واقعی قلندر تھا...... جوان کے رائفل تاننے سے اپنے دم توڑنے تک مسلسل قہقہہ لگاتا رہا......''

تب اسی لمحہ میری نگاہ اپنے گھر کی طرف مڑی۔

میری لائبریری دھڑ ادھڑ جل رہی تھی۔

اور اچانک اندر ہی اندر جانے مسرت کی کیسی تیز رو پائدار لہر دوڑ گئی کہ مَیں خو پر ضبط نہ کر سکا اور قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ہنستے ہنستے میں نے سنا۔ میرے دوست کہہ رہے تھے......اللہ اس کے حال پر رحم کرے، گھر لٹنے کا اثر پڑ ہی گیا۔''

دوسرے نے کہا......گھر تو گھر ،اس کی لائبریری ہی میں لاکھوں روپیوں کی کتابیں جمع تھیں......''

میں نے ہنستے ہنستے سوچا کہ انہیں بتاؤں ......''یارو! میں پاگل نہیں ہوں ،قلندر کی فتح کا جشن رہا ہوں۔''......لیکن میں یہ سب کچھ انہیں بتا تا نہیں ہوں ......

بس مسلسل بھاگ رہا ہوں، اور میرے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے۔
اور ذکی بھائی جگنوؤں کی طرح پل بھر کو جگمگاتے ہیں، پھر غائب ہو جاتے ہیں۔
اور گھنے جنگلوں میں اگیا بیتال اپنے شکار کی تلاش میں ہے......!

☆☆☆

ربّا ربّا

اس کے سوااو کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

لٰہذا گھر والوں نے رات کے بھیانک اندھیرے اور سناٹے میں بے جان جسد ناقد پر رکھا اور ناقہ سرپٹ دوڑتا صحرا کی بھیانک دھند میں کھو گیا۔

اور اس واقعہ کو صدیاں گزر گئیں۔

اور اب--------''

ایک خارش زدہ جھبرا کُتّا اپنی ڈراؤنی آنکھوں، ڈراؤنے چہرے اور لپ لپ کرتی باہر نکلی سرخ سرخ زبان سے لعاب گراتا، چہار دانگ عالم میں دوڑ رہا ہے اور--------''

اور میں ساحل پہ کھڑا ساحل کے کٹ کٹ کر سمندر میں ڈوبنے کا تماشا دیکھ رہا ہوں۔

اور میرے ہمزاد ابوالفصاحت میر دُرِشہوار علی خاں بہادر شہر میں اپنے بابا کی بنوائی عالی شان اور خوبصورت کوٹھی کے پائیں باغ میں اپنے چمچوں کے ہجوم میں گھرے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہیں، اور ان کے جدی دیہی مکان میں سناٹا بھائیں بھائیں چیختا ہے، بیتے موسم کی سرنگوں ہوائیں سسکیاں بھرتی ہیں اور کھنڈر نما محل سے ملحق اجاڑ باغ کی جھاڑ جھنکاڑ جھاڑیوں میں سانپ اور بچھو آنکھ مچولیاں کھیلتے ہیں اور......''

اور بُدھنی کا بیٹا کلکتیا بابو بن کر محلے میں دندناتا پھرتا ہے۔

اَنا سہیلُ -------''

جھوٹا......بے خبر......اپنی ذات میں گم......اَنا کی صلیب پہ چڑھا ناعاقبت اندیش شاعر!

تو ناعاقبت اندیش شاعر وقت کی دھند میں گم ہو چکا ہے اور ابولفصاحت میر درشہوار علی خاں

بہادر کا ہمزاد مجلس سماع میں

خبرم رسیدہ امشب کہ بہار خواہی آمد

پر بے تابانہ رقص کرتا ہے، نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے اور دم رقص سوچتا ہے کہ بہار میرے گھر کی طرف آتے آتے کدھر مڑ گئی۔

اور جب قوال اس شعر پر پہنچتا ہے کہ ۔

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزے بشکار خواہی آمد

تو اپنے آپ میں گم ،سایہ صفت ہمزاد دھپ سے اپنی جگہ بیٹھ جاتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہوا سوچتا ہے کہ کیا وہ میں ہوں؟ ...... میں کیا ہوں؟...... صحرا ہوں؟ ......صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے اتھاہ انتظار میں ڈوبا اداس ہرن ہوں؟ کہ وہ بے نام اور بے پیکر؟ جس کے انتظار میں صحرا آباد ہے!

بارِالہا...... بارالہا...... ''جب آئینے کا زنگ چھٹتا نہیں ہے اور وجود میں شامل بےخبری کا زہر کسی طرح امرت نہیں بن پاتا تو وہ دھاڑیں مار مار کر روتا ہے اور کہیں کوئی اور قلندر اندر ہی اندر ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہے......ہوُ......ہو......ہو......''

اور تب ایسی ہی ایک خون آشام ساعت میں اداس بوجھل اور جھکی پلکوں والے ایک بھولے بسرے معصوم سے چہرے کا عکس جھلملاتا ہے اور مجھ سے پوچھتا ہے۔'' یاد ہے تم نے کہا تھا، میں وہ مسافر ہوں جو ایک موڑ پر پہنچ کر ٹھہر گیا ہے اور چاروں سمتوں میں مڑ مڑ کر اس امید میں دیکھتا ہے کہ شاید پیچھے چھوٹ جانے والے کبھی اس تک آ جائیں......''

تو بے چارہ یہ سایہ صفت جلدی جلدی سر جھٹکتا ہے ، ادھر ادھر دیکھ کر اپنی نم آنکھیں پونچھتا ہے اور پھر مشغول ہو جاتا ہے......**تلك الایام نداولھابین الناس**......'' اور میں......

میں ساحل پہ کھڑا کٹ کٹ کر سمندر میں گرتے اور ڈوبتے ساحل کا تماشا دیکھتا ہوں...... اور صحرا کی بھیانک دھند میں نہ جانے کیا تلاش کرتا ہوں ؟ میں کیا تلاش کرتا ہوں ؟......

میں کیا تلاش کرسکتا ہوں؟......میری تلاش کیا معنی رکھتی ہے؟...... ازل سے ایک بے چین روح بھٹک رہی ہے۔ پل بھر جسدِ خاکی میں نور جگمگایا لامکانیت کو مکان مل گیا......نور من نور اللہ، پھر نور کہاں گیا؟ گریہ وزاری کرتے کرتے اچانک نگاہ اوپر اٹھی تو انتہائی بلندیوں پہ ایک نام کا پھریرا لہریں لیتا نظر آیا اور صدقے میں خطا معاف ہوگئی۔

''مگر پھر خطا......پھر خطا......''

میں کس کی خطا ہوں؟

میرے وجود میں ایک ہنگامہ بپا ہے اور میرے چاروں طرف سیاہ بھیانک رات کھڑی ہے ......اور رات کی دھند میں صحرا گم ہے......یا صحرا کی دھند میں رات گم ہے......

اور وہ ناقہ......

ناقہ بھی صحرا کی دھند میں گم ہو چکا ہے اور ابوالفصاحت اپنے چمچوں میں گھرے فصاحت و بلاغت کا دریا بہا رہے ہیں۔

تو ابوالفصاحت میر درِ شہوار علی خاں بہادر! اپنی لن ترانی بند کیجئے۔ اپنا کاروبار سمیٹئے اور چلتے پھرتے نظر آیئے......خالی کیجئے جگہ......خالی کیجئے......آپ سن نہیں رہے ہیں؟......کہہ رہا ہوں نا؟......جگہ جلدی خالی کیجئے......وقت آگے بھاگتا جا رہا ہے......مسلسل بھاگتا جا رہا ہے......کل بہت پیچھے چھوٹ چکا ہے......خالی کرو......خالی کرو......

چیختے چیختے میرا گلا بیٹھا جا رہا ہے......ابوالفصاحت بے خبری کی دھند میں گم ہیں اور سایہ صفت ہمزاد دیہی مکان کی اجاڑ اور ویران رہگذاروں میں چکر لگا رہا ہے اور میں چیختے چیختے تھک کر بیٹھ گیا ہوں......اور میری ویران آنکھیں دیکھ رہی ہیں......''

میری ویران آنکھیں دیکھ رہی ہیں......دو بیگھے میں پھیلے اس محل نما مکان کو جس میں......تین تین آنگن، تین بڑی بڑی دالانیں......انگنت بڑے بڑے کمرے......منقش در و دیوار...... دادا جان کی اونچی نشست گاہ......گاؤ تکیہ......پیچوان......مشاعرہ بھی ہوتا تھا......گرمیوں میں چاند کی چودھویں تاریخ کو مشاعرہ ہوتا، سفید بھک بھک چادریں بچھتیں، مٹی کے کورے کورے گھڑوں

میں برف دیا پانی ، گھڑوں کی گردنوں میں بیلا ،چنبیلی اورموتیا کا ہار ......مشہور ومعروف شعراء تشریف لاتے ،شمع بڑھتی جاتی ،شعراءغزلیں سناتے جاتے اور چاند دھیرے دھیرے مدھم ہوتا جاتا ...... برسات آتی تو پائیں باغ میں جھولا لگتا اور پھوپھی جان لوگ جھولا جھولتیں ۔کیا سریلی آواز تھی ان لوگوں کی ،بڑی پھوپھی شروع کرتیں ......اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے ۔ چھوٹی پھوپھی سُر میں سُر ملاتیں......کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا...... اور گھر کے کونوں کھدروں اور سیڑھیوں کی تنہائیوں میں کتنے پیمان ہوئے ۔وعدہ شکنی پر زینے کتنی بار آنسوؤں سے تر ہوئے ......اب کون گنے......

اب کون گنے کہ اب آنسوؤں کے قطرے نہیں......سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی موجوں کی بے پناہی ہے اور ساحل کٹ کٹ کر سمندر میں گرتا جا رہا ہے ،ابوالفصاحت دُرِشہوار علی خاں کے شہر والے مکان کا آدھا حصہ شیخ بفاتی میاں نے پچپن ہزار میں خرید لیا ہے کیوں کہ بنگلور میں ان کے صاحبزادے میر تہور علی کی فرم کا دیوالیہ نکل گیا تھا اور قرض چکانے کے لئے ان کے پاس ایک پیسہ نہیں تھا۔

تو جب شہر والے مکان کا آدھا حصہ بکا تو پھوپھی بلک بلک کر روئیں ۔اللہ اب یہ وقت آ گیا ......"

ہاں بھائی دُرِشہوار علی !وقت آ گیا ......تم اپنے چمچوں میں گھر کر اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی فراموش کرنا کیوں نہ چاہو ......مگر وقت آ گیا ......نوشتۂ دیوار پڑھو ......خالی کرو ......جگہ خالی کرو......وقت کے پاس اب وقت نہیں ہے......وقت کے ساتھ وقت کی بات گئی......بات گئی تو رات گئی......رات گئی تو ذات گئی......ذات گئی تو......تو......تو......"

اچانک جانے کہاں سے......کن اندھیروں سے نکل کر......سایہ صفت ہمزاد میرے سامنے آن کھڑا ہوا......غصے میں لال بھبھوکا......سرخ سرخ آنکھیں لیے......دانت کچکچا کر چیخنے لگا...... تو دھر دبوچا سالے کا گلا......کاسٹرم کر رہا تھا......بہت سمجھایا کہ صلاحیت جس میں ہے وہی افضل ہے ......مگر لگا فقہ اور حدیث بگھارنے کہ سید افضل ہے ...... ہشم افضل ہے ......دیا ایک ہاتھ تو

سالے کی ساری سیدی دھری رہ گئی ۔مسجد ان کے باپ کی ہے......دس پیش امام مر چکے......اب گیارہواں بھی سید ہی ہوگا......ابے سالے تو مولانا حافظ محمد اللہ رکھا نے حفظ کس دن کے لئے کیا تھا۔عالم کاہے کے لیے ہوئے تھے......کہنے لگا......اس کی ماں او پلے تھاپتی تھی ۔تمہاری ماں کا پتہ ہے سالے؟......بڑا سید زادہ بنتا تھا......الف ہو گیا مسجد سے بھاگ کھڑا ہوا......اتنا بھی برداشت نہ کر سکا......بھاگو سالو......باپ کی جاگیر ہے؟ مذہب ہو کہ ادب ،معاش ہو کہ سیاست ہر جگہ گدھ کی طرح جھپٹا مارتے ہو؟ زمین کی ٹھیکریاں خلاؤں میں رقص کریں گی ......سہیل طلوع نہیں ہوگا......نہیں ہوگا......نہیں ہوگا۔

سایہ صفت سایہ بن چکا ہے......نظر نہیں آرہا ہے......مگر مسلسل گائے جارہا ہے......مسلسل آواز آرہی ہے......سہیل طلوع نہیں ہوگا۔نہیں ہوگا......اور ایک بڑی بھیانک اور زوردار آندھی میر صاحب کے گھر کی طرف بڑھ رہی ہے،مگر میر صاحب کو خبر نہیں ہے......خبر کیسے ہو کہ وہ کمرے میں بند ہیں اور کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے ہیں......مگر میں دیکھ رہا ہوں ۔آسمان کا بھیانک ڈراؤنا رنگ ......فضا میں اڑتے ہوئے تباہی کے ابخرات اور فضا پہ چھائے بھیانک دھویں کی دھند میں درانا دوڑتا ہوا ایک غضب ناک ناقہ ......اور میرے عزیز ابوالفصاحت میر درِشہوار علی خاں بہادر جو لمحۂ گزراں کے اسیر ہیں......لمحۂ آئندہ سے بے خبر......تاریخ فیروشاہی سیر المتاخرین ،فرشتہ اور آئینہ اودھ سینے سے لگائے......اور کڑا مانکپور سے آمڈاری تک صفایا ہو چکا ہے......رہے نام اللہ کا......

رہا نام اللہ کا......بہت دنوں تک رہا......فجر کی نماز سے تین گھنٹہ پہلے دو ڈھائی بجے ہی دادا اٹھ جاتے اور فجر تک گریہ وزاری میں مشغول رہتے ......کریما بہ بخشائے برحال ما......گدڑی میں لعل ......لعلِ شبِ چراغ ،شہر والے ان کے بڑے معتقد تھے،کئی کرامتیں زبان زدِ خاص و عام ہیں، یہ تو میری بھی آنکھوں دیکھی بات ہے کہ وفات سے تین چار دنوں پہلے برسہا برس کی غائب بینائی اچانک گھنٹوں کے لیے واپس آ گئی اور حضرت پورے گھر میں بغیر کسی سہارے کے چکر لگاتے رہے، یہ گھر ان کی جوانی میں اپنے عروج پر تھا اور جب مائل بہ زوال ہوا تو دادا حضرت نے آنکھیں بند کر لیں اور فنائے کلی سے کچھ ساعت پہلے ایک مرتبہ پھر ظاہر کی تباہی ظاہر نے ملاحظہ کی

،شاید ترکِ ترک کی منزل تک پہنچنے کے لیے فنا برائے فنا بھی ناگزیر ہے۔

مکان کے ایک حصے میں پہنچے تو اونچی بڑی سی دیوار دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔’’یہ کیا ہے؟‘‘

’’بڑے ابا کے لڑکوں نے بٹوارہ کرلیا ،زبردستی ہم لوگوں کا بھی کچھ حصہ غصب کرلیا‘‘......ابا نے بتایا۔اچھی طرح یاد ہے کہ آہستہ سے مسکرائے اور مدہم لہجے میں بولے۔’’ہم جدنے ہمیشہ یہی رول ادا کیا ہے۔‘‘

پھر بینائی واپس چلی گئی۔

اور ابنِ جاحظ اور ابن خلدون جھپٹ جھپٹ کر میری آنکھوں پر حملہ کرنے لگے......لیکن میں کیا کرسکتا ہوں؟......

خنزیروں کی فوج اپنی تھوتھنی اٹھائے میری منتظر ہے کہ کب میں اس کے راستے میں خطِ مستقیم بنتا ہوں......اور میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا کہ آہستہ سے کج ہو جاؤں اور خنزیروں کی فوج سیدھ میں دوڑتی گزر جائے ...... خنزیروں کی فوج سیدھ میں دوڑتی گزر جاتی ہے اور میں سوچتا ہوں کہ معاملہ ختم ہوا......لیکن دوسری سمت مڑتا ہوں تو ادھر سے بھی خنزیروں کا ڈھیر دوڑتا نظر آتا ہے ......پھر کج ہو جاتا ہوں ...... اور تیسری سمت مڑتا ہوں......ادھر بھی **خنزیروں** کا ڈھیر......‘‘

چاروں طرف **خنزیروں** کی فوج جمع ہے......اور کج رہنا میرا مقدر ہے اور چہار دانگ عالم میں خارش زدہ جھبرا کتا دوڑ رہا ہے......

یہ صدیوں پہلے کی بات ہے......

یہ صدیوں پہلے کی بات ہے مگر ابھی کل کی بات لگتی ہے ...... اماں بی بی بار بار یاد آتی ہیں اور بار بار اندر ہی اندر درد کی ایک تیز اَنی مجھے کاٹتی اور زخمی کرتی گذر جاتی ہے ......ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ اماں بی بی کے ساتھ سلوک کا مسئلہ بھی مختلف فیہ بن جائے ؟ مگر بھائی لوگوں نے تو اسے بھی مختلف فیہ بنا ہی دیا ہے...... بھابھی زہرہ کہتی ہیں......لعنت بھیجو!‘‘

اور تب میرے اندر ہی اندر آہستہ سے ایک سوال سر اٹھاتا ہے اور سانپ کی طرح رینگنے

لگتا ہے......دشمن کون ہے؟ مخالف کون ہے؟ اختلاف کرنے والا کون ہے؟ منافق کون ہے؟

اور تب اسی لمحہ سایہ صفت ہمزاد بے تابانہ رقص کرتا ہے اور چیختا ہے ع

عَلیٰ کُلِ شَیءٍ قدِیر آمدی

اور میں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑا کر دعائیں مانگتا ہوں ۔''اے اللہ ! مجھے جاہلوں کے جیسا عقیدہ عطا فرما''...... مگر میری آگہی میرے لئے زہر ہے اور میرا ساحل کٹ کٹ کر سمندر میں گرتا جارہا ہے......اور ابولفصاحت میر درِشہوار علی خاں اپنے اس ہرکارے پر چراغ پا ہورہے ہیں جو یہ خبر لے کر آیا ہے کہ لچھو پاسی نے ان کے کھیتوں کے ایک حصے پر قبضہ کرلیا ہے اور یہ بھی کہ ان کا دیہات والا مکان، نھو میاں نے بے ایمانی سے اپنے نام کرلیا ہے۔تو میں بڑے دھیرج سے بھائی شہوار کو سمجھاتا ہوں کہ۔''اب سب بیکار ہے!''

جھلانے اور بگڑے کا کوئی فائدہ نہیں.....جگہ خالی کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں...... عنایات ونوازشاتِ فرنگیاں کے صدقے جایئے کہ شہر میں آپ کے باپ دادا کی بڑی بڑی عالی شان کوٹھیاں بن گئی ہیں ......تواب جب آپ سب لوگ شہر آباد ہوگئے ہیں، دیہات والے مکان پر آپ کا کیا حق ہے؟ کھیت جو جوتے گا ملکیت بھی اسی کی ہوگی، یہ تو طے ہو چکا......اس پر آپ خفا کیوں ہیں؟

ہاں ہاں صدیوں سے عادی بنادیئے گئے ہیں......یہی کہئے گا نا؟

یہی چیز اگر ابتداء ہی میں سمجھ میں آجاتی تو آج جو درد آپ کو تڑپاتا ہے اور شکست کا جو احساس آپ کے وجود کے ایک ایک حصے کو کھر چتا رہتا ہے، وہ آپ کا مسئلہ تو نہیں بنتا......؟

جلاوطن کردیئے جانے والے نے سمجھا مگر آپ نہ سمجھے......کردیا بے چارے کو جلاوطن...... خون منھ کو لگا ہوا تھا نا......اور اس پر کرسی نشیں کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا......بات مذہب کی قطعی نہیں تھی ،سارا مسئلہ معاشی تھا مگر خدا مغفرت کرے جھوٹی جھوٹی باتیں گڑھ دینے والوں کا ......ایسا چکر چلا کہ سب الٹ پلٹ ہوگیا......ایسا الٹ پلٹ ہوا کہ سب سے بڑے ولدالزنا کو بھی رحمتہ اللہ علیہ کہنے والے پیدا ہوگئے۔

لہٰذا مصلحتِ ملی کا زہریلا نیزہ جب اندھا ہو جاتا ہے تو بے جان جسد برق رفتار ناقہ پر رکھ کر کسی سمت روانہ کر دیا جاتا ہے ......ملوکیت کی ابتداء سے ملوکیت کی انتہا تک تمہاری نس نس میں جو زہر سرایت کیا گیا وہ اب دوسروں کے لیے نہیں تمہارے ہی لیے قاتل بن رہا ہے، اور تم اسے دوسروں کی دین سمجھ رہے ہو...... چکی پسینا تو تمہار لیے باعث افتخار ہونا چاہیئے تھا، مگر غزوہٗ سویق کو تم بھلا چکے ہو اور خارش زدہ جھبرا کتا اپنی تھوتھنی تمہارے منہ سے مل رہا ہے اور تم یہی سمجھ رہے ہو کہ......''

خیر جانے دو ......بات تلخ ہو جائے گی اور رواداری کا تقاضا ہے کہ تلخی نہ پھیلائی جائے ......حالاں کہ مولانا حافظ محمد اللہ رکھا کے دادا کی زندگی میں تلخیوں کے علاوہ کچھ نہ تھا، اور یہ تلخی تم نے ......ہاں برادر شہوار علی ......تم نے پھیلائی ......تم نہ سہی، تمہارے آباؤ اجداد سہی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اب یہ سب اعتذار ہے میاں، تاویل کا ریکٹ مت چلاؤ...... بے چارہ اللہ رکھا اپنے تقدس اور تقشّف کے خیال سے چپ رہتا ہے مگر تمہارے گھر اس کی بہنیں، پھوپھیاں اور خالائیں جو دن رات کھٹتی تھیں اور رات گئے تک تمہارے دادا جان کے پیر دباتی رہتی تھیں تو کیا وہاں نماز با جماعت ادا ہوتی تھی؟؟......

چغد دی گریٹ......''

مگر نہیں یار...... چغد تم نہیں تھے...... چغد تو وہ غریب تھے ......اور اب جب ذرا عقل آئی ہے، تو تم بوکھلائے بوکھلائے پھر رہے ہو......''

مگر شہوار علی ...... واقعی بے حیا ہو کیا؟ سر پر آسمان نہیں پیر کے نیچے زمین نہیں ...... پھر بھی اپنی جگہ چھوڑنے پر تیار نہیں ہو......میری بات مان لو برادر! خیالی کھمبا کتنے دنوں تک ساتھ دے سکے گا؟

یونگ پریشان کرتا ہے نا؟ ......لیکن مارکس، یونگ سے بڑی طاقت ہے پیارے ......ایسا نہیں ہوتا تو تمہارے صاحبزادے کو مکان کا آدھا حصہ بیچ کر قرض چکانے کی نہ سوجھتی۔

چپ رہو ......چپ رہو...... خدا کے لیے چپ ہو جاؤ ......پریشان مت کرو......

''ابولفصاحت میر درِشہوار علی بہادر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر چیخے اور میں ایک لمحے کے لئے تھتھم گیا۔

تو اسی ایک لمحے کے لیے تھتھمے ہوئے لمحے میں...... جانے کہاں سے بے پیکر سایہ صفت ہمزاد...... اداس چہرہ لئے آن کھڑا ہوا...... اور اداس لہجے میں بتانے لگا...... جس دن مکان بکا، بڑی پھوپھی بلک بلک کر روئیں اور دوسری پھوپھیوں نے آنکھوں کی نمی دامنوں میں جذب کر لی

ع عاشور کی شب تھی کہ قیامت کی گھڑی تھی

اور اس رات...... ایک بوڑھا اپنے جسم پر بھبھوت ملے، اپنے دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹتا اور اپنا خون پیتا، وحشت زدہ بھیانک سناٹے کی آماجگاہ، آنکھوں سمیت...... آنگن کے بیچوں بیچ...... مادرزاد برہنہ کھڑا آسمان تاکتا رہا اور چیختا رہا...... وعدۂ دیدار کجا است؟

ساری رات یہ ہنگامہ برپا رہا۔

اور جب سحر کی آمد آمد تھی تو زمین پھٹی اور وہ اس میں سما گیا۔

''تو سمجھے بھائی شہوار علی؟'' میں نے اس کا شرمسار چہرہ اس کے دونوں ہاتھوں کے ہالے سے باہر نکالا۔

انجیر کے درخت میں پھل آتے آتے مدتیں گذر جاتی ہیں...... صدیوں پہلے جو کچھ ہوا اس کا اصل نتیجہ تو اب ظاہر ہو رہا ہے...... ابن تیمیہ اور ابن قیم تو بیچ کی کڑی تھے...... اس لیے بوکھلاؤ مت...... فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہتھیار ڈالنا تمہاری تقدیر ہے...... خواہ اس تقدیر تک پہنچنے کی مدت کو تم کھینچ تان کر کتنی ہی طویل کیوں نہ کر لو......''

مگر حقیقی صورتِ حال یہی ہے کہ چہار دانگ عالم میں خارش زدہ جھبرا کتا دوڑ رہا ہے اور اس کے لعاب کو لوگ آبِ حیات سمجھ کر شیشوں میں جمع کر رہے ہیں...... اور میں خنزیروں کے حملے کے خوف سے سیدھا نہیں ہو پا رہا ہوں۔ ایک سمت بچاتا ہوں تو دوسری حملے کا شکار ہو جاتی ہے...... دوسری کی حفاظت کی سبیل نکالتا ہوں تو تیسری سمت پر حملہ ہو جاتا ہے...... تیسری سمت کا بچاؤ کرتا ہوں تو چوتھی سمت کا محاذ کھل جاتا ہے...... کیا مجھے ہمیشہ کج ہی رہنا ہوگا؟

کیا راہ مستقیم مقدر نہیں؟

عزیزم مارکس ......آپ کو تو پوہ پوہ کردوں ......مگر یونگ سلمہ، ہاں یار...... تمہیں زیادہ بڑا مسئلہ ہو کہ ابولفصاحت میر درِشہوار علی خاں بہادر کچھ سننے دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہیں......اور بے پیکر سایہ صفت ہمزاد ہوا کی طرح سارے میں تیر رہا ہے، اور آئینے کا زنگ چھٹتا نہیں ہے......اور صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے اتھاہ انتظار میں ڈوبا اداس ہرن اس بے پیکر سوار کے انتظار میں ہے جس سے صحرا آباد ہے ......اور سوار کا بے جا جسد ناقہ پر رکھ کر بھیانک رات کی ویرانی، سناٹے اور اندھیرے میں کسی سمت روانہ کر دیا گیا ہے......

بعضوں نے کہا...... ایک نہیں، بلکہ چاروں طرف برق رفتار ناقوں پر تین مثالی اجسام اور ایک حقیقی جسم سوار کیا گیا اور چاروں ناقوں کو صحرا کی چار دھند بھری سمتوں میں روانہ کر دیا گیا ...... پتہ نہیں بے جان جسد نے کہاں قرار پکڑا......ناقہ کہاں رُکا......کہ صحرا کی دھند میں گھرا اُداس ہرن ہتھیلی پر اپنا سر رکھے بے پیکر سوار کا منتظر ہے......اور...... چہار دانگ عالم میں ایک خارش زدہ جھبرا کتا اپنی ڈراؤنی آنکھوں، ڈراؤنے چہرے، اور لپ لپ کرتی باہر نکلی سرخ سرخ زبان سے لعاب گراتا چہار سمت دوڑ رہا ہے......اور تم......تم ابوالفصاحت میر درِشہوار علی!

اس بدبودار کتے کا لعاب آبِ حیات سمجھ کر جمع کرتے ہو......صبح و شام پیتے ہو ...... اور جلاوطن کیے جانے والے سے خفا ہوتے ہو......''

یہ شاید صدیوں سے ہو رہا ہے۔

اور وہ بھی صدیوں پہلے کا واقعہ ہے۔

جو کچھ ہوا......صدیوں پہلے کی بات ہے......مگر میں کیا کروں؟

معاشی مسئلہ مذہبی بن چکا ہے، اور میں خنزیروں کے حملے کے ڈر سے مسلسل بھاگ رہا ہوں۔

شاید یہی میری تقدیر ہے!

اور ایک خارش زدہ جھبرا کتا چہار دانگ عالم میں دوڑ رہا ہے......مگر علاقہ کے لوگوں نے شناخت کا مسئلہ مشکل بنا دیا......یا شاید وہ خود علاقہ کی شناخت فراموش کر گئے ......مگر دل کہتا ہے ،شاید یہ وہی جگہ ہو......فیصلہ مشکل لہٰذا تفریق محال......

ایسے میں میرا فیصلہ کیا ہونا چاہئے...... برادر میر شہوار علی؟

میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں اور جب (جواباً) صحرا میں ہتھیلی پر اپنا سر رکھے اتھاہ انتظار میں ڈوبا اداس ہرن مجھے ذبح ہوتے کبوتر کی طرح ٹک ٹک تا کتا ہے تو میں جلدی جلدی کمرے کے تمام دریچے بند کرنے لگتا ہوں......اور میرے چاروں طرف فضائے آسمانی کی دھند میں گم ہوتے کسی برق رفتار ناقہ کے قدموں کی چاپ گونجتی ہے......اور کسی اجاڑ ویران گھر میں کوئی بوڑھا اپنے جسم پر بھبھوت ملے ...... اپنے دانتوں سے اپنا ہونٹ کاٹتا اور اپنا خون پیتا ...... وحشت زدہ بھیانک سناٹے کی آماج گاہ آنکھوں سمیت آنگن کے بیچوں بیچ مادر زاد برہنہ کھڑا......آسمان تاکتا رہتا ہے......اور چیختا رہتا ہے ع......

وعدہ ٔ دیدار کجا است ؟ ؟

مدتوں یہ ہنگامہ برپا رہتا ہے...... بھیانک رات نہ ایک پل ادھر ہٹتی ہے نہ ایک پل ادھر بڑھتی ہے......ستارۂ سحری کا دور دور تک پتہ نہیں ہے۔ دیکھئے سحر کب ہوتی ہے......اور......

اور پھر یوں ہوا کہ میں نے دریچے کے شگاف سے جھانکا......''

''ایک شخص ......سر سے پیر تک لہولہان ......زخموں سے چور چور......اکہتر پیاروں کو اپنے سامنے قتل ہوتا دیکھنے والا......دشمنوں میں گھرا ہوا گھٹنوں کے بل اپنے خیمے کی طرف بڑھ رہا ہے ......اور دشمنوں کے نیزے بار بار اسی کا راستہ روک رہے ہیں ......اور ہر بار وہ مقابلہ کر رہا ہے ......خیمہ دور ہے۔ دشمنوں کی یلغار شدید......اور اس کی پیش قدمی جاری......شاید یہی وہ علاقہ ہے۔''

میں بے اختیارانہ دریچے سے کنارے ہٹ جاتا ہوں۔

اور اب آخری صورتِ حال:

ابوالفصاحت میر درِ شہوار علی بہادر نہ کچھ سننے پر آمادہ ہیں نہ جگہ چھوڑنے پر......چمچوں میں گھرے فصاحت و بلاغت کا دریا بہا رہے ہیں، اور گاؤں سے آئے ہرکارے پر خفا ہو رہے ہیں ......سایہ صفت ہمزاد بے تابانہ رقص کر رہا ہے اور چیخ رہا ہے ...... بسوئے غریباں امیر آمدی

......اور میں ایک ایسے کمرے میں بند ہوں جس کے دروازوں پر مہر لگی ہے ......اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند ہیں!......

مگر کواڑوں میں پیدا ہو جانے والی جھریوں پر کس کا اختیار ہے......؟؟

تو میں بند کمرے میں بند ہوں اور ماتم کر رہا ہوں......''

وامحمداً-------وامحمداً-------وامحمداً-------

☆☆☆

سبرامنیم کیوں مرا

مدھولتا نے بے تاب ہوکر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

ایک گھنا سفاک اندھیرا......آدھی کٹی گردن والے خون سے شرابور جسم کی چھٹپٹاہٹ......

اسے لگا، جیسے بارہ بور کی رائفل کی نال اس کے پیٹ پر رکھ کر لبلبی دبا دی گئی ہو......

جب اس کے پاپا نیفا کے مورچے پر شہید ہوئے تو وہ گیارہ برس کی تھی، اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کی ماں جب پھپھک پھپھک کر رونے لگی تو پاپا کا سامان لے کر آنے والے جوان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا......''تو تو بھاگیہ وان ہے بہن کہ تیرا آدمی وطن کے کام آیا...... تو روتی کیوں ہے؟ ابھاگے تو ہمارے بال بچے ہیں کہ ہمارا لہو مٹی کو پسند نہیں آیا۔

ماں اس وقت تو چپ نہ ہوسکی مگر بعد میں جب جب پاپا کا ذکر ہوتا تو ماں کی آنکھوں میں جیسے سورج اتر آتا......سرخ روشنی دیتی......زندگی سے بھرپور آنکھیں......ایسا نہیں تھا کہ ماں نے پاپا کی کمی نہ محسوس کی ہو، پاپا کے بعد ماں پر کئی بار تھکاوٹ ٹوٹ ٹوٹ کر برسی ......کیسے عجیب بھیانک دن تھے وہ، سونے بازار، ہو کا عالم......لوگ سرگوشیوں میں باتیں کرتے اور ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھتے......''کوئی بری خبر لئے دوڑا چلا تو نہیں آرہا ہے؟......ہم کیا ان سے تعداد میں کم تھے لیکن جب سربراہ زکام کے ڈر سے مورچہ چھوڑ دے تو پیچھے والوں کو تو فالج مار ہی دے گا:

مگر اس کے باوجود میرے گھر کا سر تو فخر سے تن گیا...... بعد میں پاپا کو'' پدم ویر چکر''...... اس نے یاد کرنا چاہا تو اسے ہلکا سا یاد آیا......نہرو جی اس کی ماں کو تمغہ دے رہے تھے۔

اسی وقت کی بات ہے انہوں نے جھک کر اسے پیار کیا، کیسی لالیما تھا اُن کے چہرے پر...... ماں سے وہ پاپا کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے......پھر مدھو کی طرف مڑے......بس ایک جملہ

یاد رہ گیا...... بہادر باپ کی بہادر بیٹی!''

اسکول میں بھی لوگ اسے دیکھ کر کہتے ......''شہید کی بیٹی!''

اس ایک لفظ میں جانے کون سا جادو تھا کہ اس کے انگ انگ میں خون قلانچیں بھرنے لگتا ......ایک مرتبہ اس کا جی چاہا تھا ...... کاش آئینہ ہوتا اور وہ دیکھتی کہ کیسی لگتی ہے وہ اس وقت ......جب شہادت کی مسرت اس کے اپنے آپ میں اتر آتی ہے...... بعد کے دنوں میں ایک مرتبہ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا...... پاپا کے مرنے کا دکھ زیادہ ہے یا ان کے شہید ہونے کی خوشی زیادہ ہے؟

تناسب کا تعین وہ کبھی نہ کر سکی مگر انتہائی اداس لمحے میں بھی پاپا کا سامان لے کر آنے والے جوان کی بات ضرور یاد آئی......تو تو بھاگیہ وان ہے...... تیرا آدمی وطن کے کام آیا!

سو ماں پر جب جب تھکاوٹ ٹوٹ کر برستی تو اس کا شہید شوہر ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ بنا!

''مگر......''

اچانک مدھو کے خیال کی رو بھٹکی ......اس نے بے تاب ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا ......ایک گھنا سفاک اندھیرا اور اس گھنے سفاک اندھیرے میں آدھی کٹی گردن والے خون خون جسم کی چھٹپٹاہٹ ......اس نے اپنے آپ میں ایک عجیب قسم کی ہولناکی محسوس کی ......جیسے کوئی بڑا ہی خوف ناک بھیانک اور غلاظت میں لت پت درندہ اس کی رگوں میں سیال بن کر اتر رہا ہو۔

''ایسا کیوں ہے؟ ایک ہی طرح کے دو افراد کا یکساں عمل الگ الگ تاثر کیوں پیدا کرتا ہے ؟'' عفریت منہ پھاڑے کھڑا تھا۔

''بے چارہ بچہ!'' وجود کی انتہائی گہرائیوں تک اتر جانے والی گونج!

اس نے بے تاب ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھا، بولنے والا شام کی دھند میں رُل مِل چکا تھا۔

بولنے والا تو جانے کب کا، جنوب کی گرم شام میں، شاید کسی سائے کی تلاش میں...... کہیں اور جا چکا تھا...... مگر الفاظ اگیا بیتال کی طرح اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اسے گھور رہے تھے......''بے چارہ بچہ!''

اس نے تڑپ کر کھڑکی بند کر دی ،اور کھڑکی کے شیشوں سے اپنا گال چپکا لیا......ایک تیز ......سریع الاثر زہر کی طرح رگ و پے میں جہنم انڈیلتی ٹھنڈک اس کے آپے سراپے میں اترنے لگی ......اسے پھر پاپا یاد آئے......کیسا مضبوط سہارا تھے وہ......ہم سب کا...... پاپا مر کر شہید کہلائے اور امر ہو گئے......کیسا زندہ......شہہ رگ سے فوارے کی طرح ابلتے اور اچھلتے لہو سمان آئنڈیل بن گئے تھے وہ......صرف گھر کا نہیں......سارے شہر کا......شاید سب کا!

پھر مدھو کی شادی کا مسئلہ سامنے آیا......

شہید کی بیٹی کی شادی !اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا......''کسی فوجی کی بیوی بننا میرے لئے فخر کی بات ہوگی۔''

مگر آج ......اگیا بیتال نے پھر اسے گھورا اور اس نے بے چین ہوکر اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا......''نہیں......نہیں......نہیں......اس نے کسی اور کے لئے کہا ہوگا۔''

اس نے اپنے آپ کو بہلانا چاہا مگر الفاظ اسے گھور رہے تھے اور وہ تڑپ رہی تھی......درد کی ایک تیز دھار لہرا سے ٹکڑے ٹکڑے کئے جا رہی تھی اور وہ......خود مدھو......درد سے تڑپتی ایک بے سہارا عورت......ایک بانجھ عورت کے درد کی تمثیل تھی!

''میجر سبرامنیم!'' مدھو پھوٹ پھوٹ کر رو دی......''تم نہیں میں بدنصیب ہوں''

اسے وہ جوان یاد آیا جس نے کہا تھا:''ابھاگے تو ہمارے بال بچے ہیں کہ ہمارا لہو مٹی کو پسند نہ آیا۔''

اس نے تڑپ کر پاس کھیلتے راما سوامی کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا......''پاپا، دیکھو اس کو کچھ نہیں ملا!''

وہ پاپا کی تصویر کے سامنے چیخ رہی تھی اور چھ برس کا معصوم سوامی کبھی ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا، کبھی ممی ممی کہہ کر اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا، اور کبھی اس کو روتا دیکھ خود بھی رونے لگتا--

اور مدھو کے چاروں طرف گھنی سفاک، اندھیری رات اپنا گھیرا تنگ کرتی جاتی تھی۔

وہ پہلی رات......جب اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے میجر سبرامنیم کو دیکھا تھا......ساڑھے

چھ فٹ کا دراز قد، گٹھیلا بدن ......سبر امنیم ......جس کے بازوؤں کی مچھلیاں یوں پھڑک رہی تھیں اور چمک رہی تھیں جیسے ایکوریم پرست رنگی ٹارچ کا فوکس مارا جا رہا ہو......جیسے شیش محل میں قزح کی ست رنگ دھنک ......امڈ گھمڈ کر برستے نشے کا کیف اس کا پور پور شرابور کر رہا تھا اور وہ جھومے جا رہی تھی۔

بعد کے دنوں میں کئی مرتبہ اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی ......اس لمحے آخر اس نے ایسا سوچا کیسے ......چھی ......کیسا کمینہ خیال تھا ...... پر وہ کیا کرتی ......میجر سبر امنیم اس کی طرف جھک رہا تھا...... مدھو اسے دیکھے جا رہی تھی اور جھما کے کی طرح بس ایک خیال لپک جھپک کرتا آ رہا تھا اور جا رہا تھا......وہ بار بار خیال کی رو کو میجر کے چہرے کی طرف، چھ فٹ کے دراز قد گٹھیلے بدن کی طرف موڑنے کی ناکام کوشش کرتی رہی، اور بار بار بس ایک ہی خیال مدھو کی پلکوں کے تٹ پر بجلی کی بے قرار چمک کی طرح جھما کے کرتا رہا اور مدھو اس خیال کی گھٹا گھنگھور ورشا میں **بھیگتی** رہی ......''اب وہ شہید کی بیوہ کہلا سکتی ہے!''

مدھو نے گنگنا کر سوچا ......تو گویا یہ وہ خود ہے، جس نے کھویا اپنا آپ ...... اس نے تڑپ کر اپنے چاروں طرف دیکھا......کوئی سہارا......کوئی پناہ......کوئی سایہ......کوئی جھوٹ......جو اسے اس پل میں تھام لیتا ......اسے اس یقین یا گمان کی ڈور پکڑنے کا بہانہ مل جاتا کہ نہیں، یہ خود مدھو نہیں ہے، کوئی اور ہے......مگر......اس نے بے تھاہ ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا......کیا ایسا کچھ بھی ہے جو میری خاطر ایک پل کا......سچ، جھوٹ، فریب، بہلاوا......کچھ بھی بن سکے؟''

مدھو جیسے تھونس کر بیٹھ گئی......ایسا کچھ نہیں......کچھ بھی نہیں!

اور اس گہری اندھیری، سفاک، شام نما شب میں مدھو تنہا بیٹھی سوچتی رہی کہ ایسا کیوں ہو گیا؟

کیسا گھمنڈ تھا اس کو......شہید کی بیٹی......فوجی کی بیوی......وطن پر جو فدا ہو گا......''

''سبر امنیم: تم کو میں کیا کہوں؟ ہار تو میری ہوئی ہے۔''

مدھو پور پور کٹ کٹ کر اپنے سامنے گر رہی تھی کہ اس کے سارے سپنے راکھ بن چکے تھے اور وہ زندہ تھی!

میں پاپن ایسی جلی......''

مدھوکو یاد آیا، اس کی سہیلیاں کیسی جل گئی تھیں...... رما تو سدا کی منہ پھٹ، بول ہی پڑی ......'' یہ صاحب کس کھوہ میں چھپے تھے'' ......اور اس کی بات کنول نے اچک لی...... کہ رما کھوجتی رہ گئی اور اسے نہ ملے......سنیتا نے ہنس کر کہا۔ ''تو اپنے میاں کے گلے میں کالا دھاگا باندھ کر ورنہ ہماری نظر لگ جائے گی!''

نظر کس کو لگی؟ شری سبرامنیم سوامی کو؟ یا شریمتی مدھولتا کو؟

مدھو سوالات کے سمندر میں ابھر رہی تھی اور ڈوب رہی تھی اور پار اترنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا......

''سبرامنیم......سبرامنیم......دوں گی میں کانوں کا موندل......''

اسے برسوں پہلے ہی سنا ایک دوہے کا بول یاد آ گیا۔

سبرامنیم نے کانوں کا موندل بھی دیا اور گلے کا ہار بھی ......اس کے چہرے کی شوبھا بھی بڑھائی اور اس کا ابھیمان بھی ......اسے یاد آیا کیسے گھمنڈ بھرے لہجے میں اس نے اپنے بیٹے کو بتایا تھا......''ہاں تینوں فوجی ہیں بیٹا......تیرے دادا بھی نانا بھی اور پاپا بھی!''

اس کے باپ شہید ہوئے، سسر نے پنشن پائی اور ویروں میں ان کا نام اونچا ہوا......لیکن سبرامنیم تم؟ اور میں سبرامنیم؟ میری ماں اور ساس زیادہ بڑے نصیبوں والی ٹھہریں نا؟

اس بیچ چھوٹے بڑے ایسے کتنے مواقع آئے جب نیفا یاد آنے لگا......لیکن یہ؟ کس کس کا منہ روکوں؟......اس دن کیسا دہرا دُکھ مجھے درندوں کی طرح بھنبھوڑ رہا تھا......اور میں سیاپا کرتی ایک مجبور عورت......میں کاہے کو رو رہی تھی......اپنے سہاگ کے لئے؟

میں پاپن ایسی جلی......''

سبرامنیم! جس پل تم مجھے پہلی بار میسر ہوئے اس پل بھی میں تمہارے تئیں آدھی ادھوری وفاداری نبھا پائی......اور اب، جب تمہارا نام ڈھور ہی ہوں......اب بھی تو میں اپنے آپ کو ویسی ہی ویشیا سمان پریمیکا انوبھو کر رہی ہوں جو اپنے سراپے پر چھانے والے کے پاس پوری کبھی

نہیں رہتی!

سبرامنیم! کیا تمہارے مرجانے کا مجھے دکھ نہیں ہے؟

چھ سالہ سوامی پھر رونے لگا تھا۔

مدھو نے اسے بہلانے اور چپ کرانے کے لئے کھڑکی کھولی......سمندری ہوا کا ایک جھونکا اس کے چہرے کو چھوتا کمرے میں در آیا...... باہر مدراس اسٹیشن کی طرف جاتی ہوئی صاف ستھری چوڑی سڑک کچھ دور تک اونچی جا کر پھر ڈھلوان کی طرف جھکتی دکھائی دے رہی تھی، اور مدراس کی ایک گرم شام ارد گرد کے سارے گرما گرم ماحول کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں ناکام تھی۔

بولنے والا شام کی دھند اور اژدھام میں رل مل چکا تھا۔

مگر الفاظ اگیا بیتال کی طرح اپنی لال لال خون آشام آنکھوں سے اسے گھورے جا رہے تھے۔

مدھو کے من کی منڈیر پر...... بہت دور سے اڑ کر پاس آئی، آشا کی تتلی نے اپنے پروں کا لمس چھوڑا......چھبی دکھائی اور ایک بڑی منہ زور خواہش......اس کے اندر پاتال سے اٹھی......اور اس کے چاروں جانب رقص کرنے لگی......کوئی کہہ دیتا......تو بھاگیہ وان ہے بیٹی!''

مگر یہ تو اس نے بھی نہیں کہا جو سبرامنیم کا سامان لے کر آیا۔

ایک سفاک گھنے اندھیرے کی دلدل میں اس نے اپنے آپ کو دھنستا محسوس کیا۔

کہیں بہت دور......دوائیں یا فوجیں لے جانے والے جہاز کا بھونپو بجا، سمندر کے سینے کو روندتی فوجیں آگے بڑھیں......کسی ''بٹی کلاوا'' میں پھر کوئی ماں سینہ پیٹ کر اپنے کسی بیٹے کے لئے روئی......اور مدھو نے چھٹپٹا کر اس لمحے کو یاد کیا جب سبرامنیم کے دوستوں میں سے کسی نے اس کے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا تھا۔''

''بے چارہ بچہ! اس کے باپ نے اپنے گھر میں خود آگ لگائی اور پھر اسی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا۔''

''سبرامنیم......م......م!'' مدھو چیخ پڑی۔

میرا باپ مرا تو ''مجھے بہادر باپ کی بہادر بیٹی'' کہا گیا......اور تم مرے تو تمہارا بچہ ''بے چارہ'' کہلاتا ہے...... بے چارہ کہلاتا ہے سبرامنیم......تمہارا بچہ بے چارہ کہلاتا ہے!''

مدھو چیخ رہی ہے۔

جہاز کا بھونپو بج رہا ہے۔

ہٹی کلاوا میں کوئی ماں رو رہی ہے۔

اور جنوب کی شام کسی طرح ٹھنڈی ہونے کا نام نہیں لیتی۔

شاید کسی اوگھڑ نے اپنے جلے شریر کی راکھ تن پر مل لی ہے اور اپنی کھوپڑی میں اپنا ہی خون پی رہا ہے!!

☆☆☆

ایندھن

جب وہ نگر دوار پر پہنچے تو سوریہ مہاراج اپنا رتھ چندر ما کے حوالے کر رہے تھے۔

اب کے کتنے یگوں بعد ہم لوٹے ہیں دیوی ؟ مرد نے اپنے پیچھے آتی عورت کی طرف مڑ کر کہا۔

''ہاں سوامی کئی یگ بیت گئے۔'' عورت بہت دھیرے سے بولی۔

عورت کے چہرے پر ایسی لالیما جھلک رہی تھی جو سانجھ کی ڈھلتی بیلا کی ہم رنگ ہوتی ہے ،مرد نے عورت کا چہرہ دیکھا اور مسکرایا......عورت شاید اپنے گھر لوٹ کر بھی اسی ملن کا انو بھو کرتی ہے جو...... پھر مرد کے خیال رو بھٹک گئی......درختوں کے بیچ سے ہلکی ہلکی چھن چھن کر آتی آدھی سچی آدھی جھوٹی دھوپ جب نین کٹوروں میں لپ جھپ کرنے لگی تو اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر آکاش کی طرف دیکھا ...... دور آکاش کی دھوپ میں اڑتے پکھچی پکھیرو تیزی سے اپنے پر پھڑ پھڑاتے اپنے ٹھکانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''تب کی بات اور ہے'' مرد نے سوچا۔''تب تپسیا وی کی سانجھ بارہ برس ہوتی تھی پر اب تو کلجگ ہے......''

مرد نے پھر مڑ کر عورت کو دیکھا وہ اپنے آپ میں نہیں تھی ،اس کے مدھ بھرے نین ،بھرے کٹوروں کی طرح چھل چھل کر رہے تھے ......مرد نے پھر سوچا ...... آج اس کے نین نین نہیں ہیں مدھوشالا ہے...... پر یہ مدھو کاہے کی ہے؟ مرد کو یاد آیا......آج یہ اپنے گھر لوٹ رہی ہے ...... بیچاری......اس کے اندر اندر ایک بڑی کومل سی ممتا سے بھری اپنائیت کی چھایا نے سر اٹھایا کہ اس پر چھا جائے ......پر پل کے پل میں سر جھکائے کسی اور طرف مڑ گئی ......بیچاری

......اندر اندر ترس کی بھاؤنا تیری......اب نگر چھوڑ اسے کیا ملے گا؟

جب وہ نگر دوار پر پہنچے تو سوریہ مہاراج اپنا رتھ چندرما کے حوالے کر رہے تھے۔ ابھی وہ نگر کے اندر نہیں پہنچے تھے!

نگر دوار کے باہر چاروں طرف کھڑے جنگلوں میں جگنوؤں کی بہار رات کی جھم جھماہٹ کا کارن بنی ہوئی تھی ......آس پاس کسم ٹیسو ہارسنگھار اور کیسری کی سگندھ مدھ ماتی ہرن کی طرح چوکڑیاں بھر رہی تھی اور سارے جھاڑ جھنکاڑوں میں روپہلے سنہرے ڈانک جھل جھل کر رہے تھے۔

''دیوی یہ سب کیا ہے؟'' مرد نے آشچریہ جنک مڑ کر پیچھے آتی عورت سے پوچھا۔

''بھگوان۔'' عورت ہنسی، آپ کو کہاں یاد ہوگا؟ آج آپ کا جنم دن ہے؟ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا کہ اس شبھ دن کو آپ کے شردھالو بڑی شردھا اور آستھا سے مناتے ہیں۔

''اچھا اچھا۔'' مرد کی ہلکی ہنسی گونجی۔ وہ نگر دوار میں پرویش کر چکے تھے۔

مرد نے نگر دوار کے اندر پرویش کیا اور چاروں طرف بھونچکا سا تکنے لگا...... دیوی یہ کون سا نگر ہے؟'' مرد کی آواز کسی گہرے اندھے کنویں سے آتی لگ رہی تھی۔

یہ آپ کا نگر ہے بھگوان......آپ کا......''

''پر یہ میرے اندر تو کہیں نہیں ہے۔''

''یہ کیسے سمبھو ہے سوامی؟ آپ کا نگر اور آپ کے اندر آپ کو نہ ملے؟''

''ہاں دیوی۔ سمبھو ہے......جیسے اس کا بدلاؤ سمبھو ہے......تم بھی دیکھو...... یہ وہی ہے؟''

عورت نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنی اور بھگوان کی نگری کو دیکھا:

ہر گھر کے دروازے پر گنگا جمنی کواڑ لگے ہوئے تھے، کوٹھوں کی اونچی اونچی دیواروں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے جھم جھم چمک رہے تھے، عورتیں سولہ سنگار کیے، بالوں میں گج گج موتی پروئے، لمبے لمبے گھونگھٹ تانے، سہج سہج چھوٹے چھوٹے پگ بھرتی گزر رہی تھیں......پھلوں کی دوکانوں پر سیتا پھل، گلگل، آم، املی، جامن، گولر کھٹے، شفتالو، کٹھل، بڑھل، موسم بے موسم ہر طرح کے پھل رکھے ہوئے تھے، چاروں طرف مردنگ جل ترنگ، گھنگھر و طبلے، ڈھول مجیرے، بانسری

ستار، اکتارہ، اور سارنگی کی بھینی مدھر، لہریا لیتی دھنیں اور کہر میں کھوئی آوازیں، چاروں طرف پھیلے سب کچھ کو اور ادھیک میٹھا بنا رہی تھیں۔

''آپ کو بھرم ہو گیا ہے سوامی۔نگر میں کوئی بدلاؤ نہیں آیا ہے۔جیسا ہم چھوڑ گئے تھے ویسا ہی تو ہے۔''

اس پر مرد چپ رہا کیا کہتا ناری تو جنم جنمانتر سے یوں ہی جیتی ہے کہ جو ایک بار من میں بسا لیا پھر یگ بیت جائیں تو بیت جائیں پر بسا ہوا نہیں اجڑتا......اسی دھرتی سے تو میرا بھی جنمی...... کون گلی گئیو شیام......چتوڑ کے رانا نے کیا کیا اس کے سنگ نہ کیا، پر جو من میں آیا تن پہ اوڑھا ......مرد نے آہستہ سے اپنے گمچھے سے آنکھیں پونچھیں......سکھ کے پل میں یہ شوبھا نہیں دیتا۔''

''پر کیا سچ مچ یہ سکھ کا پل ہے؟''

ہاں کیوں نہیں؟ میں اپنے نگر لوٹ آیا ہوں۔اس سے زیادہ سکھ کا پل کیا ہوگا؟''

پر کیا سچ مچ یہ میرا ہی نگر ہے؟'' دیوی تم ذرا نیچے آؤ تو......میں بھی تو اپنا نگر دیکھوں!''

''عورت نیچے اتر آئی......مرد نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنا نگر دیکھا......''

ہر گھر نئے آرکیٹکچر کا نمونہ، اونچی اونچی بڑی بڑی بلڈنگیں، تمام بلڈنگوں میں ٹیوب لائٹ فٹ، سڑکوں پر کار اسکوٹر موپڈ سائیکل عورتوں کے سولہ سنگار میں آئی برو، کریم، پاؤڈر، لپ اسٹک، روژ، نیل پالش، لاکٹ، رنگ، گھڑی، ربن، طرح طرح کی ساریاں، سلک، براکٹ، چائنا سلک، امریکن سلک، امریکن جارجٹ...... اور نہ جانے کون کون سے کپڑے......پھر نئی کٹنگ کا بلاؤز، نئے ڈیزائنوں کی چپلیں، اور نہ جانے کیا کیا......بھجن اور کیرتن کی آوازیں بھی آ رہی تھیں مگر مرد نے غور کیا...... یہ مائک اور ٹیپ ریکارڈروں کا چمتکار تھا۔

''ایک ہی نگر کا دو روپ؟ میرے لئے الگ اس کے لئے الگ؟ مرد نے اداس ہو کر عورت کی طرف دیکھا۔

عورت اپنے آپ میں نہیں تھی، مرد کو پھر یاد آیا...... آج اس کے نین نین نہیں ہیں، مدھوشالا ہے......روم روم سے مدھو چھلکاتی عورت نے مرد کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور بھیڑ

میں دھکا کھاتے ہوئے دونوں آپ ہی آپ بڑھتے چلے جارہے تھے۔

''دیوی ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''اپنے گھر۔''عورت نے چلتے چلتے مڑکر مرد کی طرف دیکھا اور جیسے نشے میں جھومتی ہوئی بولی۔

مرد کچھ نہ بولا......بس اس کے ساتھ چلتا رہا اور سوچتا رہا......جانے کتنے یگوں کا بدلاؤ ہے ۔جھیلنا تو پڑے گا ہی......اتتھیوں کا یہ دیس۔اس بیچ جانے کون آیا کون گیا......مگر کیا کوئی گیا ہوگا؟ اس کے پُرکھے بھی تو اس دھرتی کے لئے اتیتھی ہی تھے......پھر اسی دھرتی سے تو بعد میں خسرو بھی جنما......موہے سہاگن کینی رے موسے نیناں ملائی کے۔

مرد عورت کے ساتھ چلتا رہا،گھسٹتا رہا اور سوچتا رہا......تنکا تنکا چن چن کر چڑیا اپنا سورگ بنائے،اک آندھی ایسی آئے سب اڑا لے جائے......مرد کو کیکئی یاد آ گئی......وہ بھی تو اک طوفان ہی تھی جس کے جھکڑوں سے بارہ برس تک اتھل پتھل مچتی رہی......اور وہ بارہ برس جان جوکھم میں ڈال کر بتائے گئے......مگر یہ جو یگ پر یگ بیت رہا ہے اور میں نہیں بیت رہا ہوں''

مرد اچانک چونکا......رام کا نام سمندر نام......کوئی شردھالو بڑی شردھا اور آستھا سے بھیگے سر میں کھڑتال بجاتا چلا جارہا تھا......رام کا نام سمندر نام......میرا نام نام انام......سمندر......جس میں ہر دھارا آن کر مل جاتی ہے۔پر سمندر......؟

''بھگوان۔اب تو میں تھک گئی۔گھر کب آئے گا؟عورت کے سوال پر مرد چونکا۔

مرد چونکا اور اپنے چاروں طرف دیکھ کر چکت رہ گیا......وہ کہاں آ گیا؟ کہاں وہ بھیڑ بھاڑ ......شردھالوؤں کا جمگھٹا......نگر جو مرد کو دوسرا نظر آیا عورت کو دوسرا......اور کہاں یہ سناٹا......''

''دیوی،یہ کیا بھید ہے؟''

''کیا ہوا سوامی؟''

''وہ نگر کہاں گیا جس کی گلیوں میں ہم گھوم رہے تھے۔''

''بھگوان کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ ہم اسی نگر میں تو ہیں!''

''کیا بالک جیسی باتیں کرتی ہو؟ ہم شمشان میں کھڑے ہیں اور تم کہتی ہو یہ نگر ہے!''

''سوامی اپنے کو سنبھالیے۔'' عورت نے کپکپا کر مرد کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا......دیکھئے سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا ہم چھوڑ گئے تھے......گھر، در دروازہ، پھل پھول، سر سنگیت......کچھ بھی تو نہیں بدلا بھگوان......کچھ بھی تو نہیں......''

مرد نے اسے ایسے دیکھا جیسے وہ چھوٹی سی ناسمجھ بچی ہو۔ اندر اندر ترس اور پیڑا کی تیز لہر اسے نوک دار درانتی کی طرح کاٹتی گذری......وہ پور پور کٹ کٹ کر اپنے اندر گر رہا تھا اور سوچ رہا تھا......یہ کیسا رہسیہ ہے کہ ہم دونوں اپنے نگر کی اور چلے......نگر دوار میں پرستھان کر گئے اور گھر کی اور چلے مگر گھر نہیں آیا...... نہ اس کے لئے آیا جس کے لئے سارا درشئے ویسا ہی ہے جیسا یگوں پہلے تھا اور نہ میرے لئے جو سنکوچ اور دوبدھا میں گھر اڈوب رہا ہے اور ابھر رہا ہے اور آگے بڑھنے کا راستہ نہیں ملتا...... وہ آخر کون سے چھن کا بندی بنا جو اسے چھوئے بنا بیت گیا اور پورا نگر اس کے آگے سے اوجھل ہو گیا......اور یہ عورت......''

''گھر چلئے سوامی!'' عورت چھوٹے سے بچے کی طرح مچلی۔

''دیوی۔ یہ تمہارا نگر ہی نہیں تو تمہیں تمہارے گھر کیسے پہنچاؤں؟''

''لیکن بھگوان۔ سارا کچھ میرے نگر ہی جیسا ہے۔''

''تو مورکھ ناری۔'' مرد جھلا گیا۔ کبھی تو اپنے اندر سے نکل اور باہر کے بدلاؤ کو سویکار کر۔''

''باہر کے بدلاؤ کو تو ویشیا سویکار کرتی ہے بھگوان!''

عورت نے سر جھکا کر بڑے بوجھل سور میں جواب دیا اور مرد تلملا کر رہ گیا......اب اس بات کا کیا جواب ہے؟ ......مرد نے اپنے اندر جھانکا......وہاں سناٹا تھا...... وہ گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگا......''جن جناور پھل پھول پکھچی پکھیرو......کچھ بھی!'' مرد کے اندر ایک اِکھچا نے سر اٹھایا۔

''اشمشان میں راکھ......راکھ میں مرے ہوؤں کی ہڈیاں۔'' اکھچا آپ ہی آپ جل بھن گئی۔

''گھر چلئے'' عورت مچلی

''دیوی۔تم میرا پران لے لو، پرنتو میرا ماتھا نہ کھاؤ...... یہ تمہارا نگر نہیں ہے......نہیں ہے......''

''تب مجھے یہ میرے نگر جیسا کیوں دکھتا ہے؟''

''اس لئے کہ تو اس نگر کو دیکھ ہی نہیں رہی ہے تو تو اپنے نگر کی درشنارتھی ہے۔'' مرد بڑی نرمی سے بولا......تو بار بار یہ بات کہہ رہی ہے......میں ہر بار تیری بات پر چپ رہا مگر سچ یہ ہے کہ مجھے پہلے پل میں بھی اس نگر میں میرے جیسا کچھ نہیں دکھا......اور اگر یہ تیرا ہی نگر ہے تو پھر تیرا گھر آتا کیوں نہیں؟

مرد کی اس بات پر عورت چونکی...... ہاں بھگوان، یہ پرشن تو آپ نے ٹھیک اٹھایا۔

پھر دونوں کے بیچ چپ کا مہاساگر لہریں مارتا......دونوں چپ کبھی ایک دوسرے کو دیکھتے ......کبھی اپنے چاروں طرف ......مرد اپنے چاروں طرف پھیلا اشمشان دیکھ رہا تھا جہاں اوگھڑ اپنے شریر پر بھبھوت ملے ہڈیاں چبا رہے تھے اور اوگھڑ واد پر بھاشن دے رہے تھے۔

اور عورت اپنے چاروں طرف اپنا اور بھگوان کا نگر دیکھ رہی تھی جس میں اس کا گھر چھوڑ سب دکھ رہا تھا......اور تب عورت کے من میں اک بات آئی ...... ہو نہ ہو اس میں کوئی رہسیہ ہے جسے بھگون نے جانا اور میں نہ جان پائی۔

''اچھا بھگون۔آپ ہی کی بات سچ'' ......عورت نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے ......''تو اب اس نگر سے نکلئے اور اپنے نگر چلئے۔'' وہ ایک چھوٹے سے بچے کی طرح گڑگڑا رہی تھی۔

''تیرا نگر اب بچا کہاں دیوی؟''

''کیسی بات کرتے ہیں آپ؟ عورت بلبلانے لگی ......''جو نگر مجھے دکھائی دیتا ہے اسے آپ میرا نگر نہیں مانتے ......جو آپ کو نظر آتا ہے وہ آپ کے لئے شمشان ہے......تو پھر میرا نگر کہاں ہے؟''

عورت سسک سسک کر رو پڑی۔

''تیرا نگر تو اس نگر کا ایندھن بن گیا دیوی۔'' مرد دکھ سے بھرے بوجھل لہجے میں بولا۔ ''جو اگیانی کے لئے نگر ہے اور گیانی کے لئے شمشان!''

عورت نے تڑپ کر مرد کا ہاتھ پکڑ لیا......جیسے کسی نے سان پھرائی، تیز دھار دار تلوار......اس کے پیٹ میں گھونپ دی ہو......عورت تڑپتی رہی اور مرد اسے سنبھالتا رہا......جیسے کوئی پوری گھپی تلوار آہستہ آہستہ شریر سے نکالے......اور عورت مرد کے ہاتھوں پر یوں گری رہی جیسے کوئی گھائل مینا مرہم رکھنے والے کے ہاتھوں پر......

مرد اس کٹھن پل میں اس کے انتر گھٹ تک اتر کر اس کے روم روم کو شانت کرنا چاہتا ہے۔مگر وہ وچھل ہے اور پور پور کٹ کر اپنے اندر گر رہا ہے۔اور سوچ رہا ہے ...... وہ خود بھی اتنا ہی گھائل ہے جتنی یہ......لیکن مرد نے پھر سوچا......جنم جنمانتر سے سہن کون کر رہا ہے؟

مرد کے پاس اس پرشن کا جواب نہیں ہے اور گھنی رات سر پر کھڑی ہے ......عورت اس نگر کو بار بار بیاکل ہو ہو کر دیکھتی ہے جس میں اس کا گھر چھوڑ کر باقی سارا نگر بالکل ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا اس نے یگوں پہلے چھوڑا تھا ...... اور مرد سوچتا ہے کہ وہ اب اس نگر کو کیا دیکھے جواب شمشان بن چکا ہے اور یاد کرتا ہے کہ پہلے تو تپسیاوی کی سانجھ بارہ برس پر ہوا کرتی تھی...... پر اب تو کلجگ ہے......اب کئی یگ بیت جاتے ہیں تب ایک سانجھ ملتی ہے!

☆☆☆

رحمت

''ابے اور تیز بھاگ''۔ بھاگتے بھاگتے مرلی دھرن نے چیخ کر کہا اور اپنے جانتے خود بھی اور تیز بھاگنے لگا۔

''اب اور کتنا تیز بھاگیں۔'' رحمت اللہ نے مرلی دھرن کا ساتھ دیتے ہوئے بھاگتے بھاگتے ہی جواب دیا۔

''سالے۔ کیلشوا پیچھے دوڑا چلا آرہا ہے۔'' مرلی دھرن نے رحمت اللہ کو دھمکایا۔

''آنے دو سالے کو بڑی مار ماریں گے۔''

دونوں بھاگتے جارہے تھے اور بولتے جارہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے دونوں ندی کے کنارے پہنچ گئے اور دونوں ہی بے سدھ ہو کر کنارے پر چت پڑ گئے۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا، چہرہ لال ہو رہا تھا، پیر کانپ رہے تھے۔ ندی بہتی چلی جارہی تھی۔

کیلاش کہاں ہوگا؟

وہ بیٹا کسی گلی میں چکرا رہے ہونگے۔

پھر مرلی دھرن اور رحمت اللہ دونوں پر ایک ساتھ ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

مگر سالے تم بھی بڑے حرامی ہو۔ اس کی چٹیا کیوں کھینچ دی تھی؟ مرلی دھرن نے ہنس کر رحمت اللہ کو گالی بکی۔

سالا بہت چپڑ چپڑ کر رہا تھا جی غصیا گیا۔

سو تو ہے بہت پھٹانی بگھارتا ہے۔ اس کا باپ داروغہ ہے تو سمجھتا ہے اسکول میں اس کے جیسا کوئی ہے نہیں۔

مگر بیٹا۔ آج اگر ہم اس کو لنگھی نہ مارتے تو تم کو تو رگید دیتا۔

یار کل تو تم بھی میرے کارن ماٹ صاحب سے ڈانٹ سنو گے؟

جان لو بچو ۔مٹھائی نہ کھلائی تو ہم گواہی دے دیں گے کہ رحمت اللہ نے کیلاش کی چٹیا کھینچی تھی۔

''سالے تم کو تو۔رحمت اللہ ہنستے ہنستے اس پر لد پڑا اور اس کو گھونسے مارنے لگا۔

مرلی دھرن خود کو بچاتا بھی جا رہا تھا اور بولتا بھی جا رہا تھا۔مٹھائی بنا کام نہیں چلے گا......نہیں چلے گا......''

یہ ایک دن کی بات نہیں تھی ،دونوں میں ایسی گاڑھی چھنتی تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر جی بھی نہیں پاتے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کا موقع بھی ڈھونڈتے رہتے تھے ۔ویسے کیلاش سے بھی ان دونوں کا کوئی بیر نہیں تھا مگر وہ ذرا لے دے کر رہنے کا عادی تھا اور اس کی گمبھیرتا کے لچھن ان دونوں کو پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے تھے ۔اس لئے جب بھی موقع مل جاتا یہ دونوں اسے چڑانے سے باز نہ آتے۔

اسکول میں رحمت اللہ اور مرلی دھرن ہمیشہ ایک بینچ پر بیٹھتے ،کیلاش بھی انہیں دونوں کے ساتھ بیٹھتا مگر یہ دونوں جب اسے چڑا دیتے تو وہ چند دنوں تک منہ پھلائے رہتا اور جب تک وہ خفا رہتا تب تک وہ کسی دوسری بینچ پر بیٹھا نظر آتا مگر یہ معاملہ دو تین دنوں سے زیادہ نہ کھنچتا ،اکثر تو کیلاش خود ہی کسی نہ کسی بہانے ان دونوں سے مخاطب ہو جاتا یا ان دونوں میں سے کوئی اس کی طرف بڑھ جاتا۔

آخر کیلاش بھی کتنے دن اکیلا رہ پاتا ،تینوں کا گھر بھی تو ایک ہی گاؤں میں تھا، روز تینوں کو ایک ہی وقت پر نکلنا تھا ایک ہی راستے سے جانا تھا ایک ہی راستے سے آنا تھا اور اسکول بھی کوئی بغل میں تو تھا نہیں ،ڈیڑھ دو میل کا سفر روز طے کرنا تھا۔

مرلی دھرن اور رحمت اللہ سے دوستی بنائے رکھنا کیلاش کی عادت سی بن گئی تھی ۔اتفاق سے رحمت اللہ اور مرلی دھرن پڑھائی میں تو تیز تھے ہی ساتھ ساتھ مرلی دھرن کی آواز میں جو رس تھا وہ

تو اسکول کے کسی لڑکے کو نصیب ہی نہ ہو سکا تھا۔ جس وقت وہ ایشور اللہ تیرو نام سب کو سُمّتی دے بھگوان والا بھجن گانے لگتا تو راہ چلتا مسافر بھی ٹھٹھک کے کھڑا ہو جاتا۔ جب اس نے پہلی مرتبہ یہ بھجن گایا تھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب، حساب کے ٹیچر رگھوونش سہائے اور اردو کے مولوی صاحب اکرام علی خاں سب رو دیئے تھے۔ دوسری طرف رحمت اللہ جب گیند لے کر گول کرنے کے لئے آگے بڑھتا تو دیکھنے والوں کی سانسیں رُک جاتیں۔ اس لمحے میں ایسا لگتا جیسے اس کے پیروں میں بجلی بھر دی گئی تھی۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ دوسرے اسکولوں سے مقابلہ ہوا تو شروع میں حریف پارٹی تابڑ توڑ گول کر کے جیت کے بالکل قریب پہنچتی دکھائی دیتی مگر ایسے ہر لمحے میں رحمت اللہ اپنے اسکول کی ہار کو جیت میں بدل دیتا اور پھر پورا میدان بجرنگ بلی کی جے اور نعرہ حیدری یا علی کی گونج سے گویا دہلنے لگتا۔ کیلاش اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ دونوں اسکول کی عزت ہیں مگر اس دن دونوں نے حرکت ہی ایسی کی تھی جس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔

کیلاش اندر اندر کھول رہا تھا۔ یہ دونوں سمجھتے کیا ہیں؟ سالے میری چٹیا کھینچتے ہیں۔ سالے مرلیا کو دیکھو اس کے پتا جی بھی تو چٹیا رکھتے ہیں۔ کوئی اگر رحمت اللہ کے باپ کی داڑھی کھینچ دے؟

اس دن گھر آ کر بھی اس کا موڈ ٹھیک نہ ہو سکا مگر اوپر سے وہ اتنا شانت تھا کہ کوئی سمجھ نہ پایا کہ اس کے اندر کیا اتھل پتھل مچی ہوئی ہے۔ بس ماں نے کیلاش کا چہرہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ کوئی بات اٹ پٹی ضرور ہوئی ہے۔

''بوا، کا بات ہے؟ چہرہ کا ہے اترا ہوا ہے؟''

ماں نے اتنے پیار سے پوچھا کہ اس کا دل بھر آیا۔ وہ ماں کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔ اس کے اندر کی ہلچل کم نہیں ہو رہی تھی، ایک تو اس کی چٹیا کھینچی گئی۔ دوسرے ان دونوں سے دوڑ میں وہ پیچھے رہ گیا۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی پکڑ لیتا، دو چار ہاتھ چلا دیتا تو دل کو چین آ جاتا مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ وہ آخر اپنی کس کس جھنجھلاہٹ پر قابو پاتا۔

ماں اس کا رونا دیکھ کے گھبرا گئی۔ اسے اپنی گود میں سمیٹ لیا جیسے مرغی اپنے بچے کو چھپا لیتی ہے...... ''بیٹا...... بیٹا...... کیا بات ہے؟ کیوں رو رہے ہو؟''

اس کا جی چاہا کہ ماں کو بتادے مگر پھر خیال آیا کہ ماں کو بتا کر کیا ہوگا۔ماں مرلی اور رحمت اللہ کو اگر کچھ کہے گی یا بھائی بابو جی کسی کو بتادے گی تو بات بڑھ جائے گی، ماں کو بھی یہ سن کر کچھ کم دکھ نہیں ہوگا۔وہ جانتا تھا کہ ماں بہت دھارمک ہے۔چٹیا رکھنے میں بھی اصل اِکچھا تو ماں ہی کی تھی ۔باپ تو ٹھہرے پولیس کے آدمی۔ان کو چوروں غنڈوں سے فرصت کہاں۔وہ تو بس رزلٹ کے دن پوچھتے۔''کتنا نمبر آیا؟'' زیادہ نمبر آیا تو واہ واہ کہیں خراب ہوا تو پولس والے انداز میں ڈانٹ ڈپٹ طے!

ماں ہی نے اسے بتایا تھا کہ سارے رشی منی چٹیا رکھتے ہیں۔ایک دن کہنے لگی کہ''بیٹا میں نے سپنے میں دیکھا کہ شیو جی کی جٹا آکاش سے میرے انگنا تک پھیلی ہوئی ہے اور بھگوان اسی جٹا پر پگ دھرتے دھرتے میرے آنگن میں اتر آئے ہیں، بیٹا پہلے تو میں چکت رہ گئی ، میرا ایسا سو بھاگیہ کہاں کہ شیو جی میرے آنگن آئیں، پھر لگا کہ نہیں ایسے سپنے جھوٹے نہیں ہوتے۔سچ مچ بھگوان ہی آئے تھے۔پھر سوچا کہ بھگوان کو جٹا کے سہارے کی آوشکتا کیوں پڑی۔تب مانو بھک سے اک دیا سا جل اٹھا، دل میں اک بات آئی کہ تیرے پِتا تو پولس کے آدمی ٹھہرے، انگریزی وردی پہنتے ہیں انگریزی بال رکھتے ہیں، ہونہ ہو بھگوان کی اور سے یہ کوئی سندیش ہے صلاح ہے، بہت سوچا تو یہی سمجھ میں آیا کہ پتی نہیں تو بیٹا ہی جٹا دھاری ہو جائے۔تیرا بڑا بھائی تو میری بات کو پاگل کی بڑ سمجھتا ہے، تو بھی ٹھہرا اسکول میں پڑھنے والا، ابھی سے جٹا دھاری ہو جائے گا تو جانے اس نگوڑے مارے ادھرمی سنسار میں تجھ کو کتنی کٹھنائیاں جھیلنی پڑیں۔میں جٹا دھاری ہونے کو نہیں کہتی پر تو چٹیا تو ضرور رکھ بیٹا۔آدمی کو چاہئے کہ وہ جو ہے سو دکھے۔اپنے متر رحمت اللہ کے باپ ہی کو دیکھ، وہ مسلمان ہے تو داڑھی بھی رکھتا ہے، تو ہندو ہے تو چٹیا رکھنے میں کیا جاتا ہے۔

ماں کا دل رکھنے کو اس نے چٹیا رکھ لی مگر وہ سمجھتا تھا کہ یہ بھی ماں کی آستھا ہے۔اس کے اسکول میں ڈھیر سارے ہندو لڑکے چٹیا نہیں رکھتے تھے۔خود ماسٹر لوگوں میں بھی زیادہ کو چٹیا نہیں تھی ......عام طور پر چٹیا رکھنے والے کو لوگ پنڈت جی کہہ کر پکارتے تھے اور داڑھی رکھنے والے کو مولوی صاحب' اس لئے کیلاش نے چٹیا رکھی بھی تو اس کے گھنے بالوں کے بیچ اس کی چٹیا تقریباً چھپی

رہتی تھی، وہ تو دادی مریں تو گھر کے سب لوگوں کو مونڈن کرانا پڑا۔اس کا مونڈن ہوا تو اس کے سر پر اب چٹیا ہی بچی، اور تو کچھ تھا نہیں۔

''سالوں نے میرے مونڈن کا فائدہ اٹھالیا۔'' اسے پھر رحمت اللہ اور مرلی دھرن یاد آ گئے ۔ادھر ماں تھی کہ بار بار پوچھے جا رہی تھی۔''ببوا۔ بتاؤ تم کاہے روئے تھے؟''

کچھ نہیں ماں۔آج میتھ میں کچھ غلط ہو گیا تو چکرورتی سر نے بہت زور سے مار دیا۔من اسی سے بھاری ہو رہا تھا، اور تم نے جو پوچھا تو رونا آ گیا۔

''دھت تیری کی۔'' ماں ہنس پڑی۔'' پگلے۔ماسٹر کی مار پر روتے ہیں؟ آج غلطی پر مارا ہے ،کل اچھا کروگے تو آشیرواد ملے گا۔''

''ہاں ماں۔سو تو ہے۔''

ماں کچھ اور بھی سمجھاتی رہی، کیلاش ماں کی گود میں سر رکھے سنتا رہا اور ہنکاری بھرتا رہا۔ بیچ میں کئی بار جی چاہا کہ ماں کو اصل بات بتادے مگر بس ایک ہی بات سوچ کر وہ چپ ہو رہا کہ ماں کو بتا کے کیا ہوگا۔بس ماں کو دکھ ہی تو پہنچے گا۔اس نے سوچا کہ بات تو رحمت اللہ اور مرلی دھرن کو سزا دینے کی ہے، ماں کو کیوں دکھ پہنچایا جائے۔

دوسرے دن وہ وقت سے پہلے ہی گھر سے نکل گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ رحمت اللہ اور مرلی دھرن کا سامنا ہو، وہ جانتا تھا کہ یہ دونوں مل کر اس پر بھاری پڑیں گے۔اس لئے جب دونوں ساتھ ہوں تو بھڑنا مورکھتا ہوگی اور اگر دونوں کو کچھ کہا نہیں، کچھ جواب نہیں دیا تو دونوں سالے سر پر چڑھ جائیں گے......جواب تو دینا ہی ہے مگر کیسے؟

سارا راستہ اسی ادھیڑ بن میں گزر گیا۔اسکول سے ذرا پہلے ایک گاؤں گوبند پور پڑتا تھا، یہاں سے بہت لڑکے اسکول آتے تھے مگر ابھی وقت ہی کہاں ہوا تھا جو کوئی دکھائی دیتا۔کیلاش اپنی سوچ میں گم چلا جا رہا تھا کہ اچانک آواز سنائی دی۔

''کیلاش......اے ہو کیلاش......اتّا پہلے کہاں جات ہو؟''

کیلاش نے نظر اٹھا کر دیکھا۔جس کچے راستے سے وہ گزر رہا تھا، اس کے دائیں طرف

کھلیانوں سے ذرا دور، جہاں سے گوبند پور گاؤں کی سرحد شروع ہوتی دکھائی دے رہی تھی ، وہیں پر اس کا کلاس فیلو رمیش کھڑا تھا اور اسے پکار رہا تھا۔

''اسکول جات ہیں۔'' کیلاش نے بلند آواز میں جواب دیا۔

''پگلا گئے ہو کا؟ ابھی نو بجا ہے۔''

''کا ہوا ایک دن پہلے جائے میں کوئی حرج ہے؟

''ارے ابھی گیٹ بھی نہیں کھلا ہوگا......آؤ آؤ پانی پی کے جاؤ۔ہم ہو ساتھ چلب۔''

کیلاش کو لگا رمیش بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ جھونک میں گھر سے تو نکل گئے وہاں جا کے کریں گے کیا؟ آس پاس کوئی دکان بازار بھی تو نہیں ہے کہ آدمی ذرا گھوم پھر لے، کچھ کھا پی لے ۔اسکول جا کے،اسکول کے باہر میدان میں بیٹھنا ہی تو پڑے گا۔

کیلاش گاؤں کی طرف مڑ گیا،رمیش کیلاش کو لئے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ رمیش کا مکان آدھا کچا آدھا پکا تھا مگر گھر کی حالت بتا رہی تھی کہ گھر والے بالکل مرے ٹوٹے نہیں ہیں۔ باہر کی بیٹھک بھی تھی جس میں ایک چوکی کے علاوہ ایک ٹیبل اور لکڑی کی تین چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں دیوار پر ایک تصویر بھی آویزاں تھی۔

''یہ؟'' کیلاش نے رمیش کا لایا موتی چور کا لڈو کھاتے ہوئے پوچھا۔

''دادا جی......مکھیا تھے۔''

''پتا جی......؟''

''گاؤں ہی میں پرچون کی دکان ہے۔''

دونوں کچھ دیر تک ادھر ادھر کی بات کرتے رہے مگر کیلاش کا جی تو رات سے اکھڑا ہوا تھا وہ بات کرتے کرتے چپ ہو جاتا، رہ رہ کر اسے رحمت اللہ اور مرلی دھرن یاد آ جاتے، یہاں بھی اس کا جی چاہا کہ اپنا دکھڑا بیان کرے مگر پھر سوچا کہ رمیش سے کہہ کے کیا ہوگا۔رمیش میرے لئے کیوں کچھ کرے گا۔ ٹھیک ہے رمیش سے اس کی کبھی لڑائی نہیں ہوئی مگر دونوں کا بہت گہرا یارانہ بھی تو نہیں تھا۔ایک گاؤں کا ہونے کی وجہ سے ساتھ ساتھ تو مرلی دھرن اور رحمت اللہ ہی رہتے تھے۔

رمیش نے تو کئی مرتبہ پینگ بڑھائی مگر اس نے مرلی دھرن، رحمت اللہ کی سنگت کہاں چھوڑی، اب رمیش سے مدد مانگنا تو اپنی بے عزتی ہی کرانا ہے۔

''کیلاش کل تم مرلی دھرن اور رحمت اللہ کو کاہے دوڑا رہے تھے؟'' اچانک رمیش نے سوال کا گولا داغ دیا اور کیلاش گڑبڑا گیا۔ ''ارے......بس یوں ہی......وہ سالے...... بڑے بدمعاش ہیں۔''

''کیا بدمعاشی کی؟''

''ارے نہیں......کچھ نہیں یار......بس ایسے ہی......''

''ہم تو سنا کہ رحمت اللہ نے تمہاری چڈیا کھینچ لی تھی''۔

رمیش نے ایک دم سیدھا حملہ کر دیا اور کیلاش ایک منٹ کے لئے سکتے میں آ گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ اس کو کہاں سے خبر مل گئی؟ چڈیا کھینچنے کی بات پھیلی تو بوال ہو جائے گا، اس کا دھارمک مہتو ہے۔ ای سالا تو نارد منی ہے۔ اس کو معلوم ہے تب تو مانو پورے اسکول میں بات پھیل جائے گی۔ لڑکے تو چڈیا کھینچنے کو چپت لگانا سمجھتے ہیں......سالا رحمتوا......وہ اندر سے بالکل بلبلا اٹھا...... اوسالا تو بھاگ گیا۔ اب پورا اسکول اس کو دیکھے گا اور کھیں کھیں کرے گا......لڑکے تو پُرکی بجانے کے لئے بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔

کیلاش اندر سے بہت بے چین سا ہو گیا۔ گھر سے جس بے چینی میں نکلا تھا وہ بے چینی اور بڑھ گئی تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ انکار کرتا ہے تو رمیش مانے گا نہیں...... ہاں کر دے تو رمیشوا ہی اس پر ہنسے گا۔

وہ رمیش کو ایک ٹک دیکھتا رہا، کچھ بولا نہیں۔ رمیش ہی بولتا رہا۔

ہم تو تم کو پہلے ہی بتا چکے تھے۔ مرلیا کو اپنی آواز پر اور رحمتوا کو اپنے کھلاڑی ہونے پر بہت گھمنڈ ہو گیا ہے اور تم ہو کہ انہی سب کی دم میں بندھے رہتے ہو......اسی دن کے لئے ہم ایک مرتبہ پہلے بھی بولے تھے کہ ای سب کے ساتھ مت رہا کرو۔

رمیش نے کیلاش کی بالکل دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ وہ اندر سے بالکل بھرا بھرا ہو رہا تھا

۔اسے لگا کہ وہ رو دے گا مگر اس نے اپنے پر کنٹرول کیا۔اب یہ دن آ گیا کہ رمیش جیسے پھسڈی اور خالی ہو ہلڑ کرنے والے لڑکے اس کو ان دونوں کے ساتھ رہنے کا اولہنا (طعنہ) دیں؟ مرلی اور رحمت جتنے بھی بدمعاش ہوں مگر ماسٹر لوگ تو دونوں کو اچھا کہتے ہیں۔گاؤں میں بھی دونوں کا کبھی کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔یہ رمیش تو کتنی بار مرغا بن چکا ہے۔

کیلاش نے رمیش کی بات کاٹی بھی نہیں اور رمیش کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائی۔

رحمت اسکول نہیں آیا تھا،صرف مرلی دھرن نظر آیا، چپ چاپ اور جھینپا جھینپا۔کیلاش سے وہ کچھ نہیں بولا۔چپکے سے اپنی مخصوص بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔کیلاش رمیش کے ساتھ بیٹھا تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ لڑکے کیلاش اور مرلی کو دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہے ہیں اور آہستہ آہستہ کچھ بات بھی کر رہے ہیں۔

کیلاش سمجھ گیا کہ رمیشوا نے نارد منی والی حرکت کر دی۔

اس دن اسکول میں اس کا جی نہیں لگا۔اساتذہ آتے رہے،کلاس لے لے کے جاتے رہے مگر کیلاش کہیں اور تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ رحمتوا کی بدمعاشی کا جواب کیسے دے۔رمیش تو بولتے بولتے بول گیا کہ تم کہو تو سالے کو پٹک کے ماریں۔مگر کیلاش ہاں کیسے کہہ دیتا۔ایک تو خود ہی وہ لڑائی جھگڑے سے دور بھاگتا تھا،دوسرے جانتا تھا کہ آج اگر دو چار لڑکوں کے ساتھ مل کے مار بھی لیں گے تو پھر کل یہ دونوں بدلہ لیں گے۔تینوں کو ایک ہی گاؤں میں رہنا تھا۔چھٹی کے دنوں میں کیا وہ بیٹھا رہے گا؟

کیلاش آٹھویں کلاس میں تھا۔ٹفن کے وقت نویں کلاس کا ایک لڑکا اس کے پاس آیا اور سیدھا سوال کیا۔''ارے کیلاش۔رحمتوا نے کل تیری چٹیا کھینچی تھی؟''

کیلاش ایک مرتبہ سٹپٹا گیا۔بھگوان۔ای تو سارے اسکول میں بات پھیل گئی۔''

پھر وہی ہوا جو ایسے ہر موقع پر ہوتا ہے۔کسی لڑکے نے کلاس ٹیچر سے کہہ دیا۔کلاس ٹیچر نے جب کیلاش کو بلا کر پوچھا تو کیلاش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔وہ مرلی دھرن اور رحمت اللہ کی حرکت سے غصے میں تو تھا ہی مگر بات پھیل جائے اور ماسٹر صاحب یا رمیش کوئی بھی دوسرا اس کا بدلہ

لے، یہ سوچ کر اس کو اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔اس نے سوچا۔ رحمتوا کو کیا ہم مار نہیں سکتے ؟ ڈیڑھ پنجری کا تو آدمی ہے۔ای پورا اسکول اپنا بھیجا کا ہے کو خراب کر رہا ہے؟''

مگر ماسٹر صاحب سے وہ یہ کہہ نہیں پایا۔ ماسٹر صاحب نے اس کو کہنے کا موقع بھی کہاں دیا ۔انہوں نے ایک مرتبہ اس سے پوچھا اور پھر اس کی ہاں نہیں کا انتظار کئے بغیر آپ ہی آپ بگڑ نے لگے ۔''تین دن کی بات ہے اور تم تین دن سے چپی سادھے ہوئے ہو؟ پہلے بتایا ہوتا ۔اب کل سے اسکول بند ہو رہا ہے اور رحمت اللہ غائب ہے تم بھی کم گدھے نہیں ہو''۔

ماسٹر صاحب کیلاش کو ڈانٹتے رہے اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

الیکشن کا زمانہ تھا۔اسکول کے سب ٹیچر ٹریننگ میں چلے گئے تھے ۔اسکول کو کلسٹر سنٹر بھی بنایا گیا تھا۔شہر سے جو پولیس آنے ولی تھی اس کے رہنے کا انتظام بھی اسی اسکول میں تھا۔اس لئے اسکول لگ بھگ ایک ہفتے کے لئے بند ہو گیا تھا۔مگر کیلاش محسوس کر رہا تھا کہ اس بات کو پر لگ گئے ہیں ۔گاؤں میں بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی ۔گلی راستے کھیت کھلیان ہر جگہ آتے جاتے کیلاش لوگوں کی باتیں سنتا، کچھ تو ذات کی بات ہوتی ، کچھ الیکشن لڑنے والوں کے وچار سبھاؤ کا چرچا ہوتا اور پھر گھوم پھر کے تان وہیں آ کے ٹوٹتی :''حد ہوگئی ۔کریملا کے بیٹوا نے دروگا جی کے بیٹوا کی چٹیا کھینچ دی ۔سر چڑھ گئے ہیں سب۔''

وہ تو خیر ہوئی کہ کیلاش کا باپ پچھلے ایک مہینے سے الیکشن وغیرہ کے چکر ہی میں ڈیوٹی سے گھر نہیں لوٹ سکا تھا اور ابھی مہینہ ڈیڑھ مہینہ گھر آنے کا کوئی چانس بھی نہیں تھا۔کیلاش نے چین کا سانس لیا تھا۔ پتا جی ہوتے تو اور بوال مچتا۔

گاؤں میں آج چہل پہل تھی ۔

خبر تو دو دن پہلے ہی سے گرم تھی کہ شہر سے نیتا لوگ آئیں گے مگر آج کا تو رنگ ہی دوسرا تھا ۔گاؤں کی مندر کے پاس والے میدان میں ٹریکٹر پر بہت سارا بانس ، بلا،ٹنٹ ،رسی ،کرسی ،چوکی وغیرہ آتی تھی ۔سویرے ہی سے شامیانہ تنانے لگا تھا۔مکھیا جی اپنے آدمیوں کو ادھر ادھر دوڑا رہے تھے اور آرڈر پاس کر رہے تھے۔

سمبارو اابھی تک کیوں نہیں آیا؟ اس کو فوراً بلاؤ۔ میدان کی گھانس اکھڑ جائے تب کرسی بچھے۔ منگلوا سالا کہاں گیا؟ اس کو کہو کہ ایک کپڑا لے کے کرسی ورسی صاف کرے۔'' ارے بُدھنا ۔تو یہاں بیٹھا ہے؟ آس پاس کے سب گاؤں میں جا کے خبر کر آ کہ نیتا جی دو بجے پہنچ جائیں گے۔''

اچانک مکھیا جی کو کچھ یاد آ گیا ۔انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے بہت زور سے پکارا......ارے سنیچر......سنیچر ارے......''

''جی مالک'' کچھ دور سے آواز آئی ۔ایک آدمی کچھ لنگڑاتا کچھ دوڑتا مکھیا جی کی طرف آتا دکھائی دیا۔ یہ آدمی، سنیچر، مکھیا جی کے پاس پہنچ کر، مکھیا جی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''سالا سویا رہتا ہے رے؟ ای سمئے گھر بیٹھے کا ہے؟ مکھیا جی نے سنیچر کو پہلے ایک ڈانٹ پلائی ،پھر ویسے ہی ڈپٹنے کے انداز میں بولے:'' دوڑ کے شیو گنج چلا جا اور جمراتی جمنا سے کہہ کہ اپنی بینڈ پارٹی لاؤڈ اسپیکر باجا سب لے کے دونوں ترنت آویں۔نیتا جی کا سواگت کیسے ہوگا؟

''بس مالک ابھی گئے ابھی آئے۔''سنیچر ذرا لنگڑاتا ہوا شیو گنج کی طرف دوڑ پڑا۔

سالا لنگڑا۔ چلا نہیں جاتا اور کہتا ہے ابھی گئے ابھی آئے۔مکھیا جی قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

گیارہ ساڑھے گیارہ کے آس پاس ایک ٹریکٹر گاؤں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ میدان کے پاس آ کے رکا تو مکھیا جی دیکھ کے خوش ہو گئے۔''ارے تم لوگ آ گئے؟ اچھا کیا!''

''مکھیا جی۔ یہ سب کیوں آ گئے ہیں؟'' گاؤں کے ایک نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے بیٹا۔ میری طرح بال پک جائے گا تب دنیا کی کچھ کچھ سمجھ آئے گی۔ بھیڑ کوئی ایسے ہی جمع ہوتی ہے؟ اس کے لئے کچھ نہ کچھ آکرشن کا سادھن تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔'' ہیجڑوں نے ٹریکٹر سے اترتے ہی ٹھمکا لگایا اور تالیاں بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

پورے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی ۔سب سے پہلے تو لڑکے دوڑے، پھر نوجوان جمع ہوئے، بوڑھے بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے آتے رہے جاتے رہے اور مکھیا جی سے ہلکے ہلکے مسکرا مسکرا کر اشاروں اشاروں میں کچھ کہتے بھی رہے۔عورتیں اور لڑکیاں بھی اپنے اپنے گھروں کی کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے میدان کی طرف دیکھ دیکھ کر کھلکھلاتی رہیں، مسکراتی رہیں اور ہم عمر ایک دوسرے کو کہنی مارتی رہیں۔

ایک بجتے بجتے میدان میں، جہاں شامیانہ لگا تھا، اس کے چاروں طرف جیسے ایک شہر آباد ہوگیا مونگ پھلی ، جھال مڑی ،تلکٹ ،مٹھائی ،بیلون اور کھلونوں کی دوکانیں تو تھیں ہی ، پتہ نہیں مکھیا جی نے خبر کروائی کی تھی یا ان سبھوں کو خود خبر ہوگئی تھی ، دائرے میں چکر لگانے والا جھولا اوپر جانے والی اور نیچے آنے والی ٹرالی ،کاٹھ کے ڈبے میں بند بائسکوپ ،قسمت کا حال بتانے والا طوطا ،آدمی کا صرف نام بتانے پر اس کے پاس پہنچ جانے والی گائے ،سب ہی تو پہنچ گئے تھے ، پورے گاؤں بلکہ صرف اسی گاؤں کے نہیں آس پاس کے گاؤں کے بچے بھی جمع ہو گئے تھے۔
جمن میاں کا لاؤڈ اسپیکر گونج رہا تھا......اے میرے وطن کے لوگو ذرا آنکھ میں بھرلو پانی......''

پھر دو بجتے بجتے مکھیا جی نے سب لڑکوں کو شامیانے کے باہر قطار میں کھڑا کروادیا کہ نیتا جی کے آنے پر انہی بچوں کو سب سے پہلے ان کا استقبال کرنا تھا۔مکھیا جی کے آدمی تیل پلایا پلایا ڈنڈا لے کر بچوں کے چاروں طرف کھڑے ہوئے تھے، بچوں کی حفاظت کے لئے۔

مگر مکھیا جی کے پہلوانوں کو اپنے چاروں طرف دیکھ کر زیادہ تر بچے ڈر گئے ۔سب کے سب تو لاؤڈ اسپیکر ،باجا، بھونپو ،دوکان اور بائسکوپ کے لالچ میں شامیانہ کے پاس جمع ہو گئے تھے۔اس کی کسے خبر تھی کہ مکھیا جی انہی کو استعمال کرلیں گے۔

منوج۔معلوم ہے؟ ای جو نیتا جی آرہے ہیں۔ای ہے اب کی مکھیہ منتری بنیں گے۔'' کیلاش نے لائن میں کھڑے کھڑے سنا اس سے دو کلاس آگے کا ایک لڑکا اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔

دھت کا ہے کو بے پر کی اڑا رہے ہو؟ ای سار کے جیتے کے لالے پڑے ہیں۔''

''ابھی ناہیں۔ابھیو سمیکرن نہیں ٹوٹا ہے۔''

''توں تو ایسا بولت ہو جیسے بھارت ورش میں اب کوئی دوسرا سمیکرن بن ہی نہیں سکت''

ٹھیک اسی وقت گاؤں کے اندر سے ایک شور سا اٹھا، کچھ عجیب سا شور جس میں نعروں کی گونج بھی تھی اور لاٹھیوں کی پٹا پٹ بھی، جیسے دروازوں کھڑکیوں پر لاٹھیاں برسائی جارہی ہوں۔

شامیانے کے باہر نیتا جی کا انتظار کرتے ہوئے لڑکوں کی قطار میں افراتفری مچ گئی ،لڑکوں کی لائن کے چاروں طرف کھڑے، تیل پلایا پلایا ڈنڈا لئے پہلوانوں نے لڑکوں کو روکنے کی بہت

کوشش کی مگر ایک مرتبہ جو بھگدڑ مچی تو پھر کوئی بچہ کہاں رکتا ہے۔کیلاش بھی بھاگم بھاگ گھر پہنچا۔ ماں حیران پریشان دروازے پر کھڑی نظر آئی۔گھر میں کیلاش کا بڑا بھائی اور ایک دو مرد بھی موجود تھے۔ان لوگوں کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ رحمت اللہ کے گھر کے آس پاس کچھ کہا سنی ہوئی اور پھر بات لاٹھی بھالے تک پہنچ گئی۔

بڑے بھائی نے گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔کیلاش کمرے میں بند ہو جانے والی بلی کی طرح سہما ہوا تھا، گھر میں چکر لگا رہا تھا،صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا پوری طرح یہ سمجھ گیا تھا کہ رحمت اللہ کے گھر کے پاس جھگڑا کیوں ہوا ہوگا......وہ بے تاب ہو کر باہری دروازے کی طرف دوڑا۔

''کہاں جات ہو؟'' بڑے بھائی نے ڈانٹ کر پوچھا۔

مرلی دھرن کے ہاں۔''

پاگل ہو گیا ہے؟ سر پھڑ واوے گا؟ چپ چاپ بیٹھ!''

کیلاش بالکل تھونس کر، پاس پڑی کرسی میں جیسے ڈھ گیا۔وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے ۔اسے رہ رہ کر گوبند پور کے رمیش پر غصہ آ رہا تھا۔پھر اچانک اسے ایک آئیڈیا سوجھ گیا، وہ گھر کے اوپری حصے کی طرف دوڑا جہاں کھپریل پر مٹی کی دیواریں تھیں اور اس کے اوپر چھپر......چھپر سے ذرا نیچے اس کچی دیوار کے ایک حصہ میں، گول سا،فٹ بال جیسی گولائی والا ایک سوراخ (جسے دیہات میں بھواری کہتے ہیں) کیلاش نے اسی چوڑے سوراخ میں اپنا سر گھسا دیا۔

سامنے شامیانہ میں ہلچل بڑھ گئی تھی......شامیانہ سے ذرا دور......جو سڑک گاؤں کی طرف آتی ہے اس پر کچھ گاڑیاں گاؤں کی طرف بڑھتی دکھائی دے رہی تھیں......رحمت اللہ کے گھر کی طرف سے ابھی بھی نعروں اور گریہ میں ملا جلا شور سنائی دے رہا تھا۔

پھر ایک پلنگڑی نظر آئی جسے چار آدمی کاندھوں پہ اٹھائے تھے اور اس طرف دوڑتے ہوئے جا رہے تھے جدھر وید جی کا گھر تھا۔کیلاش کو لگا کہ پلنگڑی پر رحمت اللہ کا باپ پڑا ہوا ہے۔رحمت اللہ کے گھر اور گلی کی طرف سے رونے کی آواز لگاتار اس تک پہنچ رہی تھی۔نیتا جی کی گاڑی بھی شامیانے

تک پہنچ چکی تھی ۔ جے جے کار کے بیچ نیتا جی شامیانے کی طرف بڑھ رہے تھے، منا کے لاؤڈ اسپیکر سے ایک بہت پرانے گانے کی آواز آ رہی تھی ......''مہماں جو ہمارا ہوتا ہے......وہ جان سے پیارا ہوتا ہے......''

مکھیا جی نے ٹریکٹر پر جن لوگوں کو لونڈا ناچ کے لئے بلوایا تھا، وہ پتہ نہیں کہاں تھے ۔ کیلاش کو تو لگا کہ اسٹیج پر، شامیانے کے اندر اور شامیانے کے باہر جتنے لوگ بھی تھے سب کے سب ٹھمکا لگا رہے رہے تھے، ٹھک ٹھک کر اپنا بھاؤ دکھا رہے تھے اور تالی بجا بجا کر نیتا جی کا سواگت کر رہے تھے۔

ادھر رحمت اللہ کے گھر پر ہاہا کار مچی ہوئی تھی ۔

کیلاش کو اچانک بڑی گھن کا احساس ہوا، اسے لگا سر سے پیر تک گندگی میں لتھڑا کوئی کیکڑ ا اپنے ہزار ہاتھوں اور پیروں کے ساتھ اس کے جسم پر چڑھ رہا ہے، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے قئے ہو جائے گی ۔اس نے تکلیف اور کراہت کے انتہائی احساس کے تحت اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے بدبدایا:

''ہے پربھو رحمتوا ٹھیک ہو!!''

☆☆☆

عرض خمار صحرا

اب کون تشنگان حقیقت سے یہ کہے
ہے زندگی کار از تلاش سراب میں

سبطین کو پورا یقین تھا کہ وہ سب کچھ سمیٹ لے گا اور دل جمعی کے ساتھ اپنے اصل کام میں لگ جائے گا۔

اسے شادی سے پہلے کے دن یاد آئے ،تھوڑے سے اچھے دن ،نوکری اور شادی کے درمیان کے دن ،ان دنوں شاید گرانی کم تھی یا شاید خرچ کم ہو،شروع شروع کی نوکری ،صرف ہزار روپے تنخواہ تھی مگر کم پیسے میں بھی چین زیادہ تھا۔شہر میں نوکری ہوئی تو سبطے کے والد نے ایک جان پہچان والے کے یہاں Paying guest بنوا دیا۔۵۰۰ر روپیہ کمرے کا،۱۵۰ ر کھانے کا،ڈیرے سے کالج چہل قدمی کے فاصلے پر،آنے جانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا، نیا شہر، جان پہچان کے لوگ کم ، پھر کچھ وہ خود بھی مزاجاً کم آمیز تھا ملا جلا کر وہ مہینے میں چار ساڑھے چار سو خرچ کرتا تھا اور باقی گھر بھیج دیتا تھا جس کے بارے میں اس کی ماں نے بتایا کہ اس میں سے بھی ڈیڑھ دو سو بینک میں ڈال دیا جاتا ہے۔

اسی پر سکون حال میں برس ڈیڑھ برس گزرے ہوں گے کہ ماں باپ کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور پھر شادی ہو ہی گئی ،شروع شروع بیوی گھر رہی ،وہ ہفتہ دس دن پر گھر چلا جاتا مگر آہستہ شیر کو خون منہ لگنے لگا ،سبطین کو احساس ہونے لگا کہ اب ہر متناسب جسم اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا ہے اور اس طرح دن میں دسوں بار اسے بیوی یاد آنے لگی ۔اسے ہنسی بھی آئی کہ اب وہ بیوی کو والدین سے زیادہ یاد کرنے لگا تھا۔

یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ اس کے آبائی شہر کے دو گروپ میں کچھ تناؤ پیدا ہو گیا اور پولیس والے اس محلے سے کئی لوگوں کو پکڑ کر تھانے لے گئے، سبطے کے باپ اپنی جوانی کے دنوں میں شہر کے باعزت سماجی کارکن تھے اور حکمراں سیاسی پارٹی سے وابستہ بھی۔ مگر امتدادِ زمانہ کے سبب ادھر اس کے والد کی عمر ڈھلی اور ادھر حکمراں جماعت حزب مخالف بن گئی۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا مگر بہرحال ایسا ہوا کہ پولیس والوں نے اس کے باپ سے بھی پوچھ گچھ کی۔ یہ صحیح ہے کہ تھانے نہیں لے گئے مگر بقول اس کے باپ کے، گفتگو کا رویہ غلط تھا، انہی دنوں گرمی کی چھٹیاں ہو گئیں، اس کے باپ کا اسکول لگ بھگ ڈیڑھ ماہ کے لئے بند ہو گیا، خود سبطے کا کالج بھی دو ماہ کے لئے بند ہوا، دو ماہ کے بعد فوراً ہی رمضان کا مہینہ شروع ہونے والا تھا۔ اس کی ماں کہنے لگیں:

''رمضان میں تنہا رہو گے۔ گرمی کے موسم میں دن بھر خالی پیٹ اور اس کے بعد بھی اپنی پسند کا کھانا نہیں، تمہارے باپ بھی یہاں کے حالات سے اوب گئے ہیں، دو تین مہینوں کے لئے کسی چھوٹے سے گھر کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے، ہم لوگ چلے چلتے ہیں رمضان کے آخر میں آ جائیں گے۔ دولہن بھی امید سے ہے اسے بھی وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے گا۔''

آخری بات انہوں نے آہستہ سے برسبیل تذکرہ، سرسری طور پر کہی مگر سبطے کے اندر اچانک ہی کچھ عجب انجانا سا سر گونج اٹھا۔ اندر ہی اندر ایک عجیب سا کیف، عجیب سی طمانیت کی نرم پھوار، بھرے پرے ہونے کا نہ محسوس کیا جا سکنے والا احساس، اُس نے سر اٹھا کر دالان سے باہر اوپر دیکھا، شروع مئی کی چلچلاتی دوپہر میں اسے آسمان پہ بادل کا ایک ٹکڑا سا نظر آیا۔ پھر بادل کا وہ ٹکڑا پھیلنے لگا، پھیلتا گیا پھیلتا گیا اور پھر اس کی آنکھوں کی حدوں کے اندر سمو سکنے والا آسمان گھنے بادلوں سے ڈھک گیا، ہوا ٹھنڈی ہو گئی۔ اس کا جی چاہا وہ اس ٹھنڈے ابر آلود پل میں اپنی ماں کی گود میں لیٹ جائے اور ماں اس پر اپنے آنچل کا سایہ کر دیں، اسی پل اسے بیوی کا خیال آیا۔

اس مرتبہ سبطے نے اپنی پوسٹنگ پر لوٹ کر پہلا کام یہ کیا کہ ایک بچے کی تصویر بنانی شروع کی۔

مصوری کا شوق شاید اسے جنم جنمانتر سے ملا تھا، شروع شروع اس کے باپ اس پر خفا ہوئے۔ اس کے گھر محلے کا جو پس منظر تھا اس میں اس کی گنجائش نہیں تھی مگر وہ کیا کرتا۔ طالب

علمی کے دنوں میں تو یہ حال تھا کہ سوئے سوئے آدھی رات میں وہ اٹھ جاتا اور تصویریں بنانے لگتا۔ان دنوں اپنے پاگل پن سے وہ خود عاجز تھا مگر وہ شاید بے بس تھا۔اسے خوابوں میں طرح طرح کے رنگ برنگے پیکر اور شبیہیں نظر آتیں اور اس کی آنکھ کھل جاتی اور جیسے کوئی ان دیکھی طاقت اس کے ہاتھ میں برش پکڑا دیتی۔ بہت دنوں بعد اس تخلیقی ابال میں آہستہ اہستہ کمی آئی۔ کالج جوائن کرنے کے بعد اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے اپنا جائزہ لیا، اسے لگا کہ اس تخلیقی وفور کو توجہ اور احتساب دونوں کی ضرورت ہے کیوں کہ اس کی تصویریں اب لوگوں کو متوجہ تو کرنے لگی تھیں مگر پھر بھی وہ مقبول نہ ہوسکا تھا۔ایسا کیوں ہوا؟ وہ کبھی کبھی سوچتا تو مخمصے میں پڑ جاتا، شاید مجھ میں کوئی کمی ہو، پھر سیلف پرجکشن اور لابی وغیرہ کی بات ذہن میں آتی مگر یہ سب بھی اس کے بس کے معاملے نہیں تھے۔غیرت فن کے سبب تو وہ کمرشیل آرٹسٹ نہ بن سکا تو اسے کیسے گوارہ کرلیتا ؟ابھی تک اس کے لئے یہی بہت تھا کہ اچھے اسکیچ پر لوگ تعریف کرتے اور معمولی تصویروں پر حیرت اور مایوسی کا اظہار کرتے۔

اس لئے کالج جوائن کرنے کے بعد اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے نئے سرے سے اپنے فن کا جائزہ لیا، تصویریں بنانے سے پہلے سوچنے لگا ارسٹوکریٹک اور گوتھک موڈ سے وہ شعوری طور پر کنارے ہٹا، سیزان اور پکاسو سے امرتا شیر گل اور فدا حسین تک مصوری کے پورے عالمی پس منظر کے بارے میں سوچا، پھر اپنے پس منظر اور پیش منظر کے بارے میں، رنگوں کی آمیزش کے بارے میں برش کے مدہم اور گہرے ٹچ کے بارے میں خطوں قوسوں اور دائروں کے بارے میں، اس کا فائدہ اسے ہی پہنچا اب اس کی تصویروں کے مختلف ڈائمنشنز پر باتیں ہونے لگی تھیں، بعض مبصرین نے یہاں تک لکھ دیا کہ اب سبطین کی بنائی تصویروں پر سبطین کا نام نہ بھی رہے تب بھی اس کے خطوط کا جو صعود و عمود ہے اور اس کے پس منظر کا جو افقی پھیلاؤ ہے۔یہ سبطین آرٹ'' کا اصل تعارف ہے۔

اب کے سبطین نے جس بچے کی تصویر بنانے کی ابتدا کی وہ بچہ اس کا دیکھا بھالا نہیں تھا مگر اسے تصویر بناتے ہوئے ذرا بھی دشواری نہیں ہورہی تھی۔ چارٹ پیپر پر برش ایسے چل رہا تھا جیسے ندی میں کشتی ہوا کے رخ پر چلتی ہے۔ایک پورا دن اس میں گزر گیا، محض چند گھنٹوں کا کام باقی تھا کہ اچانک اماں یاد آگئیں :ایک چھوٹے سے گھر کا انتظام کیوں نہیں کر لیتے ؟ دولہن امید سے ہے وہاں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھا دیا جائے گا۔''

وہ تصویر ادھوری چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

تین چار دن کی بھاگ دوڑ کے بعد مکان مل گیا وہ ایڈوانس دے کر واپس آ رہا تھا تو خیال آیا ۔''اب وہ تصویر مکمل کر لی جائے ،مگر پھر اماں یاد آ گئیں :''ان لوگوں کو جلد از جلد یہاں آ ہی جانا چاہئے ۔''

سبطین ماں باپ بیوی کو لے کر لوٹ رہا تھا تو ایک ہی خیال میں گم تھا:''وہ ادھوری تصویر مکمل کرنی ہے ۔'' مگر نئے گھر میں پہنچ کر اماں بگڑ اٹھیں :کل کو ایک بچے کے باپ بن جاؤ گے مگر یہ بھی پتہ نہیں کہ گھر میں سونے کے لئے چوکی چارپائی کچھ چاہئے ،چوکی چارپائی پر بچھانے کے لئے بستر چاہئے ،کھانا پکانے کے لئے چولہا چاہئے کھانے کے لئے برتن چاہئے ، پانی پینے کے لئے گلاس چاہئے ائے میاں تم کو تو نگوڑی تصویروں نے بالکل تصویر ہی بنا دیا۔اور ہم سب کو بھی شاید تصویروں کی طرح دیوار پر لٹکا دینا چاہتے ہو؟''

اس پر سبطین جو بھاگا تو بھاگتا ہی رہا اور ایک ماہ بعد جب حساب کرنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ خود اس کے پاس اور ماں کے پاس جو تھوڑا بہت جمع جتھا تھا وہ تو ختم ہوا ہی پی ایف سے نکالا پیسہ بھی ختم ہو گیا دوسری طرف مہینہ کا بجٹ بنایا تو معلوم ہوا آمدنی گیارہ سو خرچ بارہ سو۔

سبطین بڑے چکر میں پڑا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ مگر جو ہوا وہ تو ہو ہی چکا تھا اور جو ہونا تھا اسے ہونا ہی تھا۔ بیوی کی دوا شروع ہو چکی تھی ۔ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ پہلا بچہ ہے احتیاط ضروری ہے ادھر ماں بوڑھی ہو چکی تھیں ۔گھر کے کام کاج کے لئے دائی کا انتظام کرنا پڑا۔آمدنی گیارہ سو خرچ ساڑھے بارہ سو۔سبطین نے کچھ ٹیوشن پکڑ لئے تو اتنا ہوا کہ آمدنی اور خرچ کا تناسب برابر ہو گیا۔

مگر وہ تصویر؟ سبطین کو یاد آیا کہ اوائل مئی میں وہ تصویر شروع ہوئی تھی ،چند گھنٹوں کا کام باقی رہ گیا تھا اور جون کا آخری ہفتہ ہونے کو تھا تصویر مکمل نہ ہو سکی ،بیوی کا پانچواں مہینہ چل رہا تھا ،سبطین کی زندگی کا یہ پہلا فنی موڑ تھا جہاں Real اور Ideal کے بیچ کی خلیج کھل کر نمایاں ہو رہی تھی۔فن مصوری میں وہ سرریئلاتی مصور کی حیثیت سے جانا جاتا تھا اور اس وجہ سے اس کے یہاں خوابوں اور علامتوں کے ساتھ ساتھ استعجاب بھی پایا جاتا تھا ۔تجریدیت سے بھی ابھی

خدا واسطے کا بیر نہیں ہوا تھا لہٰذا اکثر امیجز پر تجریدیت بھی حاوی ہو جاتی تھی مگر فنی تجرید اور حیاتیاتی تجرید دونوں میں زیادہ کٹھن کون ہے اس پر غور کرنے کا اسے ابھی تک موقع نہیں ملا تھا شاید یہی معاملہ خوابوں اور استعجاب کے ساتھ بھی تھا پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ خود کو سمیٹنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اپنے اصل کام کی طرف دل جمعی کے ساتھ متوجہ ہو سکے گا۔اب تو کئی رسائل اس سے اس کے تخلیقی عمل کے بارے میں اس کا تاثر جاننے کے بھی خواہش مند تھے۔ایک مدیر نے تو آرٹ کی نئی جمالیات اور تیسری دنیا کے موضوع پر ایک مضمون کی بھی فرمائش کی تھی۔سبطین جانتا تھا کہ اس مضمون پر اسے اچھا پیسہ مل سکتا ہے۔وہ لکھ سکتا تھا اس کے پاس مواد بھی موجود تھا۔لیونارڈ سے سرولیم ڈالی پکاسو اور فدا حسین تک کی تصویروں کے فنی سفر اور اس کے تمام مراحل سے وہ بخوبی واقف تھا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر چار پانچ سال جم کر محنت کر لی جائے تو مصوری اس کے لئے مالی فائدے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔مگر اس کو موقع نہیں مل پا رہا تھا۔جولائی شروع ہوتے ہوتے رمضان آ گیا۔کوئی روزہ رکھے نہ رکھے۔اس سلسلے میں وہ بہت زیادہ Practicing نہیں تھا ۔مگر ہوا کیا وہی ڈھاک کے تین پات، اس نے روزہ نہیں رکھا پھر بھی مسئلہ تو بنا ہی رہا اس کی پہچان تو بہر حال ایک مخصوص فرقے والے کی حیثیت سے تھی، اس پر ستم یہ کہ اس نے مکان بھی ویسے ہی لوگوں کے درمیان لے لیا جو اس کے ہم نام تھے، ایسا شعوری طور پر نہیں ہوا مگر ہوا تو، اب خود کو یہ سمجھانے سے کیا فائدہ تھا کہ اس کے آبائی شہر میں فرقہ وارانہ تناؤ پیدا ہونے کے سبب اس کے والد کو خود ذہنی دھچکا لگا تھا اس دھچکے سے انہیں باہر نکالنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ ملی جلی آبادی میں مکان نہیں لیا جائے، مکان تو لیا جا چکا تھا اور اس کا نتیجہ بھی سامنے تھا کہ وہ بے روزہ دار ہو کر بھی دن میں گھر سے پان کھا کر نہیں نکل پا رہا تھا۔اس کا حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ دن میں گھر سے باہر نہ نکلا جائے مگر حاصل ؟ آنے والوں کا کیا کیا جا سکتا ہے؟ جن میں اسی فی صد محلے دار یا مسجد و مدرسہ کے لئے چندے کے محصل۔اس کو بار بار کلی کرنی پڑتی اور دانت ٹھیک سے مل مل کر دھونا پڑتا ۔عاجز ہو کر ایک ہفتہ بعد ہی اس نے روزہ رکھنا شروع کر دیا۔

رمضان ختم ہونے کو تھا تو سبطین کی ماں گھر لوٹنے کے لئے پر تولنے لگیں، سبطین نے بھی آج تک گھر سے باہر کوئی تیوہار نہیں کیا تھا، اس کی بیوی کا تو میکہ سسرال دونوں ایک جگہ تھا۔گھر میں گھر لوٹنے کی ایک ہلچل مچی ہوئی تھی، واپسی کے اس ارادے پر صرف ابا خاموش تھے، اماں نے

جس دن گھر لوٹنے کی بات کی اس کے دوسرے دن ابا نے سبطین سے کہا: ''دولہن کو جانے سے پہلے ڈاکٹر کو دکھا دو'' اور ڈاکٹر نے سارا معاملہ الٹ دیا، کہنے لگی: پہلا بچہ ہے احتیاط ضروری ہے ،چھٹا مہینہ ختم پر ہے اور بچہ کمزور ہے۔آپ اگر اپنے رسک پر جانا چاہیں تو جائیے۔''

پندرہ جولائی کے بعد کا موسم تھا مگر حبس سے دم گھٹنے لگا،تصویر اب تک ادھوری پڑی ہوئی تھی ۔صرف چند گھنٹوں کا کام باقی تھا اور اسے امید تھی کہ وہ بقیہ سب کام سمیٹ کر اصل کام کی طرف جلد ہی متوجہ ہو سکے گا۔

ابا نے صورت حال کے پیش نظر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تو اماں کو اب دوسری فکر لگ گئی :''اب جب عید بھی یہیں کرنی ہے تو عید کا کچھ انتظام بھی تو کر لینا چاہیئے۔''

''اب کہاں سے انتظام کروں؟سبطے نے اماں کو دیکھا۔سارا پیسہ تو ختم ہو گیا۔ پی۔ایف میں بھی نہیں ہے۔''

''اتنا پریشان کیوں ہوتے ہو؟'' ابا اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر ہنسنے لگے ''تمہارا پیسہ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہے۔جا کر لے آؤ۔''

یہ سن کر سبطے قدرے مطمئن ہوا۔دوسرے دن وہ گھر کے لئے روانہ ہونے لگا تو ابا نے کہا:''جو ہے سب نکال لینا۔''

''کیوں؟ سب کیوں؟ عید کے بعد تو مہینہ ختم پر ہی ہے۔میری تنخواہ مل جائے گی۔''

''تنخواہ سے کام نہیں بنے گا۔ولادت کے وقت ممکن ہے ضرورت پڑے۔''

تو اس وقت تک ہم لوگ یہیں بیٹھے رہیں گے؟''

''تو اور کہاں جائیں گے؟''

''کیوں گھر نہیں جائیں گے؟''

''عجیب بیوقوف آدمی ہو؟ جب چھٹے مہینے میں ڈاکٹر نے اجازت نہیں دی تو آٹھویں مہینے میں اجازت دے گی؟''

برسات کی امس بھری گرمی بدن میں کانٹے چبھونے لگی۔

عید کے ایک ہفتہ بعد انگریزی مہینہ ختم ہوا تو اس کی تنخواہ بھی مل گئی۔سبطین نے حساب کیا:''تنخواہ کا پیسہ اور ابا کے اکاؤنٹ میں سے لایا ہوا اس کا''اندوختہ'' ملا جلا کر اس کے پاس تقریباً ساڑھے چار پانچ ہزار روپے تھے۔بڑا اطمینان سا ہوا اور سوچا اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوا جا سکتا ہے......وہ ادھوری تصویر......اس نے سوچا اب اسے مکمل کر ہی لیا جائے......بس کل ہی ......مگر دوسرے دن سوال یہ اٹھا کہ یہ مصوری کا کاروبار کہاں پھیلایا جائے۔دو کمروں کا اس نے مکان لیا تھا۔ایک کمرے میں ابا اماں ایک کمرے میں بیوی، بیوی کو پہلی ولادت ہونے والی، عورتوں نے سمجھا دیا ہوگا کہ اس مرحلے میں عورت کو خوش رہنا چاہئے، پس سبطے جب اپنے کمرے میں جاتا تو بیوی یا تو وہ رومانٹک ہوجاتی یا ہنسنے ہنسانے کی بات کرنے لگتی۔اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اسے خموش کر دیا جائے اور مصوری کا کاروبار پھیلا دیا جائے ،دوسرے کمرے میں ابا بھی اور اماں بھی......ابا چپ ہوتے تو اماں بولتیں......سو تصویر ادھوری کی ادھوری ہی رہی، پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارا تھا۔اسے پورا یقین تھا کہ وہ خود کو سمیٹ لے گا اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ ٹیوشن بڑھا دے گا اور مکان بدل لے گا۔کم از کم تین کمرہ اشد ضروری تھا۔

ارادہ عمل اور نتیجے کی تکون پر ابھی وہ کھڑا ہوا تھا کہ اسٹرائک ہوگئی۔اس کی سن گن کچھ پہلے سے بھی مل رہی تھی مگر رمضان عید اور بینک ڈاکٹر وغیرہ کے چکر میں وہ اس لمحے کو بالکل فراموش کر بیٹھا تھا اب جو اچانک فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے فیصلے کی خبر ملی تو اس کے تو گویا ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ اسٹرائک ہوئی اور تین ماہ کھنچ گئی۔

سبطین اپنی تنخواہ کا بچا ہوا جو پیسہ باپ کے اکاؤنٹ میں سے نکال لایا تھا، پہلے وہ ختم ہوا پھر باپ کے سیونگ اکاؤنٹ اور پی۔ایف کی باری آئی۔آخر ہوتے ہوتے صورت حال یہ ہوگئی کہ بیوی کی ولادت سے ایک ہفتہ پہلے گھر میں سو روپیہ بھی نہیں تھا وہ تو حسن اتفاق کہ ضرورت سے چند دنوں قبل اسٹرائک ختم ہوگئی اور تین ماہ کی تنخواہ ایک مشت مل گئی۔سبطین کو کچھ راحت ملی، اس نے سوچا ساری احتیاط تو برت ہی لی گئی، دوا اور غذا میں بھی کوئی کمی نہیں ہونے دی گئی، اب کیا ضرورت ہے کہ آپریشن کی ضرورت پڑے؟ امس کچھ کم ہوگئی تھی، برسات کی ہلکی ہلکی بھیگی ہوا کا لطف!

اس نے اندازہ لگایا کہ اگر ہزار ڈیڑھ ہزار میں یہ معاملہ نپٹ جاتا ہے تو اس کے پاس کم از کم

تین ہزار ضرور ہی بچ رہیں گے، پھر اس نے جوڑا: فیڈریشن سے حکومت کے وعدے کے مطابق ڈی اے اور انٹریم ریلیف کا بقایا کم ازکم تین ہزار......اسے یہ سوچتے ہوئے بہت اچھا لگا کہ چھ ہزار کی بچت ممکن ہے۔ موسم بالکل کھلا کھلا تھا۔ اسے گمان ہوا کہ زندگی اب اپنے حساب سے جینے کا شاید سمئے آگیا۔ اسے یقین تھا کہ وہ آخر کار خود کو سمیٹ کر اصل کام کی طرف متوجہ ہو سکے گا۔ چند دن ہوئے پھر ایک رسالے نے درخواست کی تھی تو سبطین نے سوچا تھا کہ وہ ادھوری تصویر مکمل ہو جاتی تو اسے ہی بھیج دیتا۔

مگر موقع کہاں ملا؟ اسٹرائک ختم ہونے کے بعد نئی مصروفیتیں شروع ہوگئیں اور ان سے ابھی نجات بھی نہیں ملی تھی کہ ہسپتال کی دوڑ شروع ہوگئی۔

''نارمل ڈلیوری بھی ہوتی ہے تب بھی کم ازکم دو تین دنوں کا چکر تو رہے گا ہی۔'' سبطین نے ہسپتال کے برآمدے سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔

بادل پھر گھرنے لگے تھے، ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی، ابھی شام نہیں ہوئی تھی پھر بھی ہسپتال کی چہار دیواری کے اندر لگے پھول پودے، اشوک کے اور سرو کے درخت دائیں سمت بنی لوہے کی بینچ بائیں کنارے پر نرسوں کے کوارٹر سب موسم اور ماحول کی دھند میں کھوتے چلے جا رہے تھے......''شاید چشمے پر پانی کی پھوار پڑ گئی ہو'' سبطے نے اپنا چشمہ صاف کیا مگر سامنے سارا منظر پھر بھی دھندلا ہی رہا......اسے لگا: آنکھ میں کچھ کنکری ونکری چلی گئی ہے'' اس نے جیب سے رومال نکالا۔ آنکھیں صاف کیں۔ رومال میں نمی جذب ہوگئی تھی اور فضا میں نمی سی تیر رہی تھی......

اسی پل اس کی ماں اس کے پاس آئیں: ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''جی......جی کچھ نہیں......کچھ بھی نہیں''

ماں ابھی اس کے پاس سے ہٹی بھی نہیں تھیں کہ ایک نرس اس کے پاس آئی: ''ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہی ہیں''

''دیکھئے۔ بچہ الٹا ہے۔ آپریشن کرنا ہوگا۔ دستخط کر دیجئے۔'' ڈاکٹر کی آواز اسے بہت دور سے سنائی دی۔

اس نے ایک سحر زدہ کی طرح کاغذ پر دستخط کر دیئے۔ڈاکٹر اندر جا چکی تھی۔

''آپریشن کا مطلب''، سبطین کو خیال آیا۔''کم از کم چار ساڑھے چار ہزار روپے کا خرچ!''

اسے اپنی بنائی ادھوری تصویر یاد آئی ...... چہرہ تو وہ بنا چکا تھا......موسم دھند میں کھویا ہوا تھا ۔امس پھر بڑھ گئی تھی۔

تقریباً پینتیس چالیس منٹ بعد نرس نے سبطین کو اس کا بیٹا لا کر دکھایا۔ بیٹا اس کی اپنی سوچ اور بنائی تصویر کے مطابق نہیں تھا۔

''ایسا کیوں ہوا؟''

جو تصویر اس نے بنائی وہ بھی اس کی تخلیق ریاضت کا نتیجہ تھی اور جو بیٹا اس کے نطفے سے پیدا ہوا وہ بھی اس کی صلاحیت تخلیق کا ثمرہ تھا پھر دونوں میں مماثلت کیوں نہیں؟ سبطین ہسپتال کے برآمدے میں کنارے پر ایستادہ ایک ستون سے ٹک کر کھڑا تھا۔اس کے آگے چاروں طرف بارش کی رم جھم پھوار لگاتار جاری تھی ۔آسمان بادلوں سے پوری طرح ڈھک گیا تھا، نرس بچہ لے کر جا چکی تھی ،ماں ذرا دور پر ایک بینچ پر تھوڑے اطمینان اور گہرے افتخار کے ساتھ پروقار انداز میں بیٹھی تھیں۔ان کے چہرے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

''کیا میں خوش نہیں ہوں؟ سبطین نے سوچا......نہیں نہیں خوش نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے میرا پہلا بیٹا ہے ......مگر پھر بھی اداسی کی یہ بے ساختہ لہر؟ کیا صرف اس لئے کہ اس کے خیال اور اظہار میں فرق واقع ہو گیا؟

مگر کیا یہ طے ہو گیا کہ اس کے خیال اور اس کے اظہار میں فرق واقع ہو گیا ہے؟

اچانک وہ ایک شدید خواہش کے حصار میں گھر گیا ۔اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً گھر جائے اور اپنی بنائی تصویر لے کر آئے اور دیکھے کہ اس کے خیالی بیٹے اور حقیقی بیٹے کے درمیان کیا کیا مشترک ہے اور کیا کیا مختلف؟

مگر شاید ابھی یہ ممکن نہیں تھا۔اس کی بیوی ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر نہیں آئی تھی ۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں وہ باہر آئے گی؟ باہر آ بھی گئی تو کیا خبر ہوش میں رہے گی یا نہیں؟ کبھی کبھی تو پانی

چڑھنے کی بھی ضرورت ہو جاتی ہے، سبطین کو یاد آیا اس کی ایک رشتہ دار کو آپریشن کے بعد بھی چوبیس گھنٹوں تک پانی چڑھتا رہا اور ساری دوا اور غذا اسی سلائن کی بوتل میں انجکٹ کی جاتی رہی ، وہ کپکپا گیا خدا کرے ایسا نہ ہو، یہاں تک تو اس نے کسی طرح جھیل لیا تھا مگر اب آگے کی صلاحیت اس میں بالکل نہیں تھی اور اگر کہیں ایسا ہوا تو پھر تو گویا پیٹ ہی پر لات پڑے گی ۔ مہینے کے خرچ کے علاوہ اس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

سبطین کو اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی اور اپنی بیچارگی پر افسوس بھی ہوا۔اس کے کالج میں لکچرر ہو جانے سے اس کے ماں باپ کتنا خوش تھے، محلے اور شہر میں اس کی کامیابی کا شہرہ ہوا لوگوں نے اس کے والدین کو مبارک بادیاں دیں، کچھ خوش ہوئے کچھ کو رشک ہوا کچھ حسد کی آگ میں جلے مگر جو جوتا پہنتا ہے وہی جانتا ہے کہ جوتا کہاں کہاں کاٹ رہا ہے۔اسے تو کبھی کبھی لگتا کہ اس سے اچھا تو اس کا وہ کلاس فیلو ہے جو بی اے کرنے کے بعد اپنے والد کی دوکان پر بیٹھ گیا اور کپڑے سینے لگا۔اب تو اس نے کافی پیسہ کما لیا ہے۔پچھلی مرتبہ ملا تھا تو بتا رہا تھا کہ اس نے زمین خرید لی اور مکان بنانا شروع کر دیا ہے۔لائنس کلب کا ممبر بھی ہو گیا ہے اور اس واسطے سے اس۔ڈی۔او، ایس۔پی، ڈی۔ایم سے اس کے ملاقات بات ہوتی رہتی ہے۔سبطین سے اس نے کہا تھا:

''کوئی ضرورت ہو تو بتانا۔ پولیس انسپکٹر سے ڈی ایم تک میں کام کرا سکتا ہوں۔''

وہ حیرت سے اپنے دوست کو تکتا رہا، یہ مجھے کہہ رہا ہے؟ سبطین احمد کو جس کی تنخواہ ڈی ایم کی تنخواہ کے برابر ہے وہ کیوں ایس ۔پی ۔ڈی ۔ایم کے پاس جانے لگا؟ انہیں ضرورت ہے تو وہ اس کے پاس آویں'' مگر وڈمبنا یہ ہوئی کہ جب اس کے آبائی شہر میں فرقہ وارانہ تناؤ بڑھا اور تھانے والے اس کے والد سے بھی پوچھ گچھ کرنے لگے تو وہ سیدھے اسی دوست کے پاس گیا: یار ایس پی سے ذرا کہہ دو۔تھانے والے ابا کو دوبارہ ڈسٹرب نہ کریں۔'' اس کا دوست فوراً اسے لے کر ایس ۔پی کے یہاں گیا اور اسے باہر کھڑا کر کے اندر ایس ۔پی سے ملنے چلا گیا تو باہر کھڑے کھڑے اسے یاد آیا کہ اس کا بیسک اسکیل ڈی۔ایم کے برابر ہے۔

اسے پھر اپنی بنائی تصویر یاد آئی ۔اب اس تصویر کے ساتھ تین معاملات جڑ گئے تھے۔اول تصویر ادھوری تھی اسے پوری کرنا تھا۔دوم فیصلہ کرنا تھا کہ اس کے ذہن سے اپجی تخلیق اور اس کے

نطفے سے جنمی تخلیق میں فرق کیوں ہے؟ اور سوئم یہ کہ واقعی فرق ہے یا نہیں اس بارے میں ذہن کو کسی ایک نکتہ پر مرتکز کرنا تھا۔

مگر تینوں معاملات کے سلجھ جانے کا انحصار اس بات پر تھا کہ وہ گھر پہنچ جائے اور پورے سکون کے ساتھ اپنی بنائی تصویر کے ساتھ جڑ سکے، سبطین ناامید نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ سب کچھ سمیٹ لے گا اور دل جمعی کے ساتھ اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہو سکے گا مگر فی الحال تو اصل مسئلہ گھر پہنچنے کا تھا۔ بیوی آپریشن تھیٹر میں تھی، خود اس کا دل اس کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ بیوی کو اس حال میں چھوڑ کر گھر کی طرف چل دے اور بفرض محال اگر ایسا کرنے پر وہ دل کو تیار بھی کر لے تو اس بارش کا کیا علاج جو ایک رفتار سے ہو رہی ہے تو ہو رہی ہے۔ پورے آسمان پر اتنے گہرے بادلوں کی پرت جمی تھی کہ پانچ بجے شام میں بھی مغرب بعد کا منظر درپیش تھا۔ اب وہ صرف اندازہ لگا پا رہا تھا...... وہاں پہ اشوک اور سرو کے درخت...... وہاں دائیں سمت لوہے کی بینچ، بائیں طرف نرسوں کے کوارٹر......

سبطین نے محسوس کیا کہ چیزوں کو دیکھنے کے لئے چیزوں کا نظر آنا ضروری نہیں ہے، اصل مسئلہ اس ماحول کا ہے جس سے چیزیں اور لوگ جڑے ہوئے ہیں۔ اگر ناظر ماحول سے جڑا ہوا ہے تو ماحول سے منسلک اشیاء اور اشخاص سے بھی وہ جڑا رہے گا۔

اسے اپنے آپ پر ہنسی آ گئی۔ ''یہ سراسر فلسفہ طرازی ہو گئی۔'' اسے اپنا ایک بھائی یاد آ گیا جو اس طرح کی سوچ سے بہت چڑتا تھا: سبطے بھائی۔ زندگی کی بات کیجئے۔ خالی خولی فلسفہ بگھارنے سے زندگی کرنا اسان نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ سب تو ذہنی گریز اور فرار کا یک خوبصورت طریقہ ہے۔''

کیا واقعی یہ فرار ہے۔ اگر یہ فرار ہے تو حقیقت پسندی کیا ہے؟ بچے کی پرورش و پرداخت کے بارے میں غور کرنا اور ادھوری تصویر کو بھول جانا؟

یعنی آرٹ کو صرف تفریح اور فاضل وقتوں کی مشغولیت کے طور پر لیا جائے؟

نہیں...... آرٹ کی افادیت کا پہلو بھی تو آرٹ کے ناقدوں نے پیش کیا ہے؟

یعنی ایک رسالے نے تصویر مانگی تو اسے بھیج دیا جائے تاکہ کچھ پیسے مل جائیں؟ آرٹ کی مالی افادیت؟ کمرشیل آرٹ کی بنیادی شناخت کیا ہے؟

سبطین سوالات کے بھنور میں ابھر ڈوب رہا تھا اور وقت سانتا کلاز کی طرح آرہا تھا اور جارہا تھا اور نظر نہیں آرہا تھا، دور کہیں مغرب کی اذان ہو رہی تھی اسے ابا یاد آئے۔ وہ اکیلے میں بور ہو رہے ہوں گے۔ وقت اور موسم نے اس کے پیر باندھ رکھے تھے ورنہ ایک مرتبہ تو دوڑ کر گھر ہو ہی آتا۔ ویسے چونکہ اس کے ساتھ ہی جوائن کرنے والا اس کا کلیگ سمن کمار سنگھ شام میں آیا تھا اور اس نے سمن کو تاکید کردی تھی کہ ابا کو ولادت کی خبر دے دینا اور بتا دینا کہ میرے گھر آنے میں دیر ہوسکتی ہے اس لئے وہ بہت زیادہ متفکر نہیں تھا پھر بھی ایک خیال بار بار آرہا تھا کہ نیا شہر ہے، ابا کے ملنے والوں کا ابھی کوئی حلقہ بھی نہیں بنا ہے وہ دوپہر میں گھر سے یہاں چلا آیا۔ اب رات ہوگئی۔ ابا تنہا ہوں گے، بور ہو رہے ہوں گے، بوا بھی کھانا دانا پکا کر جا چکی ہوں گی۔

اچانک اس کی نگاہ اماں کی طرف گئی۔ وہ لپکی ہوئی اسی کی طرف آرہی تھیں۔ چلو چلو نرس دولہن کو روم میں لارہی ہے۔''

وہ تیز قدموں سے کمرے کی طرف لپکا۔ اب وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ نرس کے پہنچنے سے پہلے کمرے میں پہنچ کر بیڈ پر کی پوری طرح سے درست چادر اور تکیے کو پھر سے درست کیا۔ تب تک نرس کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کی بیوی نارمل تھی۔ اماں نے آگے بڑھ کر اپنے پوتے کو گود میں لے لیا۔ نرس نے اس کی بیوی کو اسٹریچر پر سے بستر پر لٹا دیا۔ سلائن والی بوتل اس کے بستر سے لگے لوہے کے سلائن اسٹینڈ میں لٹکا دی، سلائن کی رفتار درست کی، سبطین کو ہدایت کی کہ وہ بیوی کا ہاتھ پکڑے رہے تاکہ تھوڑا بہت ہوش آنے پر وہ ہاتھ ادھر ادھر نہ پٹکے۔

سبطین پوری توجہ کے ساتھ بیڈ کے پاس رکھے ٹیبل پر بیٹھ گیا اور بیوی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ مسلسل بنائے رکھا۔

ایک ہی متن مختلف حالات میں مختلف معنویت کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔

اچانک اس کی نگاہ اپنے بچے پر گئی تو وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ نرس نے جب ولادت

کے فوراً بعد بچہ لا کر دکھایا تھا۔اس وقت کی شبیہ اور اس وقت کی شبیہ میں زمین آسمان کا فرق تھا

یہ کیا ہے؟متن کی ساخت یا معبر کی نفسیات؟

''یہ معاملہ تو کچھ اور حیرت انگیز ہو گیا۔''سبطین نے سوچا مگر سبطین کی سوچ ایک طرف تھی اور دادی کی خوشی دوسری طرف ،تیسری طرف بیوی بے چاری تمام معاملات سے انجان بے خبری کی وادی میں گم۔سبطے نے دیکھا وہ نیم مردہ پڑی تھی۔سانس کا تسلسل اور نبض کا تحرک دونوں اس کے اختیار میں نہیں تھا اور شاید وہ خود ان دونوں کے اختیار میں نہیں تھی کیونکہ نارمل حالات میں تو یہ تینوں ایک دوسرے کے کفیل ہوتے ہیں۔

سبطین کا ہاتھ دکھنے لگا تھا۔اس نے اپنا بایاں ہاتھ ہٹایا اور دائیں ہاتھ کا دباؤ بیوی کے ہاتھ پر ڈالا۔وقت سلائن اور گھڑی تینوں تقریباً ایک رفتار سے بسر ہوتے چلے جارہے تھے۔ان تینوں میں کون کس کا استعارہ تھا پتہ نہیں پھر بھی معنی اور سمجھ کی کسی نہ کسی سطح پر تینوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

اچانک دروازہ کھلا۔ڈاکٹر نرس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔سبطین ہڑبڑا کر بے اختیارانہ کھڑا ہو گیا۔ڈاکٹر نے مسکرا کر مبارکباد دی اور مریضہ کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔نرس اس درمیان سلائن ہی میں ایک فائل انجکشن انڈیل چکی تھی۔ڈاکٹر مریض کو دیکھنے میں مصروف تھی ،اس نے پہلے اس کی نبض دیکھی پھر آنکھیں دیکھیں پھر اس کے منہ میں ڈالا ہوا وہ آلہ کھینچ کر نکال دیا جو بے ہوشی کی حالت میں زبان کو دانت کے حملے سے بچانے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔تب تک سبطین اپنے کو سمیٹ چکا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب یہ ٹھیک ہے نہ؟''

''ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہیں''۔

''پانی اور چڑھے گا؟''

''نہیں اس بوتل کے بعد نہیں چڑھے گا۔''

سبطین کے سینے سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

ڈاکٹر نے بیوی کے گال پر ذرا کچھ زور سے تھپکی ماری اور اسے اس کا نام لے کر پکارا۔اس پر اس نے رسپانس بھی کیا مگر آواز ابھی صاف نہیں تھی البتہ یہ واضح تھا کہ وہ اب ہوش میں آ رہی ہے۔

ڈاکٹر چلی گئی تو نرس اور دائیوں نے اس سے اور اس کی ماں سے مٹھائی کا تقاضا کیا۔ ماں نے مسکراتے ہوے اپنی ساری کے پلو سے دس روپے کا نوٹ کھول کر ان سبھوں کی طرف بڑھایا ۔سبھوں نے اسے لیتے ہوئے اور زیادہ کا ڈیمانڈ کیا۔سبطین نے بھی دس روپیہ نکال کر دیا۔ نرس اور دائیاں خوش خوش کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ماحول خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو جیسے کوئی ہلکے سے گنگنایا...... باغوں میں بولیں مور لب آب جو چکور!

کمرے سے باہر رم جھم بارش ہو رہی تھی ،ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سارے میں تیرتی پھرتی تھی کہیں دور کوئی پرندہ سریلی آواز میں کچھ گاتا گنگناتا ناچتا ،جھومتا اپنی منزل کی طرف اڑتا چلا جا رہا تھا،سبطین کو لگا کہ وہ بھی ایک پرندہ ہے جو چلتے چلتے کبھی جلتے سلگتے کسی صحرا میں پھنس جاتا ہے،صحرائی طوفان اس کی مرضی کے خلاف اسے اس کی منزل کی الٹی سمت میں کوسوں کوس تک کھینچے لئے چلے جاتے ہیں اور ناموافق وقت کی رسی اس کے گلے میں ایسے آ کر کس جاتی ہے کہ اگر وہ ذرا بھی اپنی مرضی کے مطابق اپنا رخ بدلنا چاہے تو خود اس کی گردن ٹوٹتی اور جان نکلتی محسوس ہوتی ہے، پھر وہ پل گزر جاتا ہے، جلتا سلگتا صحرا کوسوں کوس پیچھے چھوٹ جاتا ہے۔میلوں میل تک چمن اور سبزہ زار، پھل پھول......ایسا لگتا ہے کہ ہر موڑ اس کی منزل ہے وہ کہاں رکے اور کدھر بڑھے یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے اسے لگا یہ وہی لمحہ ہے!

مگر اسی پل اسے ایک خیال بچھو کی طرح ڈنک مار گیا۔''میرے خیال اور عمل میں مطابقت کیوں نہیں؟ میرے نطفے سے جنما بیٹا میرے خیال میں بسے بیٹے سے مختلف کیوں ہے؟ کیا خیال اور اظہار دونوں میں سے کسی پر مجھے قدرت حاصل نہیں ہے؟''

ابھی سبطے مذکورہ خیال کے کچوکے سہ ہی رہا تھا کہ ایک اور عجیب سی بات اس کے ذہن میں آئی: کیا میری سوچ میرے ارادے کے مطابق ہوتی ہے؟ کیا کسی کو بھی اس کا پتہ رہتا ہے کہ اگلے لمحے میں وہ کیا سوچے گا؟''

سبطین پر ایک عجب منظر کھلا: ''دوران گفتگو یا دوران تقریر ہر لفظ تو خود بخود دماغ کے پیالے سے وقت کے آنگن میں گرتا رہتا ہے تو پھر خیال اور اس کا اظہار دونوں پر کسی کا کیا قابو؟

''مگر نطفے سے جنما بیٹا تو خیال اور اظہار سے متعلق نہیں ہے ارادے اور عمل سے منسلک ہے ؟'' ایک نیا نکتہ سامنے آیا۔

مگر خیال و اظہار ہو یا ارادہ عمل دونوں کا حال تو تقریباً یکساں ہے۔ سبطین نے محسوس کیا کہ وصال کا لمحہ تو ایک غیر اختیاری اور اضطراری عمل کا نتیجہ ہے اور اس پر طرفہ تماشا یہ کہ وہ پھل لائے یہ کوئی ضروری نہیں۔ وہ تو کس ایک بے اختیارانہ لمحے کا کرشمہ ہے جب سیپی کا منہ کھلے اور سواتی کا قطرہ اس کے اندر جا کر موتی بن جائے۔

تو پھر اختیار کس چیز پر ہے؟

بیوی اب ہوش میں آ رہی تھی، سلائن ابھی لگا ہوا تھا، اس لئے سبطین نے پوری توجہ اور ہاتھ کا دباؤ بیوی کے ہاتھ پر مرکوز کر دیا۔ مبادا ہوش آنے کے ابتدائی لمحات کی چھٹپٹاہٹ کے سبب ہاتھ کی رگ میں پیوست سوئی ادھر ادھر ہو جائے۔ سبطین کی یہ شدید ضرورت تھی کہ اس کی بیوی کو اب کوئی ایسا مرحلہ پیش نہ آئے جس کے سبب اسے مزید دوا کی ضرورت پڑے۔

بیوی کو رات گئے پوری طرح ہوش آ گیا۔ اس کے آبائی شہر سے اس کی بڑی بہن، بیوی کے گھر والے، پٹنہ سے اس کا چھوٹا بھائی سبھی آ چکے تھے۔ بھائی کے ساتھ ابا بھی ہسپتال آ گئے تھے تنہائی کا لمحہ گزر چکا تھا۔ ہسپتال کا کمرہ خوشی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔

''بھیا آپ صبح سے پریشان ہیں۔ اب آپ چلے جائیے۔ رات میں یہاں میں رہوں گا'' بھائی نے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

واقعی وہ تھک بھی گیا تھا اور تصور و حقیقت کے تقابل کا مسئلہ بھی ابھی اس کے پیش نظر تھا۔ سبطین دس کے قریب والد کے ساتھ ہسپتال سے گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔ گھر لوٹ کر کھانے سے فارغ ہو کر والد عشا کی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور سبطین نے اپنے کمرے میں آ کر اپنی بنائی ہوئی ادھوری تصویر کھول کر چوکی پر پھیلا دی۔ بارہ کے آس پاس کا عمل تھا۔ گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے، دور کہیں چوکی دار کی لاٹھی پٹخنے کی آواز آ رہی تھی......''

سبطین نے اقبال ہوسٹل کے برآمدے سے مشرق کی سمت دیکھا۔ پٹنہ کالج یونیورسیٹی آفس ،وہیلر سینیٹ ہال ،یونیورسیٹی لائبریری ،فریڈے ہوسٹل اورتب اس کے بعد گرلس ہوسٹل ......سارے طول وعرض پر گھنی سیاہ اندھیری رات بکھری پڑی تھی ، یہاں سے وہاں تک درختوں کا ایک طویل سلسلہ،اوس اور دھند میں ڈوبے درخت اور برقی بلب اور میدانوں میں گہری نیند سوئی دوب اور کلیاں راستے اور سارے مناظر،اوران سب میں شامل یاان سے پرے......وہ!

وہ مرچکی ہے،اس کوکینسر ہوگیا تھا،گلے کا کینسر،اس کی آواز میں بلا کی سِکس اپیل تھی،لوچ ،جان لیوا اوردلگداز ترنم۔ اسے گلے کا کینسر ہوگیا تھا ۔اس نے آخری مرتبہ جوخط لکھااس میں ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئی ،اپنے بچوں کی تکلیف کا تذکرہ کرتی رہی ،شایداس نے خوش رہنے کا ایک راستہ ڈھونڈھ لیا تھا۔مگروہ ۱۹۷۰ء میں نہیں مری ۔وہ اس سے پہلے مرچکی تھی ،شاید اسی وقت جب اس کے گھر والوں نے نواب فلاں ابن فلاں کے پوتے عالی جناب فلاں ابن فلاں سے اسے بیاہ دیا۔سبطین کو یادآیا،مرنے سے دوسال پہلے اس سے آخری ملاقات پٹنہ مارکیٹ میں ہوئی ،وہ روپ سادھنامیں شاپنگ کررہی تھی ،سبطے نے اسے دیکھا بھی نہیں تھاوہ توروپ سادھنا سے آگے بڑھ گیا تھا کہ ایک دس برس کے بچے نے اس کا دامن کھینچا:''ممی آپ کو بلارہی ہیں۔''وہ سمجھ نہ پایامگراس کے ساتھ جاناہی پڑا۔شادی کے بعد پہلی اورآخری مرتبہ وہ سبطے پر کھلی :''میں نے دھوکا کھایا۔'' وہ کیا کہتا ؟اس نے تو ابتداہی میں اس سے کہہ دیا تھا۔انہی پتھروں پہ چل کراگرآسکوتو آؤ۔وہ پتھروں کی عادی نہیں تھی اور کہکشاں بنے رستے اس کی یامیری تقدیرنہ بن سکے۔

تیسری جنگ پتہ نہیں اب ہوگی یانہیں مگرنیل کے ساحل پرفراعنہ رقص کرتے ہیں،دریائے فرات میں یزیدسن باتھ لیتاہے برسوں یہ ڈھانچہ مجھ سے واصل رہااور میں ایک موہوم رشتے کی ڈور پکڑ کر جیتا چلا گیامگر میرے والدین میرے ٹھوس ارتقا کے خواہش مند تھے ،میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ارتقا کیا ہے،اندراندر بڑابننا یاباہر باہر صاحب مال ومنال ہونا اور بڑابننے کے مکر میں مبتلا شخصیت کااندراندر کٹنا؟

سبطین نے سر جھٹکا اور اپنے سامنے کھلی ادھوری تصویر کی طرف نگاہ کی مگر اب ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اسے لگا کہ اس تصویر میں تو کئی تصویروں کی جھلک ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس ادھوری تصویر کی آنکھیں تو اس مردہ لڑکی کی ہیں، پیشانی پر والد کی پیشانی کا اشتباہ ہو رہا تھا، ہونٹ ماں کے محسوس ہو رہے تھے، رخساروں پر بیوی کے رخساروں کا شبہہ ہو رہا تھا، چہرے کا مجموعی تاثر یا ذرا سا مسکراتے ہونٹ شاید اس جیسے تھے۔

کیا یہ تصویر اسی بچے کی ہے جو میرے خیالوں میں بستا ہے؟ میرے خیالوں میں کون بستا ہے ؟ میری ماں؟ بیوی؟ میرا باپ؟ وہ مردہ لڑکی؟ میں؟ کون؟ کیا کوئی ایسی تصویر نہیں بنائی جا سکتی جس کی شناخت پیاز کی طرح ہو جس کا انجام خالص نفی یا مکمل بے چہرگی پر مشتمل ہو؟ سبطین نے پھر سر جھٹکا :''اس قسم کے مباحث میں دماغ خراب کرنا تخلیقی نقطہ نظر سے لایعنی ہی نہیں نقصان دہ بھی ہے۔ یہ مصوری کے ناقدوں کی ذمہ داری ہے، وہ فیصلہ کریں، میں کیوں دماغ خراب کروں؟ سبطین پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ایک مرتبہ پھر تصویر کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر چند ہی ثانیہ بعد اس پر ایک اور حقیقت کا در کھلا: وہ ایک نظر میں کسی بھی طور پورا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کبھی ماتھے پہ ٹکتیں، کبھی تصویر کی آنکھوں پہ مرکوز ہوتیں، کبھی دونوں رخسار اس کے پیش نظر ہوتے!

کیا حقیقت کا مجموعی نظارہ یک بارگی ممکن نہیں؟ کیا حقیقت ہمیشہ ٹکڑوں ہی میں ہم تک پہنچتی ہے؟

کمرے کے باہر بارش پھر زور و شور سے شروع ہو چکی تھی، فضا میں چاروں طرف نمی تیر رہی تھی، کھڑکی کے شیشوں پر پانی کی مسلسل آواز سبطین کو نہ جانے کن جہانوں کی یاد دلا رہی تھی ...... بارش لگاتار اور دھواں دھار جاری تھی۔

شیمی دریچے سے باہر دھند میں کھوئے اسٹریٹ پول کی روشنی میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی ......وقار کمرے میں ٹہل رہے تھے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔ جب دیوار گھڑی نے آٹھ گھنٹے بجائے تو شیمی چونک کر مڑی، آنکھیں سرخ سرخ جگی جگی جیسے نیند سے کبھی آشنائی ہی نہ رہی ہو......''اب جاؤ......'' وقار احمد اٹھ گئے ......شیمی پھر دریچے سے باہر چاروں جانب چھائی

دھند میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگی، وقار احمد تھکے قدموں بڑھتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچ گئے، دروازے پر پہنچ کر دروازے سے باہر قدم نکالنے سے پہلے شاید کچھ سوچ کر پھر مڑے، شیمی دریچے کے پاس کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی، وقار اس کی طرف مڑے تو وہ پھر دریچے سے باہر دیکھنے لگی......وہ کچھ پل یونہی دروازے پر کھڑے اس کو دیکھتے رہے، پھر دایاں پیر اٹھایا اور دروازے سے باہر ہونے والے ہی تھے کہ یوں اچانک رک گئے جیسے کرنٹ لگ گیا ہو...... وہ پل آج تک وقار احمد کو اپنی ذرا ذرا سی تفصیلات کے ساتھ یاد تھا کہ کیسا چھٹپٹا کر، صدیوں کو محیط فاصلے پر کھڑے رہ کر، وقار کمرے سے باہر نکلنے والے ہی تھے کہ اسی آخری پل میں......کہیں دور کسی لاؤڈ اسپیکر پر گونجتا ایک پرانا نغمہ کمرے میں در آیا تھا......بچپن کے دن بھلا نہ دینا۔

دریچے کے چاروں طرف ......درختوں پر درختوں کے پتوں پر، دورویہ مکانات کی دیواروں پر، راستوں کے کنارے ایستادہ بجلی کے کھمبوں پر برقی قمقموں اور ان قمقموں کی روشنی میں جگمگاتے مکانات کے بالا ریزوں پر دھند اتر رہی تھی اور دریچے کے اندر کمرے میں، بہت دور پر گونجتا ایک نغمہ لپک جھپک کر اس تک دوڑا چلا آ رہا تھا: بچپن کے دن بھلا نہ دینا......بچپن کے دن بھلا نہ دینا......اور شیمی دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپائے رو رہی تھی اور وقار خاموش کھڑے سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہے تھے۔

''کیا میں وقار ہوں؟''سبطین نے ''فرات'' بند کی تو پہلا سوال یہی اٹھا۔''اگر میں وقار ہوں تو وہ مردہ لڑکی شیمی یا شیمی وہ مردہ لڑکی کیوں نہیں ہو سکتی؟

اگر میں وقار نہیں ہوں تو وقار کہاں ہے؟ وہ مردہ لڑکی کہاں ہے؟ شیمی کہاں ہے؟ میری بیوی کہاں ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ شیمی بنگلور میں، میری بیوی ہسپتال میں اور وہ مردہ لڑکی قبر میں ہے تو اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟ جو قبر میں ہے وہ بھی میرے پاس نہیں، جو بنگلور اور ہسپتال میں ہے وہ بھی اس لمحے میں میری تقدیر نہیں، اس لمحے میں تو سب میرے لئے غیب کا حصہ ہیں......غیب اور موت میں کیا فرق ہے؟ وہ زندہ رہی تو بیس برسوں میں دو مرتبہ اس سے ملاقات

ہوئی۔شیمی سے تیس برسوں میں دس مرتبہ ملاقات ہوئی ، بیوی شاید چوبیس گھنٹے میں تین چار گھنٹہ ، مجھے میسر رہی ہوگی......میرا خود مجھ سے کتنے دنوں کا ساتھ رہا ہوگا؟

وہ کسی طرح اپنے آپ کو سمیٹ نہیں پا رہا تھا اور وہ خود کو سمیٹنا چاہ رہا تھا ۔ سبطین پھر چاروں طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو ادھوری تصویر پر مرتکز کرنا چاہ رہا تھا۔اسے یاد آیا کہ تقابلی موازنہ اصل کام ہے جواب تک ہو نہیں پایا ہے ۔نطفے سے جنمے اور خیال میں سراٹھا کر مسکرانے والے بچے کے درمیان کیا کچھ ملتا جلتا ہے اور کیا کچھ الگ الگ؟''

وہ پوری طرح خالی الذہن ہو کر ایک مرتبہ پھر تصویر پر جھکا۔

مگر کچھ ہی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ تو صرف تصویر کو دیکھے جا رہا ہے ، تقابلی موازنہ کہاں ہو رہا ہے فوراً ہی سبطے نے اپنے نوزائیدہ بچے کو یاد کیا مگر تب یوں ہوا کہ جب نوزائیدہ یاد آیا تو سامنے والی تصویر ذہن اور آنکھ دونوں سے اوجھل ہوگئی......اب کے وہ اپنی بے بسی پر روا ٹھا۔

کچھ تو اپنے بس میں ہے ہی نہیں۔تقابلی موازنہ کیسے کیا جائے؟اس کے لئے دو فن پاروں کا آمنے سامنے ہونا ضروری ہے مگر یہاں تو کبھی تصویر سامنے آجاتی ہے کبھی نوزائیدہ بچہ۔اور یہ دونوں بھی یک بارگی پورے کے پورے سامنے نہیں آتے کیا نظارگی کی سب سے بڑی سچائی تجرید ہے؟

اچھا اگر یہ کہا جائے کہ تقابلی موازنے کا یہ طریقہ ہی غلط ہے تو پھر شاید یوں کرنا ہوگا کہ پہلے دو فن پاروں کو الگ الگ ذہن میں ترتیب دے لیا جائے پھر حسِ تمیز کے نہاں خانے پر باری باری سے دونوں کا جھماکا کیا جائے۔

''مطلب یہ ہوا'' سبطین نے خود کو ذرا پرسکون کرنا چاہا......کہ پہلی منزل دیدار،اور آنکھیں دید کا جو تصور ریٹنا کے سہارے یادداشت کے خانے میں پہنچا رہی ہیں یہ دوسری منزل!

پھر سبطین گڑ بڑا گیا:اگر یادداشت کے خانے میں سب ایک ساتھ جمع ہو رہے ہیں پھر تو یہ کولاژ ہو گیا۔

لاحول ولاقوۃ: ابھی تو یہ پہلو سامنے آیا تھا کہ نظارگی کی سب سے بڑی سچائی تجرید ہے اور اب یہ دوسرا سچ کہ مختلف حقیقتیں جب گڈمڈ ہوکر کولاژ بن جاتی ہیں تو اسی سے ایبسٹر یکٹ جنم لیتا ہے۔

تو پھر حقیقت کیا ہے؟ کولاژ؟ ایبسٹر یکٹ؟ پیاز کے چھلکے کی طرح پرت در پرت کے انجام پر مکمل خلا؟ وہ مردہ لڑکی جو نہیں ہے؟ میری بیوی جو ہے؟ شیمی جو ہوکر بھی نہیں ہے!

آخری منظر کمرے سے باہر گھنی اندھیری سیاہ رات بکھری پڑی ہے، بارش لگاتار ہورہی ہے ،دوسرے کمرے میں ابا سورہے ہیں، گلیوں میں چوراچکے کسی مکان کا نشانہ لے رہے ہیں، چوکیدار اپنی رات کی ڈیوٹی نبھارہا ہے، اسپتال میں کوئی مر رہا ہے، کسی کو دردزہ اٹھ رہا ہے، نرسیں جاگ رہی ہیں نرسیں سو رہی ہیں، سبطین کی بیوی کے کمرے میں بھی سب تھک کر سو گئے ہیں یہاں تک کہ سبطین کی بیوی کو بھی نیند آگئی ہے مگر بچہ ماں کے بغل میں جاگ رہا ہے اور ہاتھ پیر ہلا رہا ہے ،اور سبطین اپنے کمرے میں خموش بیٹھا ہے اور اس کی بنائی ادھوری تصویر اس کے سامنے کھلی پڑی ہے اور وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا چلا جارہا ہے اور سبطین کے گھر سے ہسپتال تک اور اس سے بھی آگے جانے کہاں تک ہر شے رات کی سیاہی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

جب دن نکلے گا تو ہر شے دکھائی دینے لگے گی۔ستارے البتہ دن کی روشنی میں دکھائی نہیں دیتے۔

☆☆☆

زخمی پَرندہ

باپ بیٹے جب اس مضافاتی اسٹیشن پر اترے تو شام کا دھندلکا ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا آ رہا تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی دورویہ ہوٹلیں نظر آئیں جن میں طباق جلیبیوں سے بھرے تھے اور شیشے کے مرتبان میں رکھی مٹھائیاں دیکھنے والوں کو پکار رہی تھیں، بیٹے کی نگاہ بے ساختہ ان پر ٹھہر گئی فوراً ہی اس نے یاد کیا ''ابھی تو آدھ گھنٹہ پہلے ہی ڈہری اسٹیشن پر بسکٹ کھایا ہے اور چائے پی ہے۔

''ابا پان کھا لیجئے۔'' اس نے ایک پان کی دکان دیکھ کر باپ سے کہا۔

''نہیں، ابھی منہ میں ہے۔'' باپ نے آہستہ سے جواب دیا اور جیب سے زردے کی شیشی نکال کر تھوڑا سا زردہ پھانک لیا۔

''گاؤں کتنی دور ہے؟''

''بس یہ بازار پار کرو گے اور بستی کی پگڈنڈی شروع ہو جائے گی۔'' باپ نے رفتار تیز کرتے ہوئے جواب دیا، بیٹا باپ کے پیچھے پیچھے تقریباً دوڑنے کی کیفیت میں چل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ''یہ بازار ہے یا شیطان کی آنت؟'' بازار ختم ہونے پر آ ہی نہیں رہا تھا۔

کافی دور چل لینے کے بعد باپ ایک درزی کی دکان پر رک گیا چھوٹی سی دکان تھی جس میں بس پیر سے چلنے والی ایک مشین اور کچھ سلے اور کچھ ادھ سلے کپڑے دکان کا سرمایہ تھے، کچھ کپڑے ٹنگے ہوئے کچھ زمین پر پڑے، ایک طرف لکڑی کا ایک خالی مونڈھا۔ باپ کو دکان پر چڑھتا دیکھ کر مشین پر بیٹھا آدمی اٹھا اور السلام علیکم کہتا ہوا باپ کی طرف لپکا، باپ کے چہرے

پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔اس آدمی نے مصافحے کے وقت باپ کا ہاتھ بھی چوما اور پھر جلدی سے مونڈھا صاف کرنے لگا۔

''تم بیٹھو!'' باپ نے بیٹے کو اشارہ کیا اور خود فرش پڑے کپڑے ہٹا کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا ۔بیٹا کھڑا رہا شاید باپ کے زمین پر بیٹھ جانے کے سبب وہ خود مونڈھے پرنہیں بیٹھ پا رہا تھا۔

''تم بیٹھو بھائی مجھے اسی میں آرام ملتا ہے۔'' باپ نے مسکرا کر کہا تو بیٹا بیٹھ گیا۔

''سرکار کتنے بجے پہنچے؟'' مشین والے آدمی نے بڑی لجاجت سے پوچھا۔

''بس ٹرین ابھی پہنچی۔کیا خبر ہے؟ کوئی اسٹیشن نہیں آیا؟''

''میں صبح اور دوپہر کو اسٹیشن گیا تھا، اصل میں آپ کو لانے کی ذمہ داری سکریٹری صاحب نے مجھے ہی سونپی تھی۔''

''اور تم کو جس وقت آنا چاہئے اسی وقت غیر حاضر ہو گئے۔'' باپ آہستہ سے بولا۔

''نہیں سرکار۔میں بس اٹھنے والا ہی تھا۔اصل میں آج کل لگن چل رہی ہے نا! برات کا کچھ کپڑا آ گیا تھا اور اسے آج ہی دینا ہے۔''

مشین والا اتنا بولا ہی تھا کہ ایک کار دکان کے آگے سے فراٹے بھرتی نکل گئی۔

''ارے حضرت سلطان العالم آ گئے۔مشین پر بیٹھا آدمی جیسے خوشی سے اچھل پڑا۔

''کون؟ لڑکے نے ذرا چونک کو پوچھا۔

ارے آپ نہیں جانتے بابو؟ مشین والا حیرت سے بولا۔'' حضرت سلطان العالم جامعہ سلطانیہ شرعیہ کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ان کا تو ہر دن بک رہتا ہے بڑی بات ہے کہ یہاں آ گئے'' لڑکے نے باپ کی طرف بے اعتماد نظروں سے دیکھا تو باپ ذرا مسکرا کر آہستہ سے بولا......'' سلسلے کے عالم ہیں۔بڑا شاندار مدرسہ قائم کر رکھا ہے۔ابھی ان کا کافی نام ہے۔''

''غلطی ہو گئی۔ذرا سا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو گاڑی رکوا لی جاتی۔آپ لوگ بھی اسی سے چلے جاتے۔گاڑی میں تو جلسے کی سکریٹری تھے ہی۔'' مشین والا متاسفانہ لہجے میں بولا۔

بیٹے کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے باپ کے چہرے پر پل بھر کے لیے ایک بادل سا آیا، پھر ہٹ گیا۔ باپ دکان کے باہر کسی جانب دیکھ رہا تھا اور شاید کچھ سوچ بھی رہا تھا۔

''رحمان میاں بستی تک کے لئے ذرا ایک رکشہ تو دیکھنا۔'' باپ کی آواز میں کچھ عجب سی بے بسی جھلک رہی تھی۔

''سرکار رکشہ نو دس روپے سے کم نہ لے گا۔''

''اب جو ہے جانا تو ہے ہی!'' باپ کے لہجے سے تھوڑی اکتاہٹ بھی جھلکی۔

''جیسا حکم سرکار کا''...... ''ارے کریم میاں......'' اس نے سامنے کے ہوٹل کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔

''دو چائے دو بسکٹ'' پھر لڑکے کی طرف مڑ کر بولا۔'' مٹھائی بھی لیجئے گا بابو؟''

''لڑکے کے جواب دینے سے پہلے ہی باپ نے جواب دے دیا۔'' بس ایک منگا لو۔''

چائے کے بعد رحمان خلیفہ پان بھی لے آئے، پان کھاتے کھاتے رکشہ آ گیا۔ لڑکا رکشہ دیکھ کر خوش ہو گیا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ باپ نے ارادہ بدل دیا۔'' رحمان میاں اب تو سعدی پور سے بھی رکشہ مل جاتا ہے نا؟''

''جی سرکار۔''

''تو وہیں سے رکشہ لے لیا جائے گا۔ اسے چلا دو۔''

''کیوں ابا؟''

''بیچ میں ایک جگہ کچھ کام ہے۔ تھوڑا رکنا پڑے گا۔''

بیٹا چپ رہا، کیا کہہ سکتا تھا، مگر اسے یاد آیا کہ سعدی پور بھی تو کچھ کم دور نہیں ہے!''

باپ بسم اللہ کر کے اٹھا۔ باپ آگے آگے بیٹا پیچھے پیچھے۔ دور دور تک حدنگاہ سے بھی آگے کھیتوں کا ایک طویل سلسلہ دراز تھا اور ان کے بیچ کہیں کہیں دھند میں کھوئی کچھ آبادیاں۔ بیٹے کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی جادوئی منظر کے حصار میں ہے۔ اس نے باپ کی طرف دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے باپ کے چہرے پر بار بار کچھ بادل سا آ جا رہا ہے۔ بیٹا کئی بار لپک لپک کر باپ کے

قریب جاتا جیسے کچھ پوچھنا چاہ رہا ہومگر باپ کو سر جھکائے تیز تیز چلتے دیکھ کروہ پھر ہٹ جاتا ،اچانک بیٹا تڑپ گیا۔وہ جانتا تھا۔ باپ کے اندر جب کسی افسوس کا بادل جھوم جھوم کر برسنے لگتا تب ہی باپ کے منہ سے اتنی ٹھنڈی آہ نکلتی تھی۔ بیٹے نے ایک لمحہ کے لئے بڑی کڑواہٹ سی محسوس کی ......اسی درمیان بیٹا پھر چونکا...... باپ بہت آہستہ آہستہ گنگنا رہا تھا......''ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!۔

بیٹے سے رہا نہ گیا وہ باپ کے بالکل قریب گیا۔اور آہستہ سے باپ کی انگلی پکڑ لی۔ باپ نے ایک عجیب سی...... مانو آدھی سچی آدھی جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔''کیا بات ہے؟''

''بستی میں تو آپ کے پچاسوں مرید ہیں؟''

''ہاں وہ تو ہیں!''

''پھر وہ مولانا جو گیا......اس کے لیے گاڑی گئی اور......''

باپ آہستہ سے ہنسا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔''ارے نہیں بیٹا، ایسے نہیں سوچتے ،یہ بستی تو میرے گھر کی طرح ہے اور سلطان العالم تو مہمان ہیں نا؟''

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ جوتیاں چٹخاتے پھریں اور انہیں لینے کے لیے کار جائے؟''

''میاں فقیر زادہ ہو فقیر زادے ہی رہو، پتہ ہے بزرگوں نے اس راہ میں کیسی کیسی سختیاں جھیلی ہیں۔''

بیٹا شاید کچھ اور پوچھتا یا جواب دیتا مگر سعدی پور قریب آ گیا تھا۔ باپ کو دیکھ کر دو تین آدمی اس کی طرف لپکے۔''السلام علیکم پیر صاحب'' باپ نے بڑی شفیق مسکراہٹ کے ساتھ سب کے سلام کا جواب دیا اور ان لوگوں سے باتیں کرتا ہوا مسجد کی طرف بڑھ گیا۔اذان ہو رہی تھی۔ بیٹا مسجد کی فصیل پر بیٹھا وضو کر رہا تھا تو اس نے دیکھا ایک اسکوٹر پر ایک اور مقرر گزرا۔

نماز کے بعد ایک صاحب باپ سے بات کرنے لگے۔ برسوں سے جستجو تھی کہ کوئی مرد کامل مل جائے لیکن نگاہ کہیں نہیں ٹھہرتی تھی۔ اسی بیچ ایک مرتبہ کتاب میں پڑھا کہ ''اللہ جسے دوست رکھتا ہے تو فرشتوں کے ذریعہ سارے عالم میں خبر کروا دیتا ہے اور اس طرح سارا عالم اس کی عزت

کرنے لگتا ہے۔'' پھر کئی جگہوں پر حضرت سلطان العالم کی جو عزت دیکھی اور عقیدت مندوں کا جو ہجوم دیکھا تو یقین ہو گیا کہ اس دور کے ولی کامل یہی ہیں۔''

بیٹے نے دانت کچ کچا کر اسے دیکھا...... ۱۹۷۴ء میں گاندھی میدان کے کھلے اجلاس میں وہ خود موجود تھا...... باپ نے کچھ نہیں کہا بس سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

مسجد سے نکل کر باپ نے پانچ روپے پر ایک رکشہ کیا۔ بیٹے نے رکشے میں بیٹھتے ہی محسوس کیا کہ اس کا وزن کچھ بڑھ گیا پھر بیٹے کو اچانک یاد آیا...... ''ایک کوئی مقرر اسکوٹر پر بھی گیا''

''ہاں وہ پروفیسر ثوبان محمد تھے......'' کل ہند انجمن ترقی ملت کے صدر!''

''آپ نے کہا تھا کہ راستے میں رکنا ہے!''

''ارے بھائی۔ اب ایک ایک بات کا حساب مت لو۔'' باپ جھلا کر بولا۔

بیٹا گڑبڑا کر چپ ہو گیا۔ دراصل وہ سمجھ نہ پایا کہ اس نے کون سی غلط بات پوچھ لی ...... مگر بہت دیر تک وہ چپ نہ رہ سکا...... کچھ ہی دیر بعد وہ پھر آہستہ سے سوال کر بیٹھا: یہ سلطان العالم وہی ہیں نا جو کسی غلط کیس میں پکڑے گئے تھے؟''

''بیٹا!'' باپ نے سختی سے اسے ڈانٹا۔'' بڑوں کے بارے میں اس طرح بات نہیں کرتے۔''

''ٹھیک ہے نہیں کروں گا۔ مگر یہ تو بتائیے کہ ان کا اتنا نام جھام کیوں ہے؟''

''اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے۔ ہم تم اعتراض کرنے والے کون؟''

بیٹے کا جی چاہا کہ اس بات پر وہ باپ سے الجھ پڑے مگر پھر چپ ہو گیا۔ وہ باپ کی طبیعت میں مزید بدمزگی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس مرتبہ تو باپ یہاں آنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا...... ماں بیچاری ان معاملات میں کم دخل دیتی تھی۔ باپ کے یہاں نہ آنے کے فیصلے پر بھی پہلے وہ چپ رہی پھر آہستہ آہستہ کہنے لگی۔'' سب پیسہ ختم ہو گیا ہے، اسلم میاں کی دو مہینے کی فیس باقی ہے۔ زرینہ کا سب کپڑا پھٹ گیا ہے۔ رمضان بھی سر پر ہے۔ آپ نے کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ یہ اچھی بات ہے مگر نذر کے طور پر چار پانچ سو روپیہ مل ہی جاتا ہے۔''

اچانک اسی وقت اس کی نگاہ ایک منظر پر ٹھٹھک گئی۔ رکشہ ایک چھوٹی سی بستی کے پاس سے گزر رہا تھا اور بستی کے بچے ایک بگلے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ شاید کسی شکاری کا چھرّا اسے لگ

گیا تھا۔ وہ اُڑ نہیں پا رہا تھا۔ بہت تھکا تھکا محسوس ہو رہا تھا مگر بچوں کے خوف سے وہ مجبوراً بھاگ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ اگر بچے اسے چھوڑ دیں تو وہ پھر ایک قدم بھی آگے نہ بڑھے۔

رکشہ آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ فضا پر اندھیرے کی چادر تنتی جا رہی تھی۔ مناظر اندھیرے میں گم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ شروع نومبر کی سردیوں کی آمد آمد تھی، کھیتوں اور کھلیانوں پر ہلکا ہلکا کہاسہ گرنے لگا تھا اور ایک ناخوشگوار سی خنکی محسوس ہونے لگی تھی۔

''آپ مفلر بھول گئے؟'' بیٹا باپ کی چھینک پر چونکا۔

''ہاں جی، چوک ہوگئی!''

رکشہ اس میدان میں رک گیا جہاں گیس کے کئی ہنڈے جل رہے تھے پانچ سات آدمی اس کی طرف دوڑے، بیٹے نے دیکھا سب باپ کے مرید تھے۔ مگر اسے یاد آیا کہ اس گاؤں میں تو اس کے باپ کے پچاسوں مرید ہیں۔

جو لوگ رکشے کے قریب آئے انہوں نے ادب سے سلام اور مصافحہ کیا۔ حضور کو دیر ہوگئی؟''

''تم لوگ اسٹیشن کیوں نہیں آئے؟'' باپ کے غصے کا انداز مصنوعی تھا۔

''حضور! رحمان خلیفہ آپ کو لانے کا وعدہ کر چکے تھے۔'' ایک مرید بڑے ادب سے بولا۔

''رحمان میاں بھی عجب چیز ہیں۔ صبح سے دوڑتے رہے اور جس وقت میں اسٹیشن پر اترا اسی وقت غیر حاضر ہوگئے۔'' باپ نے ہنس کر جواب دیا۔

''ٹھہرنے کا انتظام کہاں ہے؟'' بیٹا بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

باپ نے پلٹ کر بیٹے کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں، ایک نہایت خفیف سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور پھر غائب ہوگئی۔

''وہ جو نیا مدرسہ تعمیر ہو رہا ہے اسی میں تمام مقررین کے ٹھہرنے کا انتظام ہے۔ صرف حضرت سلطان العالم کو پرمکھ جی نے اپنے یہاں ٹھہرایا ہے۔'' ایک مرید نے اطلاع دی۔ بیٹے کو یاد آیا کہ بہت بچپن میں جب وہ ایک دو مرتبہ باپ کے ساتھ آیا تھا تو پرمکھ جی کے یہاں ہی ٹھہرا تھا...... پرمکھ اس وقت پرمکھ نہیں بنا تھا۔

اسلام الدین میں تمہارے یہاں ٹھہروں گا۔'' باپ نے ایک شخص کو مخاطب کیا۔ بیٹے نے اسے دیکھا تو محسوس ہوا کہ شاید بستی کا سب سے غریب آدمی یہی ہے......''اور شمس الدین'' باپ پھر ایک آدمی کی طرف مخاطب ہوا۔'' کھانا تم اپنے یہاں سے بھجواؤ گے۔ کمیٹی والوں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں ہے!''

''جی حضور!شمس الدین نام کا آدمی مودبانہ بولا۔ وہ صورت شکل کے لحاظ سے کم از کم اسلام الدین سے بہتر نظر آ رہا تھا۔

پھر دونوں باپ بیٹے اسلام الدین کے گھر کی طرف چل پڑے۔

''اور لوگ کہاں ہیں جی؟'' باپ نے راستے میں اسلام الدین سے پوچھا۔

''سب پر مکھ کے یہاں ہوں گے حضور! مولانا سلطان العالم کے ساتھ مولانا قدرت اللہ ایم۔ پی بھی آئے ہیں نا۔ تو کچھ حکومت سے مدد کا چکر ہوگا۔ ادھر تو ان کے وزیر ہونے کی خبر بھی گرم ہے۔'' اسلام الدین اتنا بول ہی پایا تھا کہ شمس الدین نے بات اچک لی۔ ''ارے نہیں حضور! اسلام میاں کیا جانیں۔ مدرسے کے چندے کی وصولی کو لے کر مکھیا پر مکھ میں کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ مولانا سلطان العالم کے آگے آج پنچائت بیٹھی ہوگی۔''

بیٹے کی نگاہ پھر ایک مرتبہ کھیتوں کی طرف گئی۔ بنجر کھیت تو صدا کی طرح بنجر پڑے تھے مگر اس اندھیرے میں تو اپجاؤ کھیت بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

گھنے اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے باپ کا ہیولا کچھ عجب ڈراؤنا محسوس ہوا۔

اسے وہ منظر پھر یاد آیا: شکاری کا چھرا کھایا ہوا بگلا، بگلا اڑ نہیں پا رہا تھا، مگر اس کے باوجود اپنی مرضی سے رک جانا بھی اس کے بس میں کہاں تھا؟

بیٹے نے پلٹ کر اس راستے کو دیکھا جس سے چل کر وہ یہاں تک پہنچا تھا اور سوچا اسٹیشن یہاں سے کتنی دور ہے اور کیسا گھنا اندھیرا چاروں طرف پھیلا ہے کہ آگے بڑھنا ممکن نہ پیچھے لوٹنا آسان مگر باپ اس اندھیرے کے سینے پر قدم رکھتا آگے بڑھتا جاتا تھا اور اندھیرے میں گم ہوتا جاتا تھا!!۔

☆☆☆

اثاثہ

بھارتی نے محسوس کیا کہ اُس کی زمین ایسی بھیانک آگ میں جل رہی ہے جس میں جلنے والے پر فالج گر جاتا ہے۔

اُسے پھر وہ آواز سنائی دی............''اُن کا شوان کے گاؤں لے جایا جا رہا ہے''۔

یہ آواز نہیں تھی پگھلا ہوا سیسا تھا جو اس کے کان میں آگ بن کر اتر رہا تھا اور ہڈیوں کے اندر اتر جانے والی ایک انتہائی سرد رات ختم ہونے پر نہیں آرہی تھی۔

بیچ رات کا سمئے تھا مگر بھائی اور ماں کے کمرے کا بلب جل رہا تھا۔ بھارتی نے اپنی ڈبل بڈ مسہری پر نگاہ کی، بیوی لحاف اوڑھے پڑی تھی مگر وہ بھی سوئی نہیں تھی۔ باہر کتے بھونک رہے تھے۔

''اب سو رہئیے۔'' بیوی آہستہ سے بولی۔

''ہاں سوتے ہیں۔تم تو سو جاؤ۔'' بھارتی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا مگر اُٹھا نہیں۔

اچانک اس نے دیکھا، ایک پتنگے کو ایک چھپکلی دوڑا رہی تھی، پتہ نہیں کیسے یہ پتنگا کمرے میں آ گیا، جاڑے میں تو پتنگے نظر نہیں آتے، پھر یہ کیسے آگیا؟ کمرے کی کھڑکی دروازہ سب بند تھا نکلتا کیسے؟ مانو قید ہو گیا، وہ دیوار پہ بیٹھتا تو چھپکلی حملہ کرتی، حملے سے بچنے کے لئے پتنگا کمرے کے طول وعرض میں چکر لگاتا، جب تک وہ چکر لگاتا رہتا، چھپکلی دیوار کے کسی حصے سے چپکی رہتی، پھر وہ تھک کر جیسے ہی دیوار یا زمین کے کسی حصے پر بیٹھتا چھپکلی نشانہ سادھ کر اس پر حملہ کر دیتی۔

''کمرہ کھول کر پتنگے کو اڑا دوں۔'' بھارتی نے سوچا۔

''کیا کر رہے ہیں؟ بچے سوئے ہوئے ہیں، ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' اس نے دروازے کا پٹ ذرا سا کھولا ہی تھا کہ بیوی کی پھنسی پھنسی مگر احتجاجی لہجے میں ڈوبی آواز اس تک پہنچی اور اس نے ہڑ بڑا کر دروازہ بند کر دیا۔

ہڈیوں کے اندر اتر جانے والی ایک سرد رات گویا اس کے چاروں طرف منڈلاتی پھر رہی تھی۔

''ٹھیک ہی ہے۔'' اس نے سوچا۔ اگر دروازہ کھول بھی دوں تو اس کی کیا گارنٹی کہ پتنگا باہر چلا ہی جائے گا......اور اگر چلا بھی گیا، دوسرے سوال نے اسے پریشان کیا، تو کیا ضروری کہ کسی دوسری چھپکلی کا نشانہ نہ بنے............خود اس کا گھر بھی تو کئی ہفتوں سے لگاتار............

''بیکار سی بات'' اس نے سر جھٹکا مگر اس نے محسوس کیا کہ اس سرد رات میں آگ لگی ہوئی ہے۔

اسے سرمئی سردیوں اور ہلکی ہلکی رم جھم بارشوں کی پھواریں یاد آئیں، جب سارے میں کوئی مدہم اور مدھر سُر گونجتا تھا اور اس کی روح کو کوئی غم نہ تھا۔

وہ اچانک چونک اُٹھا ....کہیں کچھ آواز سی محسوس ہوئی .... وہ ہڑبڑا کر ننگے پیر کمرے سے باہر نکل آیا............کوارٹر انگریزوں کے زمانے کا تھا............ باہر بڑا سا لان، لان کیا بلکہ میدان، پھر لمبی سی برساتی، اس کے بعد پورٹیکو جس میں گاڑیاں کھڑی ہوتیں، پھر باہر کا برآمدہ، اس سے لگے ہوئے کئی کمرے جن میں سے ایک اس کے باپ جج مدھوسودن کی آفس کے کام آتا، پھر دوسرے حصے میں کئی ماتحت بیٹھتے، مہمان خانہ الگ، اور پھر کوارٹر نما حویلی کے اندر کا حصہ............وہ باہر نکلا تو سامنے اندر کے برآمدے میں چاروں طرف دھُند سی محسوس ہوئی، دالان میں بچھی کرسیاں ٹیبل، ماتحتوں کے بیٹھنے کے لئے کنارے کنارے رکھے مونڈھے، اور وہ زمین جس پر یہ سب کچھ ٹکا تھا، سب دھُند کے ہالے میں قید............چاروں طرف کُہرا تیر رہا تھا۔

آواز کہاں سے آئی؟

وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا مگر اس نے آواز سنی تھی، اُسے اپنے کانوں پر شک نہیں تھا .... مگر کیا کسی اور نے نہیں سُنی؟ آخر کوئی اور کیوں نہیں اُٹھا؟

اُس نے یاد کیا۔ کیسی آواز تھی وہ؟

کِسی کتے کے رونے کی آواز تھی؟ یا بلی کی غراہٹ؟ شاید کچھ سیاپے جیسا؟ وہ ٹھیک سے فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا............مگر آواز تو تھی ....ہمت نہیں ہوئی کہ صدر دروازہ کھول کر باہر جاتا، ٹھنڈک ننگے تلووں سے سر تک چڑھتی محسوس ہوئی، وہ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ کمرہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز سے بیوی جاگ گئی۔

کیا بات ہے؟ کہاں گئے تھے؟

"کچھ آواز سی محسوس ہوئی تھی"۔

بیوی ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھی۔کب؟ کہاں؟

کچھ دیر پہلے۔آواز کہاں کی تھی' پتہ نہیں چل سکا۔

"کیسی آواز تھی؟"

"سمجھ نہیں پایا۔"

وہ مُسہری پر بیٹھ گیا مگر لیٹا نہیں، اندر اندر عجب سی بے چینی دل کو جیسے مٹھی میں لے کر جکڑے جا رہی تھی، وہ پھر کھڑا ہو گیا، اب کے اُس کا رخ کمرے کی اُس دیوار کی طرف تھا جس میں لگے دروازے پائیں باغ میں کھُلتے تھے اور جس کی کواڑ میں جھلملی لگی ہوئی تھی، اُس نے جھلملی کی دَرز سے باہر دیکھا، شیشم، دیودار، آشوک اور ڈھیر سارے درختوں اور کیاریوں میں لگے سارے پھول پودے، اور ان میں لگے الیکٹرک پول میں آویزاں برقی قمقمے، سب کُہرے کی گہری پرت میں محسوس ہوتے تھے مگر نظر نہیں آ رہے تھے، اور چاروں طرف ایک آواز گونجتی تھی............"اُن کا شَو ان کے گاؤں لے جایا جا رہا ہے۔" اور ایک عجیب سی چُپ براجتی تھی............مگر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں طوفانوں کا ہول پیدا کرتی تھیں............کہیں کچھ نہیں تھا............مگر وہ آواز جو اُس نے سُنی تھی؟

وہ تھک کر مُسہری پر لیٹ گیا............بیوی نے ہاتھ بڑھا کر اُس کی بانہہ پکڑی............

"سو رہیئے۔آپ کو وہم ہوا ہوگا"

ساری رات سونے کی کوشش میں گزر گئی۔

صبح میں اُٹھنے کو تو سبھی شاید منہ اندھیرے اُٹھ گئے تھے، مگر لگتا تھا ابھی رات باقی ہے............چاروں طرف رات والی چپ کا خیمہ تنا تھا۔

بھارتی نے ماں کے کمرے میں جھانکا، ماں پوجا پر بیٹھی تھی مگر اشلوک یا منتر پڑھنے کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی، ماں چُپ بیٹھی تھی اور سامنے دیوتا نہیں تھے۔

دیوتا کہاں گئے؟" عجب سے سوال نے سر اُٹھایا

''کیا اب یہاں دیوتا نہیں براجتے؟'' من میں پھر ہول سا اُٹھا۔

ماں کس کی پوجا کر رہی ہے، کیوں پوجا کر رہی ہے؟ اب تو راکشس دیوتاؤں کے سر چڑھ گئے ہیں۔مگر اس کے باپ نے کبھی کسی راکشس کو دیوتاؤں کے سر نہیں چڑھنے دیا۔

بھارتی کو یاد آیا اُس کے گھر کی پرمپرا تھی کہ سچ کا ساتھ دیا جائے پِتا جی نے کتنے ایسے مقدمے ہاتھ میں لئے ہی نہیں جن میں شک تھا کہ مدعی بے قصور نہیں ہے یا مدعا علیہ بلا وجہ پھنسایا جا رہا ہے، دادا جی اسکول ماسٹر تھے انہوں نے بیٹے کو وکیل تو بنایا مگر ایمانداری کی لت بھی ڈال دی، بچپن کے دن تکلیف میں گزرے، چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے، میونسپلٹی کے نل سے پانی لاتے تھے، لالٹین کی روشنی میں پڑھتے تھے، ساری زندگی سرکاری اسکول میں پڑھا............اوسط سے ذرا اوپر نیچے کی زندگی جیتے تھے اور خوش تھے۔

مگر یہ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟

ہوا تیز ہوگئی تھی ،شیشم پام اور آشوک کے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، فضا میں ہڈیوں کو چیرتی ٹھنڈک ہونکاریں بھرتی تھی اور گھر میں سب چپ تھے، اُس کی بیوی بھابھی ماں بھائی پتہ نہیں کس طرح کے کاموں میں مصروف تھے،کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔

''ان کا شو (لاش) اُن کے گاؤں لے جایا جا رہا ہے''

ایک مرتبہ پھر وہی احساس ہوا............کانوں میں پگھلا سیسہ ....وہ صوفے پر بیٹھا تھا، پھر ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے جیسے اسے کسی نے تیروں کی باڑ پہ رکھ دیا ہے یہ کیسی خاموشی ہے جو اُس کے پورے گھر پر بُکّل مار کے بیٹھ گئی ہے، کیسی چہل پہل رہتی تھی اس گھر میں، ہر مظلوم اُس کے باپ کے آگے اپنی داد فریاد لے کر آتا تھا۔

اچانک ایک نئی صورتِ حال............اُس دن گھر میں کچھ عجیب سی ہل چل تھی۔

گاڑیاں بار بار آ رہی تھیں جا رہی تھیں، کئی لال بتی والی گاڑیاں بھی آئیں، مدھوسودن جی کے چیمبر میں طرح طرح کے کھادی دھاری لوگ ....کچھ بہت ہموار صورتِ حال محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

رات میں پِتا جی نے ہم سب کو بتایا–

ابھی کچھ دنوں پہلے منوج نام کے ایک لڑکے کا قتل ہوا ہے، اسے مارنے والا سبودھ ہے جس کا باپ کسی زمانے میں شہر کا مشہور غنڈہ تھا، بعد میں ام ال اے ہوگیا، مرنے والے منوج کا باپ ایک سیدھا سادا عام آدمی ہے جو روزی روٹی کے جگاڑ میں مصروف رہتا ہے، منوج اُس کا اکلوتا بیٹا تھا، پڑھنے میں بہت اچھا رہا، مقابلے کے امتحان کا ابتدائی (Prelimanery) نکال لیا تھا۔ پہلی جنوری کو منوج سبودھ دونوں اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ پکنک منا کے لوٹ رہے تھے، سبودھ کی گاڑی پیچھے تھی، اُس نے منوج کی گاڑی کو اوورٹیک کیا، نوجوانی کے جوش میں منوج نے بھی اوورٹیک کیا۔ ایسا دو تین مرتبہ ہوا، اس کو سبودھ نے اپنی بے عزتی سمجھی، اُس نے آخری مرتبہ منوج کی گاڑی کو Over take کر کے اپنی گاڑی منوج کی گاڑی کے آگے کھڑی کردی، مجبوراً منوج کو بھی اپنی گاڑی روکنی پڑی، منوج کی گاڑی رکتے ہی سبودھ نے اپنی ریوالور سے منوج پر تابڑتوڑ کئی فائر جھونک دیئے............منوج ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے مر گیا۔

سبودھ فائر کر کے اپنی گاڑی بہت آرام سے نکال لے گیا۔

بہت زوروں کی ہاہا کار مچی، انتظامیہ، سوشل میڈیا، مخالف پارٹیاں، ریڈیو اور ٹی وی کے نامہ نگار............منوج کے گھر کی طرف سب دوڑ پڑے۔

منوج کے ماں باپ سیدھے سادے عام ہندوستانی............سب کے آگے پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ مخالف پارٹیوں نے جی جان لگا دی، وزیر اعلیٰ کو بھی لگا کہ یہ تو بہت بدنامی کی بات ہے، کہا جاتا ہے کہ اوپر سے حکم آیا............''قاتل اور اُس کے گھر والوں کو گرفتار کرو''، مگر سبودھ اور اس کے گھر والوں کو پانچ چھ گھنٹوں کا جو وقت ملا اُس کا فائدہ اٹھا کر سب غائب ہو گئے البتہ حالات سبودھ اور اُس کے گھر والوں کے خلاف ہو گئے تھے، سی آئی ڈی نے پتہ چلا لیا، مختلف جگہوں پر چھاپہ ماری شروع ہوگئی اس کے باوجود سبودھ کے ساتھیوں اور اس کے باپ کا حلقہ بھی متحرک تھا، تین مرتبہ چھاپہ پڑنے سے کچھ دیر قبل ان لوگوں نے اپنی جگہیں تبدیل کر لیں پھر بھی اوپر سے دباؤ اتنا تھا کہ سرینڈر کرتے ہی بنی۔

اِدھر منوج کے گھر والوں اور ان کی مددگار مخالف پارٹیوں کو منوج کی آخری رسوم کے بعد تھانے کچہری کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا، دیر ہو چکی تھی، قاتل کے حمایتی معاملے کو بہت

کچھ اپنے حق میں کر چکے تھے پھر بھی پولیس ڈائری جمع کرنے کے وقت مقتول کے حامیوں اور مخالف پارٹیوں کی طرف سے اتنا دباؤ پڑا کہ تھانے کو پولیس ڈائری میں صحیح بات لکھنی ہی پڑی، عدالت میں معاملہ آگے بڑھا، جج تک پہنچا، سنوائی چلتی رہی، گواہ گزرتے رہے، آہستہ آہستہ ساری کاروائی مکمل ہوتی گئی، اگلے دن امکان تھا کہ کاروائی پوری ہوجائے گی، شام ہوتے ہوتے ایک خبر اندر سے اچھل کر کانوں کان باہر آئی کہ قاتل کو شک کا فائدہ مل سکتا ہے......سبودھ بری ہوجائے گا۔

پھر ہاہا کار مچی............مقامی ام ال اے سے وزیراعلیٰ تک............راتوں رات وزیراعلیٰ کا فون ڈسٹرکٹ جج تک پہنچا............منوج کو انصاف ملنا چاہئے............ایسا وکیل لاؤ جو ڈرے نہیں اور خریدا نہ جاسکے۔

ساری رات مغز پچی ہوتی رہی............کون ہے............ایسا کون ہے؟

یہ اسی رات کی بات ہے............ بھارتی کو یاد آیا............ جب بھارتی کے گھر میں ہل چل مچی تھی۔

اگلے دن جج کے سامنے، بھارتی کے پِتا جی مدھوسودن وکیل نے منوج کا مقدمہ اس طرح پیش کیا اور گواہوں سے ایسی جرح کی کہ قاتل کے حمایتیوں کی ایک نہ چلی۔

منوج کے قاتل سبودھ کو عمر قید کی سزا ہوگئی۔

عام آدمی سیاست داں، ضلعی عدالت، ہائی کورٹ............ ہر جگہ یہ فیصلہ مہینوں چرچے میں رہا .... ٹی وی اور اخباروں میں بھارتی کے پِتا شری مدھوسودن وکیل کی خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔

ابھی ایسا ایماندار اور باصلاحیت وکیل ملک میں موجود ہے۔

عدلیہ سے ابھی بھی انصاف کی امید کی جاسکتی ہے۔

○

دن چڑھ آیا تھا، گھر میں کام کرنے والی بوا باورچی خانے میں کچھ پکار رہی تھی، چھوٹی بہو اُس

کو کچھ ہدایتیں دے کر باہر نکلی تھی، جھاڑو پونچھے والی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی، چھوٹا بھائی بہاری شاید باتھ روم میں تھا، بچے اپنے اپنے کمرے میں تھے، شاید ٹی وی دیکھ رہے ہوں یا موبائل سے جُڑے ہوئے ہوں، اُس کی بیوی چائے لے کر ساس کے پاس جا رہی تھی .... بھارتی بھی پیچھے پیچھے ماں کے کمرے کی طرف بڑھا۔

ماں کرسی پر بیٹھی تھی، اخبار اُس کے ہاتھ میں تھا، پتہ نہیں پڑھ رہی تھی کہ دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' بیٹے کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر، اُس نے ذرا چونک کر بیٹے کو دیکھا۔

کچھ نہیں ماں .... یوں ہی! بھارتی نے آہستہ سے جواب دیا اور پلٹ گیا۔

''بھارتی!'' وہ باہر نکلنے لگا تو ماں نے پکارا۔

''جی ماں جی؟'' بھارتی پھر پلٹا۔

''بچے گھر ہی میں ہیں نا؟''

''جی ماں''

''بہاری کہاں ہے؟'' ماں نے چھوٹے بھائی کے بارے میں پوچھا۔

''نہا رہا ہے''

''مین گیٹ بند ہے؟''

''جی .... میں نے دربان سے کہہ دیا ہے''

''فون پر زیادہ گپ شپ نہیں کرنا''

''جی!'' وہ رُکا .... ماں شاید کچھ اور پوچھیں مگر اُن کی چُپ لمبی ہو گئی تو وہ باہر نکل آیا۔

ماں کے کمرے سے باہر آ کر وہ ہال کے ایک کونے میں رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

اُس نے تھکان محسوس کی، آنکھیں بند کر لیں، آنکھیں بند کیں تو کچھ جگمگانے لگا...... ''

اُس دن گھر کی عجیب کیفیت تھی .... خوشی بھی، حیرت بھی اور کسی نہ کسی طرح کی بوکھلاہٹ بھی .... کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟''

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ مدھوسودن جی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے، مگر فون پر لگا تار مبارک

بادیوں کا سلسلہ جاری تھا، پھر لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، لگا پورا وکالت خانہ اُٹھ آیا۔

''ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ یہ سب آپ کی صلاحیت اور ایمانداری کا پھل ہے۔'' ڈسٹرکٹ جج صاحب نے پھولوں کا گلدستہ بھجوایا اور ساتھ ہی اپنے ہاتھوں سے لکھی تحریر بھی۔

مدھوسودن جی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

بھارتی کو یاد آیا، اس رات جب گھر میں کھانے کے ٹیبل پر سب جمع ہوئے تو ماحول بہت ہی خوش گوار تھا، ماں نے کافی لذیذ پکوان بنوایا تھا اور خود سے بھی کچھ بنایا تھا، سب لوگ کھانے کے ٹیبل پر بیٹھ گئے تو ماں پتا جی سے مخاطب ہوئیں:

''دن بھر تو آپ دنیا بھر کی بدھائی لیتے رہے، ہم لوگوں کی طرف سے بھی بدھائی سوئکار کیجئے''

پتا جی خاموشی سے مسکرائے۔

''پہلے یہ لیجئے، ہم نے خاص طور پر آپ کے لئے بنائی ہے۔'' مٹھائی کی ایک پلیٹ ماں نے پتا جی کی طرف بڑھائی۔

''اب تو ہم لوگوں کو راجدھانی جانا ہوگا؟'' بہاری کا رخ پتا جی کی طرف تھا۔

''لگتا تو ہے۔'' پتا جی آہستہ سے بولے۔

''کیا آپ کو کوئی خبر نہیں تھی؟'' ماں نے پوچھا۔

''ایک دن پہلے ایک فون آیا تھا۔'' پتا جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ بھی کمال آدمی ہیں۔ ہم کو بھی نہیں بتایا۔'' ماں کا لہجہ ذرا شکایتی تھا۔

''مجھے وشواس نہیں ہو رہا تھا۔ ڈسٹرکٹ کورٹ سے جج چننے کی پرمپرا بہت کم رہی ہے''۔

''سبودھ رائے والے کیس نے آپ کی پرتشٹھا (وقار) بہت بڑھا دی۔'' بڑی بہو نے مسکرا کر کہا

''ہاں بہو۔ یہ تو صحیح ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ مجھے اس پر خوش ہونا چاہئے ....یا نہیں؟''

''کیوں پاپا؟ ایسا کیوں فیل (Feel) کر رہے ہیں؟'' بھارتی نے حیرت سے پوچھا۔

''بیٹا یہ تو سمئے بتائے گا مگر مجھے خوشی سے زیادہ اشچرج (حیرت) ہے۔'' پتا جی اتنا کہہ کر چپ ہو گئے۔

○

''ماں جی آپ کو بلا رہی ہیں''

بھارتی کی بیوی ماں جی کے کمرے سے باہر نکلی تو بھارتی سے کہتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ بھارتی ایزی چیئر سے اُٹھ کھڑا ہوا............ماں کے کمرے میں داخل ہوا تو لگا، ماں اس کا انتظار ہی کر رہی تھیں، دیکھتے ہی بولیں:

''ذرا بہاری کو بھی بلا لو''

وہ باہر نکلا............اور پھر بہاری اور بھارتی دونوں ماں کے کمرے میں داخل ہوئے۔

''جی ماں جی؟'' دونوں ماں کے پاس بیٹھ گئے۔

''کیا سماچار ہے؟''

''کچھ تو نہیں ماں جی''

''تم لوگوں سے ایک بات پوچھنی ہے''

''جی ماں جی''

''بیچ رات میں تم لوگوں کو کسی طرح کی گندھ (بو) ملی تھی؟''

''نہیں تو۔'' دونوں ایک ساتھ بولے۔

''تب ہو سکتا ہے، مجھے کچھ دھوکا ہو گیا ہو''

''ہوا کیا ماں جی؟''

''نہیں چھوڑو۔ کوئی خاص بات نہیں ہے''

''پھر بھی بتایئے تو ماں۔'' بہاری ضد کرنے لگا

''سمئے کا تو پتہ نہیں، شاید آدھی رات کا سمئے ہوگا، اچانک نیند ٹوٹ گئی، یہ نہیں کہہ سکتی کہ اُس کارن نیند ٹوٹی، یا نیند ٹوٹ گئی اس کارن ایسا لگا............مگر ایسا لگا کہ کوئی گندھ ہے جو سارے میں پھیل رہی ہے''

''کیسی گندھ تھی؟''

''کچھ عجیب سی گندھ............ہم لوگ تو مانساہاری نہیں ہیں اِس لئے ٹھیک سے نہیں کہہ سکتی

کہ ویسا ہی تھا، مگر ایسا لگتا تھا کہ کہیں چمڑا جل رہا ہے............عجیب سی گندھ!''

ماں اتنا کہہ کر رک گئیں۔ بھارتی اور بہاری دونوں کو چپ سی لگ گئی تھی۔

''ہوسکتا ہے، باہر دربان نے یا نوکروں نے الاؤ جلایا ہو اور اس میں چمڑے کا کوئی ٹکڑا پڑ گیا ہو۔'' کچھ دیر کی چپ کے بعد بہاری بولا۔

''ماں جی کہہ رہی ہیں کہ آدھی رات کا سمئے تھا، اس سمئے الاؤ کون جلاتا ہے۔'' بھارتی نے بات کاٹی۔

''تم لوگوں کو ایسا کچھ نہیں لگا؟'' ماں جی نے پوچھا............ بھارتی نے ''نہیں'' میں گردن ہلائی، بہاری چپ تھا، کچھ دیر بعد بولا۔ تین ساڑھے تین کے آس پاس میری نیند ٹوٹی تھی تو ایسا لگا تھا کہ باہر **پـــکھـچـــی** پکھیرو پھڑ پھڑا رہے ہیں............ کچھ عجیب سا انو بھو ہو رہا تھا جیسے کوئی چھٹپٹا رہا ہو'' .... بہاری اتنا کہہ کر چپ ہو گیا .... کچھ دیر تک چپ رہا، پھر خود ہی بولا ......''یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے، پرندے کبھی کبھی بیچ رات میں بھی پھڑ پھڑانے لگتے ہیں۔''

بھارتی تس پر بھی چپ رہا......سوچا کیا بتائے......بتانے سے کوئی فائدہ............؟

''چلئے، ناشتہ کر لیجئے۔'' چھوٹی بہو نے آ کر کہا تو سب ڈائننگ ٹیبل کی طرف آ گئے۔

سب خموشی سے ناشتہ کرتے رہے، کوئی کچھ نہیں بولا۔ شاید کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ بھارتی اپنی چائے لے کر کمرے میں چلا آیا، وہ اس چُپ سے اُوب گیا تھا، بھرے پُرے گھر کو نظر لگ گئی، ایک بات اس کے جی میں آئی:

''یہ کیا ہے، ماں جی کو چمڑا جلنے کی گندھ مل رہی ہے، بہاری کو کسی کے چھٹپٹانے کا احساس ہو رہا ہے، مجھے نہ سمجھ میں آنے والی آوازیں سُنائی دے رہی ہیں ....کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ بھارتی کو لگا، اس کا دماغ پھٹ جائے گا............ ''کتنے چین سے جیون بیت رہا تھا۔'' بھارتی کو پھر یاد آیا .... بلا سے ہم لوگ بی کلاس سِٹی میں رہتے تھے مگر من میں شانتی تھی .... یہاں آ کر تو............پھر لگا کہ کوئی کانوں میں سیسہ پگھلا رہا ہے............

''اُن کا شوان کے گاؤں............''

بھارتی چاہتا نہیں تھا کہ وہ سب کچھ یاد کرے مگر بھول جانا بھی بس میں نہیں تھا ......

شروع میں تو ہائی کورٹ میں بھی سب ٹھیک ٹھاک چلا............ پتا جی بھی لگ بھگ معمول کا جیون بِتا رہے تھے............مگر سال ڈیڑھ سال گزرتے گزرتے سب اُلٹ پلٹ ہو گیا۔

○

''ماں! کتنے دن ہم لوگ گھر میں بیٹھے رہیں گے؟''

بہاری کی ذرا تیز آواز آئی تو بھارتی ہڑ بڑا کر باہر نکلا............''کیا بات ہے بہاری؟''

''ماں جی کہتی ہیں ....''کہیں باہر نہ جاؤ............ کیسے سمجھو ہے یہ؟'' بہاری ذرا جھلایا ہوا تھا

''بھائی۔تھوڑا سوچ سمجھ کر تو کام کرنا ہوگا''

''ہم سب سمجھ رہے ہیں مگر ہم لوگوں کا دفتر، بچوں کا اسکول .... کتنے دن سب کچھ چھوڑا جا سکتا ہے؟''

''ہاں سو تو ہے۔مگر کیا کیا جائے؟'' بہاری چپ ہو گیا، کمرے میں چلا گیا، بھارتی پھر اکیلا رہ گیا، من پر اک بوجھ سا، لگا کئی من کی پتھر کی سِل سینے پر رکھ دی گئی ہے............اب وہ کسی کو کیا بتاتا، پتا یاد آ گئے، آنکھ بھر آئی۔

تین مہینے پہلے کی بات ہے، اُس دن پتا جی گھر آئے تو شانت نہیں تھے، بات بات پر جھلا رہے تھے، رات کا کھانا بھی نہیں کھایا، بہت سویرے کمرے میں چلے گئے، پھر ماں بھارتی اور بہاری کو بلا کر کمرے میں لے گئی............ پتا جی اکتائے اکتائے بیٹھے تھے اور چپ تھے۔

''دیکھو'' .... ماں بچوں سے مخاطب ہوئی۔''میں ان سے لگاتار پوچھ رہی ہوں کہ آخر بات کیا ہے؟ کھانا کیوں نہیں کھایا............ جھلائے جھلائے کیوں لگ رہے ہیں، کوئی جواب نہیں دیتے............تم ہی لوگ پوچھو!''

''پاپا'' بہاری نے پتا کا ہاتھ پکڑ لیا۔''اگر کوئی پریشانی ہے اور ہم لوگوں سے شیئر نہیں کیجئے گا تو پریشانی کم تو نہیں ہو جائیگی''

''ارے بیٹا۔تم لوگوں سے جُڑی کوئی بات نہیں ہے، کورٹ کا معاملہ ہے، اب اُس میں تم لوگ کیا سا جھا کر پاؤ گے؟''

''پاپا، ہم لوگ آپ سے جُڑے ہوئے ہیں نا؟'' بھارتی آہستہ سے بولا

''تو میں تم لوگوں سے کہاں الگ ہوں؟'' باپ کے لہجے میں درد تھا اور اُس میں نرمی شامل تھی۔

الگاؤ اور کِس کو کہتے ہیں؟ جب اپنی پریشانی سے ہم لوگوں کو نہیں جُڑنے دیجئے گا تو ہم لوگوں کے آپ کے پاس ہونے کا کیا مطلب بنتا ہے؟ ماں کا لہجہ روہانسا ہو گیا۔

''ایسے مت بولو۔ دکھ بڑھ جاتا ہے۔'' پتا جی، لگا گلوگیر ہو گئے۔

''پلیز پاپا!'' بہاری اور بھارتی دونوں نے ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھا۔

''ارے بھائی، کیا بتاؤں؟ مہتاب الدین انکاؤنٹر والا کیس ہم کو دے دیا گیا''

باپ کا یہ جملہ جیسے ایک بم تھا جو ماں بیٹوں پہ ایک ساتھ گرا......سب کو چپ لگ گئی۔

''آپ لینے سے انکار کر دیجئے۔'' دس پندرہ منٹ کی لمبی خاموشی کے بعد بہاری بہت بھاری آواز میں بولا۔

''نہیں بیٹا جس بینچ کو جو مقدمہ دیا گیا، اس کو لینے سے انکار صحیح بات نہیں ہے۔''

''لیکن یہ آپ ہی کو کیوں دیا گیا؟'' بھارتی نے پوچھا۔

''ہاں، اس کی ایک وجہ سمجھ میں آ رہی ہے''

بیوی بچے سب سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''اس کیس کے صحیح فیصلے سے کچھ بڑوں کو نقصان پہنچ جائے گا''

''ساری دنیا جانتی ہے کہ آپ صحیح فیصلہ کیجئے گا، پھر سمسیا کیا ہے؟'' پتنی نے سوال کیا۔

''میرے صحیح فیصلہ کرنے کے بارے میں ساری دنیا کا جاننا ہی اصل سمسیا ہے۔'' شوہر آہستہ سے بولا۔

''پاپا۔ ہم لوگ کچھ سمجھ نہیں پائے۔ صحیح فیصلہ سمسیا کیوں بنے گا؟''

''منوج کمار اور سبودھ رائے کے مقدمے میں، میں نے سچ کا ساتھ نہیں دیا، سسٹم کا ساتھ دیا''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' بیوی حیرت زدہ ہو کر بول اُٹھی

چونکہ اُس وقت سچ کا ساتھ سسٹم کو بھی راس آ رہا تھا، اِس لئے لگتا یہی ہے کہ میں نے سچ کا نہیں سسٹم کا ساتھ دیا............سسٹم نے سچ کو اپنے لئے استعمال کیا اور یہ بھرم بھی پال لیا کہ

میں سسٹم کے ساتھ چل سکتا ہوں .... نتیجہ سامنے ہے .... مہتاب الدین کے کیس میں سسٹم پھر استعمال کرنا چاہے گا، کیوں کہ بازار میں یہ بات پہلے ہی پھیلا دی گئی ہے کہ میں ڈر نہیں سکتا اور خریدا نہیں جا سکتا۔

بات بہت خطرناک تھی، سبھی کو اس کی سنگینی کا احساس ہوا، اور سبھی اندر سے کانپ گئے۔

''آپ تیاگ پتر دیجئے۔ ہم لوگ گھر واپس چلتے ہیں۔'' بیوی نے جیسے فیصلہ سنایا

''اس سے پہلے تو میں کبھی میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں ہوں۔'' مدھوسودن جی کا ٹکا سا جواب تھا۔

سب خاموش ہو گئے۔ بیوی اپنے شوہر سے اور بچے اپنے باپ سے اچھی طرح واقف تھے۔

پھر گھناؤنے دن شروع ہو گئے۔

مہتاب الدین کا انکاؤنٹر ہوا تھا، شک کی پہلی سوئی جا کر اجیت ساؤ پر ٹکی تھی، سورت کا مشہور غنڈہ جو بعد میں ریاستی سسٹم کا حصہ بنا اور اب مرکزی سسٹم کی ناک کا بال تھا، ایک زمانے میں گرفتار بھی ہوا بعد میں ضمانت ہو گئی پھر دوسری عدالت سے بری ہو گیا مگر مرنے والا بھی ایسا مردہ تھا جو بار بار اُٹھ کے بیٹھ جا رہا تھا، اجیت ساؤ راجدھانی پہنچا تو مہتاب بھی آن دھمکا، سسٹم کو لگا اس سے چھٹکارا ضروری ہے، ایسی بینچ چُنی گئی جو نظام کے ساتھ پہلے کبھی دو قدم چل چکی ہو............ بھارتی کے جی میں عجیب سی بات آئی۔

بے ایمانی کو کبھی کبھی یہ بھرم ہو جاتا ہے کہ ایمانداری اُس کا ساتھ دے سکتی ہے۔

رات پھر سر پر آن کھڑی ہوئی تھی، ہر منظر سیاہ تھا۔ بھارتی نے سوچا، کہیں اجالے کی کوئی ہلکی سی کرن؟ چاروں دشائیں دھند میں کھوتی جا رہی تھیں، گمان ہوا کہ کوئی آکٹوپس آہستہ آہستہ پورے گھر پر اپنے پنجے گاڑتا چلا جا رہا ہے۔ باپ اپنی ڈگر پر چل رہے تھے مگر کانٹوں کی باڑھ ہر دن، بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

بہت دنوں بعد ماں نے بتایا۔ وہ اس کیس سے چھٹکارا چاہتے تھے مگر کچھ لوگ ان کو جکڑتے جا رہے تھے، کیس چلتا رہا، تاریخ پر تاریخ پڑتی رہی، گواہوں کی فہرست میں اجیت ساؤ بہت اہم تھا مگر وہ کبھی حاضر نہیں ہوا اور دستاویزات وشواہد اجیت ساؤ کے خلاف شک کو مضبوط کرتے جا رہے تھے۔ جج صاحب بار بار مدھوسودن کو سمن بھیجتے رہے............ سسٹم کو اندازہ ہو گیا کہ کیس غلط بینچ میں چلا گیا۔

اُس کے بعد واقعات کی رفتار بہت تیز ہوگئی۔

مدھوسودن جی پر عنایتوں کی بارش اور اُن کے ساتھ مزید حُسنِ سلوک کی خواہش بہت ننگی ہو چکی تھی۔ اُن کے وہ دوست جنہوں نے اُن کے جج بننے کے اعلان سے ایک دن پہلے اُن کو خبر دی تھی، ملنے آئے اور باتوں باتوں میں بتایا کہ دہلی کے باس آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے اور محکمہ قانون کے بڑے لوگوں کے درمیان کہہ رہے تھے کہ ''مدھوسودن جی جیسی صلاحیت اور پیشے کے تئیں ڈِووشن رکھنے والے اب ملتے کہاں ہیں'' ....پھر ایک ٹی پارٹی میں ایک سینئر جج نے آہستہ سے کہا: ''پرموشن کے لئے تیار رہئیے''

اور ان سب کے بعد سب سے آخر میں:

ہائی کورٹ کی ڈیڑھ دوسالہ زندگی کے دوران، جو دو جج صاحبان مدھوسودن جی کی کوشش کیا خواہش کے بغیر اُن کے قریب ہوگئے تھے، ان میں سے ایک گھر پر تشریف لائے، بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، باتوں باتوں میں یہ مشورہ بھی دیا کہ ''مہتاب الدین والا کیس جلدی نپٹا دیجئے۔ اجیت ساؤ جی اگر اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے عدالت تک نہیں آپا رہے ہیں تو اُن کی حاضری کے بغیر معاملہ نپٹایئے، اجیت ساؤ اِس وقت نمبر دو پر ہیں، ہم قوم بھی ہیں ......مہتاب الدین تو............''

اتنا کہہ کر جج صاحب پانی پینے لگے تھے۔

''تمہارے باپ سے سب مایوس ہوگئے تھے۔'' یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

❍

رات کا تقریباً گیارہ بج رہا تھا، اچانک فون کی گھنٹی بجی

''ہیلو۔'' اُس نے فون کا بٹن دبایا

''بھارتی بول رہے ہیں؟'' کوئی بہت بھاری آواز میں پوچھ رہا تھا

''جی''

''لفڑے میں مت پڑو۔'' پھر فون کاٹ دیا گیا۔

اُس نے ٹروکالر پر فون کا اور چھور جاننا چاہا مگر اُسے کچھ پتہ نہ چل سکا۔

پھر کئی دنوں بعد-ایک دن جب اُس نے ایک پریس والے سے کہا تھا!''مُجھے کونسپریسی کی گندھ مِل رہی ہے۔'' اُس کے دوسرے یا تیسرے دن، کہیں جاتے ہوئے ایک بائیک اُس کے پاس آ کر رکی ،بائیک بندنہیں کی گئی تھی ،سوار نے بائیک پر بیٹھے بیٹھے اُس سے پوچھا ....''آپ بھارتی ہیں؟''

''جی!''

بائیک والا اس کا جواب سُنے بنا آگے بڑھ چکا تھا-

پھر کئی دنوں بعد،ایک گاڑی اُس کے بغل میں آ خر رُکی ۔ایک صاحب نے کھڑکی سے گردن باہر نکالی

''بہاری آپ کا چھوٹا بھائی ہے؟''

پھر وہ گاڑی بھی آگے بڑھ گئی۔

ایک دن بہاری نے بتایا۔''میں میٹرو سے جارہا تھا،ایک صاحب نے ایک اسٹیشن پر اُترتے اُترتے مجھ سے پوچھا:

آپ دونوں بھائیوں کے بچے سینٹ زیویر میں پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب میرا جواب سنے بغیر اتر گئے۔میٹرو نے اسپیڈ پکڑ لی تھی۔

گھر بھر محسوس کر رہا تھا کہ کہیں کچھ ہو رہا ہے

باپ کے جج بننے کے تقریباً سال ڈیڑھ سال بعد گھر پر کالے بدل چھائے ....پھر سورج نہیں نکلا۔

وہ دن ....اُس دن مدھوسودن جی کے دوست گھر آئے تھے، چائے پانی کے بعد بہت دیر تک وہ دوستوں سے بات کرتے رہے، پھر گھر میں آئے ماں کو کچھ بتایا اور دوستوں کے ساتھ کہیں چلے گئے۔

اُن کے ایک جج دوست کی بیٹی کی شادی ہے،شادی وہ اپنے آبائی شہر، بڑودہ سے کر رہے ہیں'' ....رات میں ماں نے بتایا تھا

''کب آئیں گے؟''

''اب ایک شہر سے دوسرے شہر کا معاملہ ہے، رات میں نہیں چلیں گے، کل آئیں گے''

بھور کا سمئے رہا ہوگا، پانچ ساڑھے پانچ کا............اچانک ماں کے کمرے سے، ماں کے بالکل ہسٹیریائی انداز میں چیخنے کی آواز آئی، ماں چیخ رہی تھیں مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے............سب ماں کے کمرے کی طرف دوڑے، سب کے پہنچتے پہنچتے ماں بے ہوش ہو کر گر پڑی تھیں......دس پندرہ منٹ بعد ماں ہوش میں آئیں بھی تو پھر چیخنے لگیں...... پاپا...... پاپا............''

دونوں بیٹوں نے ماں کو جھنجھوڑا............''ہوش میں آیئے ....اپنے کو سنبھالئے ....بتایئے کیا ہوا پاپا کو؟''

ہارٹ اٹیک...... ہارٹ اٹیک......نہیں رہے............نہیں رہے۔'' اتنا کہتے کہتے پھپھک پھپھک کر رو پڑیں۔

پورے گھر پر لگا کہ ایک ساتھ فالج کا حملہ ہوگیا ہے، ہر فرد خاموش، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کیا کہے، کیا پوچھے............کچھ دیر بعد بھارتی سنبھلا، ماں کو سنبھالا، پوچھا:''کیا فون آیا؟ ٹھیک سے بتایئے''

پانچ سوا پانچ کا سمئے رہا ہوگا، موبائل کی گھنٹی بجی، دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا۔''جج صاحب، مدھوسودن جی کو ہارٹ اٹیک ہوا، اُن کا دیہانت ہوگیا''............اتنا کہہ کر فون رکھ دیا گیا

''پاپا تو بڑودہ گئے تھے؟''

''ہاں''

''وہ تو ٹھیک ٹھاک تھے۔'' بھارتی بڑبڑایا

''بالکل ٹھیک تھے۔اُن کو کبھی بی پی کی بھی شکایت نہیں رہی، تمہاری فیملی میں یہ سب کچھ تھا ہی نہیں۔'' ماں بولیں پھر اچانک بھارتی کو کچھ یاد آیا۔ماں کا موبائل اُٹھا کر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''کیا کر رہے ہو؟''

''پاپا کو فون کر رہا ہوں''

گھنٹی بج رہی ہے، اُٹھا نہیں رہے ہیں

''میں بڑودہ جاتا ہوں'' بھارتی اُٹھا

''میں بھی چلوں گی'' ماں جلدی سے بولیں

''ہم سب چلیں گے۔'' بہاری روتے ہوئے بولا

''کس نمبر سے فون آیا تھا؟'' بھارتی کو پھر کچھ یاد آیا۔

''موبائل میں ہوگا۔'' ماں نے جواب دیا۔

بھارتی لگاتار کوشش کرتا رہا مگر ہر بار موبائل کا سوئچ آف ملا۔

ان پریشانیوں میں لگ بھگ ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ ایک مرتبہ پھر موبائل کی گھنٹی بجی۔

''ہیلو۔'' بھارتی نے جلدی سے موبائل اُٹھایا۔

''ان کا شو اُن کے گاؤں لے جایا جا رہا ہے۔'' اتنا کہہ کر کہنے والے نے پھر فون کاٹ دیا

''ہیلو ہیلو..........ہیلو ہیلو'' .... بھارتی چیختا رہا مگر فون بہرا ہو چکا تھا

اُس نے پھر نمبر ڈائل کیا، مگر یہ موبائل بھی سوئچ آف کر چکا تھا۔

سب بھاگم بھاگ اپنے گاؤں انکلیشور پہنچے، مگر ماں بیٹوں کے پہنچنے سے پہلے جج صاحب کا انتم کریا کرم ہو چکا تھا، گاؤں میں پتہ چلا کہ ایک ایمبولینس اُن کی لاش لے کر آئی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا۔

بعد میں گھر والے اُن دونوں ججوں سے ملے جو مدھوسودن جی کو بڑودہ لے گئے تھے، دونوں کا ایک ہی جواب تھا۔ مرنے سے پہلے انہوں نے انکلیشور کے لئے وصیت کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ گھر والوں کا انتظار نہ کیا جائے۔

ملاقات کے سمئے دونوں ججوں کو جو پروٹوکول حاصل تھا، اور مدھوسودن کے گھر والے پروٹوکول کی چھتر چھایا سے حالات کے تحت جس طرح باہر آ چکے تھے، ایسے میں دونوں جج صاحبان سے جرح بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

○

مدھوسودن جج کے گھر کے چاروں طرف ایک گہری دھند کا بسیرا تھا، بھارتی ہڈیوں کو ٹھٹھرا دینے والی ایک انتہائی سردرات کا مسلسل سامنا کر رہا تھا مگر اس کے تلووں کے نیچے آگ لگی ہوئی تھی۔

اس نے سوچا، شاید ساری زمین دھدھک رہی ہے

اُسی لمحہ بھارتی کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی تو اچانک اس کی نگاہ اُس کے پیٹ پر گئی' وہ حمل سے تھی۔

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ بیوی کے پیٹ پر نگاہ پڑتے ہی موبائل پر بھیجا گیا ایک ویڈیو یاد آ گیا............الغوطہ سے ایک چار برس کا لڑکا جھولے میں اپنی ماں بہن کا کپڑا لے کر صحرا پار کر رہا تھا کہ کسی طرح اردن پہنچ جائے۔

بھارتی نے چند ماہ بعد پیدا ہونے والے اپنے بچے کے بارے میں سوچا............اُس کو اگر ریگستان پار کرنا پڑا تو اُس کا اثاثہ کیا ہوگا---؟

☆☆☆

HUSSAIN UL HAQUE
KE MUNTAKHAB AFSANE

Edited by

PROF. SAGHIR AFRAHEIM